ترتیب و تدوین

مولانا مشتاق احمد

احرار فاؤنڈیشن پاکستان

معروف دانشور اور صحافی آغا شورش کاشمیری کی تحریروں کا منفرد مجموعہ

اقبالیاتِ شورش

ترتیب و تدوین

مولانا مشتاق احمد

ناشر

احرار فاؤنڈیشن پاکستان

ضابطہ

کتاب	اقبالیاتِ شورش
ترتیب وتدوین	مولانا مشتاق احمد
ناشر	احرار فاؤنڈیشن پاکستان
اشاعت	اکتوبر 2003ء
تعداد	1000
صفحات	384
قیمت	160

رابطہ

مکتبہ احرار	69/c۔ حسین سٹریٹ، وحدت روڈ، نیو مسلم ٹاؤن۔ لاہور
بخاری اکیڈمی	دار بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان
بساط ادب	چوک نیو انارکلی، لاہور
مکتبہ معاویہ	جامع مسجد روڈ چیچہ وطنی، ضلع ساہیوال
راوی پبلشرز	16 الفضل مارکیٹ 17 اردو بازار، لاہور
مکتبہ رشیدیہ	راجہ بازار راولپنڈی
زمزم پبلشرز	نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کاشمیریؒ

اور

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

کے نام

جن کی صحبتِ فیض اثر نے

علامہ اقبالؒ کو محاسبۂ قادیانیت

کے محاذ پر سرگرم کیا

آئینہ

سخنِ پیشین

علامہ اقبال کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب اس دفتر سے گوہر مقصود تلاش کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ برادرم مولانا مشتاق احمد چونکہ درویش آدمی ہیں اُس لیے مشقت پسند بھی ہیں۔ مطالعہ ان کا ذوق بھی ہے اور شوق بھی۔ اُن کے دماغ میں اپنی کئی غیر مطبوعہ تالیفات وتصنیفات کا ذخیرہ موجود ہے مگر اُن کی اشاعت کی راہ میں غربت حائل ہے۔ مزاج شاہانہ، حال درویشانہ مگر دل غنی ہے۔ دوست بنائے تو وہ بھی اپنے جیسے۔ ان میں اکثر انہیں دوا نہیں دُعا دینے والے ہیں۔

گزشتہ آٹھ دس برس سے میری ان سے شناسائی ہے۔ ہر ملاقات پر کسی کتاب کی تصنیف وتالیف اور ترتیب وتدوین کا منصوبہ پیش فرما دیتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ، علامہ اقبالؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، چودھری افضل حقؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور شورش کاشمیریؒ ان کی کمزوری ہیں۔ ان شخصیات کے حوالے سے کوئی کتاب نظر آ جائے تو جب تک پڑھ نہ لیں، بے چین رہتے ہیں۔ آدمی کام کے ہیں، محنتی بھی ہیں اور مخلص بھی۔

ایک دن حسبِ معمول وہ اپنے منصوبے پیش فرما رہے تھے کہ میں نے بھی ایک منصوبہ پیش کر دیا۔ ''مولانا! آپ اقبال پر شورش کاشمیری کی تحریریں جمع ومرتب کریں۔'' کہنے لگے ''مواد کون مہیا کرے گا؟ اور پھر شائع کون کرے گا؟'' میں نے ہامی بھر لی۔ میرے پاس ''چٹان'' کے جتنے شمارے موجود تھے استفادے کے لیے پیش کر دیے اور باقی مواد انھوں نے مختلف ذاتی اور اداروں کی لائبریریوں سے حاصل کیا۔ انہوں نے بہت تھوڑے وقت میں ہفت روزہ ''چٹان'' کے ہزاروں صفحات میں بکھری ہوئی ان تحریروں کو یکجا کر دیا۔

''اقبالیاتِ شورش'' اقبالیات میں ایک خوبصورت اور توانا اضافہ ہے۔ شورش، فکرِ اقبال کے تاجروں اور قبرِ اقبال کے مجاوروں پر پوری جرأت وحمیت کے ساتھ حملہ زن ہیں۔ وہ رزم احرار سے سینہ تان کے نکلے اور بزمِ اقبال میں جلوہ گر ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اقبال کے افکار اور خیالات کے نام پر جو گمراہی پھیلائی جا رہی ہے ''اقبالیاتِ شورش'' اس کے سدِ باب میں کلیدی کردار ادا کرے گی۔

ڈاکٹر شاہد کاشمیری بھی شورش کے عاشق صادق ہیں، جنہوں نے احرار فاؤنڈیشن سے اس کتاب کو شائع کر کے علم دوستی کا مظاہرہ کیا۔

سید محمد کفیل بخاری

دفتر احرار دار بنی ہاشم ملتان

(۱۲/اکتوبر ۲۰۰۳ء)

جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری (کراچی)

آر ۱۰، ۵ سی / ۳ نارتھ کراچی ٹاؤن

۴ شوال المکرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۹ دسمبر ۲۰۰۲

مکرمی سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۳ رمضان المبارک کو ملا۔ اب میں علی گڑھ کالونی میں نہیں رہتا اس لیے ڈاک وقت پر نہیں ملتی۔ لیکن موجودہ پتے پر ابھی تک ایک خط بھی نہیں منگوایا۔ ڈرتا ہوں کہ علی گڑھ کالونی سے ہفتے عشرے میں جو ڈاک آجاتی ہے۔ کہیں اس سے بھی محروم نہ ہو جاؤں۔ چونکہ ابھی یہاں پورے طور پر سیٹ نہیں ہو سکا ہوں۔ اس میں وقت لگے گا۔ اور ڈاک کا نظام اس وقت درست ہوگا۔

جواب میں آخری عشرہ رمضان کے معمولات اور بعض دیگر وجوہ تاخیر کا باعث ہوئے۔ آپ کے خط سے خوشی ہوئی۔ آپ نے ایک عہد جوش و مسرت کی یاد دلا دی۔ شورش کاشمیری مرحوم ایک باغ و بہار شخصیت اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اور ان کا اخبار "چٹان" نوع بہ نوع افکار اور رنگا رنگ تحریروں کا حسین مجموعہ، ہر ہفتے مطالعے میں آتا تھا۔ "الہلال" کے لئے شوق و انتظار کے تذکرے میں نے پڑھے تھے۔ میرے حصے میں چٹان کے لئے بے چینی کی کروٹیں اور انتظار کی تلخیاں آئیں۔ میں بنا یا بگڑا اپنے بارے میں کیا کہوں؟ لیکن جو کچھ بھی ہوں، اس میں "چٹان" کا بڑا حصہ ہے۔ چٹان صرف ایک اخبار نہ تھا، تحریک تھا۔ اس کے کئی جہات اور اطراف تھے۔ میں نے لکھنا اسی سے سیکھا۔ میں اپنے افکار کی تعمیر اور خیالات کی تالیف میں شورش مرحوم کے فیض، صحبت اور اثر تحریرات سے انکار نہیں کر سکتا۔ میرا یہ وہ زمانہ تھا جب آتش جواں تھا اور دل ولولوں سے معمور تھا۔ ہر ماہ چار، چھ مضمون ضرور ہو جاتے تھے۔ چٹان نے اشاعت کی فکر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ کیا لکھتا تھا؟ یہ نہ پوچھیے۔ اب اس زمانے کے کسی مضمون پر نظر پڑ جاتی ہے تو شرم سار ہو جاتا ہوں۔ البتہ کسی تحریر پر افسوس نہیں ہوتا۔ ان جانے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو دوسری بات ہے۔ لیکن جانتے بوجھتے کوئی غلط یا خلاف تہذیب بات قلم سے نہیں نکلی۔

آپ کے پیش نظر جو کام ہے اسے بہ دل و جان انجام کو پہنچایئے۔ نہایت مفید کام ہے۔ وہ علم و تحقیق کا خواہ کوئی کارنامہ نہ ہو لیکن اس میں علم کے اتنے نکتے اور فکر و خیال کے اتنے گوشے اور طرز نگارش کے ایسے شاہکار، قارئین کرام اور اصحاب ذوق کے سامنے آئیں گے کہ وہ پڑھ کر حیران ہو جائیں گے۔

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ انسان اپنے ہی وطن میں اجنبی اور مظلوم ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ملک میں کئی طبقات اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی حقیقی اور انسانی فکر لوگوں کی وقتی مصلحتوں کا شکار ہے۔ اور اس کے فکر کی یکسر نفی کی جا رہی ہے۔ اقبال ہندوستان میں پیدا ضرور ہوا لیکن اس کی فکر ہندوستان پاکستان کے حدود سے ماورا، عالم گیر اور کل انسانیت کو محیط ہے۔ اس کی فکر میں عالمیت اور انسانیت کو نہ صرف محدود اور کمزور کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی وسعتوں میں رخنے پیدا کر دیئے گئے ہیں اگرچہ اس کی عظمت کی بلندیوں کا پالینا اور اس کی حقیقت کو سمجھ لینا آسان نہیں لیکن یہاں تو اس کے فہم کی راہ میں گوناگوں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ تالیف اقبال کے فہم کی راہ میں کئی رکاوٹوں کو دور اور اقبال کی فکر کے کئی گوشوں اور ان کے خصائص کو نمایاں کر دے گی۔ بہ ایں خوبی آپ کی تالیف اقبالیات میں ایک مفید اضافہ ثابت ہوگی۔ اور آپ بھی اس خدمت کے حوالے سے "زندۂ جاوید، اقبال" کے ساتھ زندہ جاوید ہو جائیں گے۔

اس تعارف و تقریظ کے لیے حضرت سید محمد کفیل شاہ صاحب بخاری کی ذات گرامی ہر طرح کفالت کرتی تھی۔ ان کا شمار اصحاب ذوق میں ہوتا ہے۔ وہ صاحب نظر ہیں۔ شگفتہ نگار اہل قلم ہیں اور حضرت اقبال مرحوم سے ان کے بزرگوں کے بہت قریبی روابط رہے ہیں۔ اس لیے وہ حضرت اقبال اور اقبالیات سے ایک ذہنی مناسبت رکھتے ہیں۔ موصوف کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجیے۔

اس خاکسار سے آپ کو کوئی تعلق ہے تو دعاؤں میں فراموش نہ کیجیے۔ یہ آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔

خاکسار

ابوسلمان

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

چمنستانِ فکر ونظر

حکیم مشرق علامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے عظیم المرتبت مسلم دانشور تھے۔ انکے قلب ونظر کا چمنستان اس بارانِ رحمت سے صدرشکِ بہاراں تھا۔ جسے ھدی للناس، دستور محمد ﷺ اور منشور رب کہا جاتا تھا۔ وہ نور جس سے جہانوں کی شبِ تیرہ وتار جگمگا اٹھی، مردنی زندگی میں بدل گئی۔ افسردگی، مسرت وانبساط میں ڈھل گئی اور بزدلی، استقامت کی ابدی کیفیت سے لبریز ہوگئی۔ بلاشبہ ان کے لئے قرآن مجید انکے لئے اٹوٹ راہنما اور حضور ختمی مرتبت کی سیرت طیبہ عرفان وآگہی کا قطب نما ٹھہرے۔ اسی جمال برق ساماں نے انہیں سوزِ جگر اور ذوقِ نظر ودیعت فرمائے۔ قادر مطلق کی اس کرم فرمائی سے وہ بھانپ گئے کہ مسلمانوں کی آتش تخلیف کو فرنگی اپنے منحوس دامن سے مسلسل ہوا دے رہا ہے۔ کہ ان کا اتحاد واتفاق ایک دوراز کار قضیہ بن کر رہ جائے اور وہ ہمیشہ مغلوبیت اور خوفزدگی میں رہیں۔ اسی میں تاج برطانیہ کی بھلائی ہے۔ تکمیل دین اور مسلمہ اعتقادات میں تشکیک کی مجہول وارداتیں اس پر مستزاد ستم بالائے ستم کہ اس دور کی نئی نسل اس دام ہمرنگِ زمین کا بکثرت شکار ہوکر تمدنِ زندگی میں ایک ہمہ گیر بحران کا سبب بننے کو تھی کہ اقبال تڑپ اٹھے۔ انہوں نے مسلمانانِ برصغیر کو ان خطرات فاجعہ سے بروقت آگاہ کیا۔ دانشوروں کو جھنجھوڑا، انہیں باور کرایا کہ کلیسائی فلسفہ زیست تمہاری پریشانیاں دور کرنے سے بہر طور قاصر ہے۔ زوال آشنائی کسی توحید پرست اور سرکار دوجہاں ﷺ کا امتی ہونیکے مدعی کو ہرگز زیبا نہیں بلکہ ہلاکت وغرقابی ہے۔ سراسر ندامت ہے یہ باطل کل اور مسلمانوں کے سوز وفوز کی جانکنی ہے۔ اے غفلت شعار مسلمان اٹھو اور عالمی استعمار کی لٹیا ڈبو دو۔ کلام اقبال کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے فلسفہ خودی حیات وموت، سیاست وحکومت، جہانگیری و جہانبانی، اتحاد وملت، عظمتِ رفتہ کی بازیافت، مستقبل میں امت مرحومہ کی شوکت وقوت اور نظریہ پان اسلام ازم کی بنیاد ہی قرآن، عقیدہ توحید، تکمیل دین اور رسالت پر رکھی گئی ہے۔ مختلف مواقع پر فرماتے ہیں۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

(ترجمہ: اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمان بنو تو یہ کام بغیر قرآن کے ممکن ہی نہیں)

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنور شمع عرفاں کردہ ای

(ترجمہ: اے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی بھی مفہوم میں اجرائے نبوت یا دعوی نبوت شرک ہے آپ نے شمع عرفان کے نور سے اس کائنات کو روشن کردیا ہے۔ یعنی اس کے بعد بھی کسی نبوت کی قطعا ضرورت نہیں)

لا نبی بعدی ز احسان خدا است
پردہ ناموس دین مصطفے است

(ترجمہ: اللہ کا احسان ہے کہ آپ کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہ ہوگا۔ یہی بات ناموس دین مصطفے ﷺ کا پردہ یعنی حفاظتی سامان ہے)

قوم را سرمایہ قوت ازو
حفظ سر وحدت ملت ازو

(ترجمہ: یہی عقیدہ ونظریہ قوم کا سرمایہ قوت ہے اور وحدت ملت کے نکتے یا راز کی حفاظت اسی سے ہے)

الٰہی صداقتوں کی جلوہ آفرینیوں نے قلب اقبال میں عشق ختم الرسل کا الاؤ روشن کیا اور عمر بھر وہ فریفتگی کے عالم میں رہے۔

چنانچہ انہوں نے اس امر کا ٹھوک کر اعلان کیا کہ:۔

"اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعوی کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔"

صحبت دانائے راز کا یہ فیضان بطل حریت، فدائے ختم نبوت آغا شورش کاشمیری کی حیات مستعار کے ایک ایک لمحے میں رواں دواں نظر آتا تھا۔ "ہفت روزہ چٹان" کے اوراق اس پر شاہد ہیں، اقبال نے امت مسلمہ کی زبوں حالی پر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہیں لکھا تھا "تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں"۔ یہ بڑی تعجب خیز بات ہے کہ وہ خود بھی ایک درویش خدا مست محدث کبیر علامہ محمد انور شاہ کاشمیری کی نگاہ خاراشگاف کا نخچیر بنے۔ جدوجہد آزادی کے جری رہنما امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے دوستی کی۔ اور دجال قادیان کا ہر سطح پر بطلان کیا۔ آغا جیؒ نے محفل اقبال سے اکتساب کیا اور مذکورہ بزرگان ذی قدر کی

آنکھوں کا تارا بن کر رہے۔ اقبال اور آغا شورشؒ کے احوال میں بے پناہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ آغا جیؒ اقبال کے درسِ حریت پر عمل پیرا رہے۔ وہ خطیب آتش نفس تھے۔ چمن رنگ و بو کا غنچہ شاداب تھے، جمال کہکشاں تھے۔ جلوہ ماہتاب اور ادیب طناز تھے، غیرتوں کا دلآویز نغمہ تھے۔ اعتبار چشمہ فطرت تھے، مایہ دار حسن قدرت تھے، بے شک وہ اپنے عہد کے رجل عظیم اور لائق صد تعظیم تھے، نڈر، بیباک، بپاس لیلائے حریت، بارہا پس دیوار زنداں دھکیلے گئے، رسن و دار سے کھیلے، کڑی صعوبتوں سے گزرے، مگر انکے پائے استقلال میں لغزش یا لرزش نہ آنے پائی۔ وہ خطیب الامتؒ کے خوشہ چینوں میں تھے مگر انکی معیت میں قریہ قریہ، بستی بستی، نگر نگر، ڈگر ڈگر گھومے اور استعمار دشمنی کے بیج بوتے چلے گئے۔ غلاموں میں زندگی کرنے کی روح پھونکی۔ حتی کہ ہر چھوٹے بڑے کے دل سے خوف فرنگ ہوا ہو گیا۔ انہوں نے اقبال کی طرح فرنگی کے ''خود کاشتہ پودا'' کا تا دم واپسیں تعاقب کیا۔ اس معاملے میں وہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے۔ اپنے ہی آپ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ ایمان کا اظہار ایک شعر میں یوں کرتے ہیں۔

''صفحہ کونین سے حرف غلط ہو جاؤ گے
تم نے شورش کی اگر ختمِ نبوت سے دغا''

اس زمانے کے لوگ گواہ ہیں کہ آغا جیؒ نے عقیدہ ختم نبوت کا ڈنکا بجایا ہے۔ ادیبوں اور صحافیوں کی ڈار میں وہ اکیلے عقیدہ تکمیل دین اور ختم رسالت کے فداکار مناد رہے۔ وہ بڑا عجیب دور تھا جب خود کو ماہرین اقبالیات کہلانے والوں نے کلام اقبال / فلسفہ اقبال میں اپنے دجل و تلبیس سے ہر طرف تکدر بکھیر دیا تھا۔ اشعار اقبال کی من چاہی تشریحات کی اور پھیلائی جا رہی تھیں۔ قادیانی لم چھڑے اقبال پر قابض ہونے کیلئے دام ہمرنگ زمین بچھا رہے تھے اور نام نہاد ماہرین اور اقبال شناسی کے مدعی منقار زیر پر تھے۔ ایسے میں شورشؒ نے ''فیضان اقبال'' اور ''اقبالی مجرم'' لکھ کر اقبال فروشوں اور اقبال کے ناجائز قابضین کو زنانے دار تھپڑ رسید کیا۔ وہ مرکزیہ مجلس اقبال کے سیکرٹری کی حیثیت سے ہمیشہ ان دنی سیرت، غلط بیان لوگوں پر گرجتے برستے رہے اور انکی تیز گفتاری ایسے وفا ناشناسوں کے سروں پر گرز رالبرز شکن کا کام کرتی رہی۔

مختصر یہ کہ آغا شورش کاشمیری اقبال کو علی الترتیب ایک عہد، ایک تاریخ اور آخر میں ایک ایسی تحریک سمجھتے رہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ آخر کہا کرتے تھے کہ ''لوگ جوں جوں کلام اقبال سمجھتے جائیں گے ان میں فرات زیست سے مردانہ وار گزرنے کا حوصلہ اور صلاحیت پیدا ہوتی چلی جائیگی اس لئے میں شاعر مشرق کو ہر زمانے میں چلنے والی تحریکات حریت کا مجسمہ قرار دیتا ہوں''

زیر نظر تالیف میں محترم مولانا مشتاق احمد نے وہ تمام رشحات جمع کر دیے ہیں جو اقبال اور اقبالیات کے موضوع پر حضرت آغا شورش کاشمیریؒ کے قلم سے نکلے اور انکے ہفتہ وار چٹان میں زینت قرطاس بنے۔ آغا جیؒ کے کلک گوہر بار کے کھلائے ہوئے پھول کلیاں اکٹھا کرنا بڑی مشقت کا کام تھا۔ جسے مولانا نے شبانہ روز محنت سے مکمل کیا۔ جس پر وہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نوخیز نسلوں کے اذہان وقلوب پر اس تالیف کے مطالعہ سے انتہائی مثبت اثرات مرتب ہونگے اور وہ اپنے مشاہیر کی صحیح معنوں میں قدر افزائی کر سکیں گی۔

سید محمد یونس بخاری

دفتر احرار لاہور

جولائی ۲۰۰۳ء

آغا شورش کاشمیری کی اقبال شناسی

جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید صاحب سابق صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ اور آغا شورش کی سیاسی راہیں جدا جدا تھیں اور شورشؔ کو اقبالؔ کی ہم نشینی کا شرف بھی کم کم ہی حاصل رہا۔ شورش فکری اعتبار سے بدو شعور کو پہنچ رہے تھے اور اقبالؔ فکر و نظر اور شہرت و عظمت کے لحاظ سے مہر و ماہ کی رفعتوں کو چھو رہے تھے۔ اس لیے ذاتی تعلق استوار نہ ہو سکتا تھا، نہ ہوا۔ محض لمحاتی اور اتفاقی سی دو ایک ملاقاتیں اور ان سرسری سی ملاقاتوں کا تاثر بھی انتہائی ناخوشگوار، کہ ہر بار شورش نے اقبال کو مزاجاً درشت پایا۔ اور اسی تاثر کی بنا پر وہ اقبالؔ کے بارے میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

"آج تک میرا ذہن عقیدت مندی کے باوجود اس خیال میں پکا ہے کہ وہ (اقبال) مزاجاً نسیمِ سحر نہ تھے۔"

سیاسی اختلافات اور مزاجاً سخت گیری کے ناخوشگوار شخصی تجربوں کے باوجود شورش کی اقبال سے عقیدت مندی، میرے نزدیک محض اس بناء پر تھی کہ اقبال کا دل حبِ رسول ﷺ سے معمور تھا۔ ان کی شاعری اسی محبت سے مستنیر، جب کہ شورش کے دل میں بھی ناموسِ رسالت ﷺ کے لئے کٹ مرنے کی آرزو کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ گویا حبِ رسالت مآب ﷺ نے ذہنی، فکری اور قلبی طور پر شورش کو اقبال کے قریب تر کر دیا تھا۔ نتیجہ معلوم کہ شورش صحافت، سیاست اور خطابت کے میدانوں میں فکرِ اقبال سے بال و پر لیتے رہے اور انہیں اقبال کی عظمتوں اور محنتوں کا قلم قلم اور قدم قدم اعتراف رہا اور یہی وہ اعتراف ہے جو ایک مقام پر ان کے قلم کی نوک پر یوں لو دے رہا ہے کہ

"اقبال نے شاعری کے سوءِ استعمال کی بیخ کنی کی اور حسنِ استعمال سے اس کو فضل و کمال پر پہنچایا۔ اس فضل و کمال کا سب سے بڑا اعتراف ہندوستانی مسلمانوں کی وہ ذہنی تحریکیں ہیں جن کا نشو و بلوغ خود پاکستان کی صورت میں موجود ہے۔۔۔۔ اقبال نے بلاشبہ کئی کروڑ انسانوں کو بالواسطہ اور بلاواسطہ متاثر کیا اور شائد پوری تاریخ انسانی میں اس لحاظ سے اتنا بڑا شاعر کوئی نہیں۔

اور شورش کا یہ شعر خود بول رہا ہے کہ سیاسی معرکوں میں فکرِ اقبال نے کس طرح شورش کی جرأت و حمیت کو والہانہ پن عطا کیا کہ وہ شاہوں کے تبختر سراپائے استحقار سے ٹھکراتے اور تاج و تخت کو پرکاہ کی حیثیت دیتے رہے۔

اس نے مری زباں کو دیا اذنِ انقلاب
اور مجھے خواجگان سے لڑنا سکھا گیا

اقبال، حضور ﷺ کی محبت میں عمر بھر تڑپتے رہے اور ان کے دل کا یہ سوز، سازِ رنگ بن کر قوسِ حیات کو حلقۂ کامل بناتا رہا اور یوں انکی شاعری کا بیشتر حصہ نعت بنتا چلا گیا۔ انہیں دیارِ خدا اور رسول ﷺ میں حاضری کا شرف بھی نہ مل سکا۔ کیونکہ بلانے والے خوب سمجھتے ہیں کہ کسے حاضری اور کسی حضوری کی توفیق دینا ہے۔ اور کسے محض انتظار میں تڑپانا ہے۔ کہ انتظار میں جوشِ آرزو تیز تر ہوتا رہتا ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے!

اقبال تصوراتی انداز میں دیارِ ناز میں حاضری دیتے رہے۔ اس سفرِ شوق کی کیفیات، اس طور، گدازِ محبت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں کہ وہاں جسمانی طور پر حاضر ہونے والے بیشتر زائرین سرود و حضور کی ان لذتوں کا تصور بھی نہیں کر پاتے کہ مکان کے ساتھ مکین، دل والوں کو نظر آیا کرتا ہے۔ تصور کا حسن، خیال کی رعنائی اور نظر کی سچائی نصیب ہو جائے تو "خانہ" صرف درمیان میں بہانہ ہوا کرتا ہے۔ جب کہ مقصودِ سفر اور محبوبِ نظر صاحبِ خانہ سمجھا جاتا ہے۔

وہ تمام ایک جلوہ، میں تمام ایک سجدہ
مری بندگی میں حائل، نہ جبیں، نہ آستانہ

دوسری طرف، شورش نے ناموسِ رسالت مآب ﷺ کے تحفظ کے سلسلے میں زنجیر و زنداں اور دار و رسن کی صعوبتوں کو اکیلے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھا۔ وہ جیل کی تنگ و تاریک اور بے نور فضاؤں میں "آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است" کا ورد کرتے رہے۔ شورشؔ کی یہ اشک آفرین قربانیاں، دنیائے محبت کی بے غبار صداقتیں ہیں اور یہ صداقتیں اس کی اخروی سرخروئی کی واضح دلیل بھی ہیں۔ کہ خواجہ بطحا ﷺ کی عزت پر کٹ مرنے ہی کا دوسرا نام تکمیلِ ایمان ہے۔ یاد رہے کہ زندگی کے آخری لمحوں میں شورشؔ نے حبِ رسول ﷺ ہی کو اپنی حیاتِ مستعار کا افتخار قرار دیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ موت سے چند لمحے قبل شورشؔ

ے سے حضوری کو گواہ بنا کر کہا تھا۔

''میں بطور عاشقِ رسول ﷺ جا رہا ہوں''

اور دیکھیے کہ زندگی کے رواں دواں لمحوں میں اس کی یہ آرزو اپنے اندر کتنا تیقن لیے ہوئے ہے۔

پہنچوں گا بارگاہِ رسالت مآب میں
شورش ملی ہے مجھ کو بشارت یہ خواب میں
اٹھوں گا عاشقانِ محمد ﷺ کے ہمرکاب
لکھا گیا ہے میری شفاعت کے باب میں

۱۹۷۵ء میں جب جسٹس جاوید اقبال بیرون ملک گئے تو انہوں نے حرم قرطبہ میں بھی حاضری دی اور اس کے بعد عمرہ بھی کیا۔ مدینہ منورہ بھی گئے۔ واپسی پر آغا شورش سے انہوں نے کہا کہ ''میرے والد وہاں (مدینہ منورہ) پہنچنے کے لئے ترستے مر گئے، انہیں نہیں بلایا، کیوں؟ مجھے بلا لیا، کس لئے؟ یہ سن کر شورش رونے لگ گئے اور فرمایا ''عاشقوں کو نہیں بلایا کرتے''

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کو جب غازی علم دین شہیدؒ کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے گلوگیر لہجے میں فرمایا کہ

''اسی گلاں ای کردے رہ گئے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا''

گویا یہ حب رسول ﷺ ہی کا لازوال جذبہ تھا جس نے شعوری طور پر شورش کے دل میں اقبال کی محبت کو پختہ تر اور تابندہ تر رکھا۔ شورش نے ہر مقام پر اقبال کو خراج محبت و ارادت پیش کیا کہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اقبال ۔

☆ مشرق کا ایک عظیم مسلمان ہے۔
☆ اس میں حب رسول ﷺ کا والہانہ پن ہے۔
☆ اس کی شراب، عرب کی کھجور سے کشید ہو کر آئی ہے۔
☆ وہ تخیل کا مجدد اور تصور کا امام ہے۔
☆ وہ بلالِ مشرق بھی ہے اور کلیم ایشیا بھی
☆ ترجمان حقیقت بھی ہے اور حق آگاہ بھی
☆ اس کے کلام میں عجم کا بانکپن بھی ہے۔ اور عرب کا سوز دروں بھی

وہ ہر جلوے میں کلیم، شعلے میں خلیل، غبار میں سوار، مشت خاک میں پارۂ الماس، جسدِ خاکی میں انگارا، خاکستر میں چنگاری اور چنگاری میں فروغ جاوداں ڈھونڈتا ہے۔

الغرض حضور ﷺ کی محبت نے اقبال کی شاعری کو وقار کا وہ اعتبار بخشا کہ اب کئی صدیاں ''دگر دانائے راز'' پیدا نہ کر سکیں گی، دوسری طرف نبی اکرم ﷺ کے نقوش پا ہی کی چاندنی نے شورش کی تحریر اور تقریر کو جذب جنوں کا اسلوب عطا کیا کہ۔۔۔۔۔ ''زبانوں میں تاثیر ہے تو اسی نام سے، قلم میں ولولہ ہے تو اسی ذکر سے، زبان میں بانکپن ہے تو اسی خیال سے، دل میں سرور ہے تو اسی تصور سے، دماغ میں حسن ہے تو اسی جمال سے اور آنکھوں میں نور ہے تو اسی ظہور سے'' ۔

آنکھوں میں نور، دل میں بصیرت ہے آپؐ سے
میں خود تو کچھ نہیں میری قسمت ہے آپؐ سے

اقبال اور شورش۔۔۔ باہمی تقابل کسی نوع بھی انسب نہیں ہے۔ مگر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مستقبل بعید میں نہ کسی دوسرے اقبال کا ظہور دکھائی دیتا ہے اور نہ قحط الرجال کے اس دور فتنۂ آخر زماں میں شورش جیسا کوئی دوسرا نظر آتا ہے۔ پروفیسر مرزا محمد منور مرحوم نے درست کہا تھا کہ ۔

''اب شاید براعظم پاک و ہند میں کوئی اور ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو آغا صاحب جیسے زور زبان اور زور قلم پر قادر ہو، ان کا ادب خطیبانہ شان کا مالک تھا اور ان کی خطابتِ ادیبانہ ان کی سجدہ گاہ تھی۔ آغا صاحب سے بارہا بطرز تحسین، مگر بطور اظہار حقیقت کہا!

''آغا جان! آپ برعظیم کے قافلہ خطباء کے آخری شہسوار ہیں'' اور خدا گواہ، میں نہ اس وقت مبالغہ کر رہا تھا اور نہ آج۔ اگر پاکستان میں کوئی دوسرا شورش ہے تو بتائیے، اگر ہندوستان میں کوئی دوسرا شورش ہے تو آگاہ فرمائیے''

مرزا محمد منور کے اس اظہار حقیقت کے بعد آغا شورش کے درج ذیل اشعار میں تعلّیانہ خودنمائی کا کوئی سا شائبہ بھی نظر نہیں آتا ۔

فنا ہو جائیں گے ہم اور تم آنسو بہاؤ گے
ہمارے بعد ہم جیسے کہاں سے لوگ لاؤ گے
ہم ایسا پھر کوئی خاکِ وطن سے شاذ اٹھے گا
پھرو گے ڈھونڈتے، لیکن ہمیں ہرگز نہ پاؤ گے

تمہاری سر بلندی ایک دن مجبور کردے گی
ہمارے نقشِ پا ہوں گے، جہاں تم سر جکاؤ گے
زمیں پر جب کوئی افتادِ تازہ سر اٹھائے گی
ہماری جرأتوں کی داستانیں جگمگاؤ گے
ہم ایسے لوگ یارو آئے دن پیدا نہیں ہوتے
وفا کی آرزو لے کر ہمارے گیت گاؤ گے

یہ امر خوش آئند ہے کہ شورش کی زبان اور قلم سے نکلا ہوا ایک ایک جملہ محفوظ کرنے کی روش چل نکلی ہے اور جناب مولانا مشتاق احمد کی زیرِ نظر تالیف اسی سلسلے کی ایک خوبصورت کڑی ہے ان کی یہ کاوش شورش کی اقبال شناسی اور اقبال پسندی کا اعتراف بھی ہے اور مؤلف کی تحقیقی اور ادبی صلاحیتوں کا ایک واضح ثبوت بھی۔ اس کی ترتیب، ان کے اپنے حسنِ ذوق، وسعتِ مطالعہ، علمی رسوخ اور سلامتیِ فکر کی آئینہ دار ہے۔ آغا شورش کاشمیری کے رنگ و آہنگ سے کسی شخص کا ذہنی لگاؤ خود بخود بولتا ہے کہ اس شخص کو ابوالکلام آزاد کی پرشکوہ علمیت، اقبال کے مفکرانہ سوز و ساز، ظفر علی خان کے نعرۂ پیکار، چوہدری افضل حق کی رعنائی افکار اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خطیبانہ زمزموں سے محبت ہے۔ حق یہ ہے کہ اثر پذیری اور اثر اندازی کا لین دین بڑا ہی ادب پرور معاملہ ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید
۱۸ر جولائی ۲۰۰۳ء

آغا شورش کاشمیری...... ایک عہد ساز شخصیت

آغا شورش کاشمیری ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ خودداری، قناعت۔ بلند حوصلگی مضبوط قوتِ ارادی کے پیکر، حق گوئی و بے باکی کا مجسمہ خطابت و شاعری، صحافت و سیاست میں نئی روایات کے بانی۔

نغز گو، جدت نوا، اخگر قلم، باطن شناس
بے خطر، بے خوف، بے وسواس، بے غم، بے ہراس
بے دھڑک، بے باک، مردم آشنا، اہل سپاس
یوں چنگھاڑا بت کدوں میں شورش آذر شکن
جیسے روباہوں میں کوئی ضیغم پنجہ فگن

نکتہ فہم و نکتہ داں و نکتہ سنج و نکتہ رس
زینتِ صحنِ گلستاں، رونقِ کنجِ قفس
جس کی ضربِ حق سے لرزاں واعظانِ بوالہوس
رستخیزِ وقت کا نباض، فتنوں کا طبیب
منبر و دار و رسن کا محض اکلوتا خطیب (نسیم لیہ)

جناب مجیب الرحمٰن شامی نے (1949ء) ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں''۔ کراچی) آغا صاحب کی شخصیت کا بہت عمدہ تجزیہ کیا تھا۔

وہ لکھتے ہیں'' آغا شورش کاشمیری۔۔۔۔ عظمت۔ عزیمت اور استقامت کا نشاں ہیں۔ وہ اگر کسی مغربی ملک میں ہوتے تو لوگ ان کی زندگی ہی میں ان کے مجسمے بنا کر جا بجا نصب کر دیتے۔ شاہ جی کی خطابت کا بانکپن، ابوالکلام کا شکوہ، اقبال کی ذہنی بیداری، ظفر علی خاں کی قادر الکلامی، ان سب کو اکٹھا کیا جائے تو شورش کا صحیح خاکہ تیار ہوتا ہے۔ وہ گفتار اور کردار دونوں کے غازی ہیں۔ جو بات صحیح سمجھیں، اسے پوری شدت کے ساتھ کہتے ہیں۔ سچ کہنے سے کبھی باز نہیں آتے۔ خواہ اس سے بھانبڑ ہی کیوں نہ مچ جائے۔ اکثر و بیشتر اس بھانبڑ میں وہ خود ہی جلے ہیں لیکن انہوں نے اپنے تصورات، خیالات، اصول اور فکر کو نہیں جلنے دیا۔ وہ ہمیشہ

اس بھانبڑ ہی کو گلزار بنا کر نکلے ہیں اور یوں سنت ابراہیمی کو ایک نئی شان اور نرالی آن سے اس دور میں زندہ کیا ہے۔ آغا صاحب کی گردن کسی نمرودِ زمانہ کے سامنے خم نہیں ہوئی، انہوں نے اپنی عمر کے متعدد سال جیل کی تنہائیوں میں گزارے ہیں۔ لیکن یہ تنہائیاں ان سے کچھ نہیں چھین سکیں۔ شورش صاحب کا دل، دماغ، ذہن، قلم، زبان سب اسلام اور نظریہ پاکستان کے لئے وقف ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ ایک ہی منزل ہے، ایک ہی لگن ہے۔ ایک ہی تڑپ ہے اور وہ ہے اسلام کی سربلندی۔۔۔۔۔

آغا صاحب انگریزوں سے بھی لڑے ہیں۔ اور پاکستان کی استبدادی قوتوں سے بھی۔ انہیں بیگانوں نے بھی دکھ پہنچائے اور نام نہاد اپنوں نے بھی چرکے دیئے۔ لیکن ان کا حریف ان پر کبھی غالب نہیں آیا۔ ہمیشہ وہی اس پر غالب آئے ہیں۔" (ہفت روزہ چٹان ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء)

شورش تحریک حریت کی جس جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اس کی کتھا انہوں نے پس دیوار زنداں میں قلم بند کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین حریت کا تعارف آغا صاحب کی زبانی بیان کیا جائے۔ جماعت کا یہ تعارف خود آغا صاحب کا تعارف بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ ایک کہانی نہیں، کئی کہانیاں ہیں، ان کہانیوں میں دار و رسن کے نوحے بھی ہیں اور شعر و سخن کے زمزمے بھی۔ قید تنہائی کا سناٹا بھی ہے، زور قلم کا فراٹا بھی، آنسوؤں کی مالا بھی، آہوں کا ہالا بھی، پچھلے پہر کی یادیں بھی ہیں۔ دیدہ و دل کی فریادیں بھی، دوستوں کی باتیں بھی ہیں، دشمنوں کی گھاتیں بھی، ہجر کی رات بھی ہے، وصل کی بات بھی، غرض زلف و زنجیر کے رشتے اور زخم و مرہم کے ناطے اس کہانی کے بین السطور کی آبرو ہیں۔ پھول کی پتی اور ہیرے کے جگر کا آمیختہ مؤلف کے دل گداختہ کی لو سے سرآشتہ ہو گیا ہے۔

جب یہاں برطانوی سامراج اپنے ہندوستانی فرزندوں کی اعانت سے حکمران تھا اور گنگا و جمنا کی لہروں سے لے کر راوی اور جہلم کے کناروں تک اس کی ہیبت کے نشان کندہ تھے۔

جب انقلاب زندہ باد کی آواز پر بیچ بازاروں کے ٹکٹکیاں گاڑ دی جاتیں اور البیلے نوجوانوں کو ان پر باندھ کر ان کے گوشت اور لہو کا تماشا دیکھا جاتا تھا۔

جب کاسہ لیسوں کو خطابات اور مخبروں کو انعامات دیئے جاتے تھے اور وہ عاقبت کے ان نوشتوں پر خوش ہوتے تھے۔

تب ایک قافلہ نیم جاں گریبان کے چاک سے آزادی کا پھریرا بنا کر نکلا۔ اس کی آواز شروع میں

شہنائی تھی۔ آخر تلوار ہو گئی۔ یہ کارواں رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ ع

ہم سفر آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ایک آواز جو پہلے استدعا تھی پھر قرارداد ہو گئی۔ قرارداد سے احتجاج، احتجاج سے مظاہرہ، مظاہرے سے تحریک، تحریک سے طوفان اور طوفان سے ابر و رعد کا جلال لے کر برطانوی استعمار کی شہ رگ پر خنجر۔۔۔ یہ کہانی اس قافلے اور اس خنجر ہی کا تذکرہ ہے۔ کہیں ناقوس سے شروع ہو کر اذان پر ختم ہوتی ہے اور کہیں اذان کا سہارا لے کر ناقوس تک پہنچتی ہے۔ یہ ایک فرد کی کہانی نہیں۔ مولف صرف نگارندہ ہے، اس نے اپنی کہانی صرف اس حد تک بیان کی ہے جس حد تک کہ اس میں سے گزرا ہے۔ یہ کہانی ایک عہد، ایک درد، ایک انجمن، ایک تحریک، ایک ولولے اور ایک معرکے کی تاریخ ہے جس میں عشق و فرض ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور گوشت پوست کا انسان فولاد و سنگ کی ہمراہی میں آواز و رنگ سے تصویریں تیار کرتا ہے۔ یہ الفاظ کے ساز اور معانی کے راز ہیں۔ لے اور نے کی آشفتہ کاری ہے۔ یہ محض انشا نہیں۔ یہ آپ بیتی ہے۔ اور جگ بیتی میں گندھی ہے۔ یہ ان طویل و عمیق اور رفیق و شفیق یادوں کا مجموعہ ہے جو طوق و سلاسل کے آب و گل میں ڈھلتی رہی ہیں۔"

آغا صاحب کے دیرینہ مہربان اور معروف صحافی م۔ش۔ تمام تر معاصرت کے باوجود ان کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

"آغا شورش کاشمیری کی مختلف النوع زندگی پر غور کرتا ہوں تو مرحوم کی بے پناہ صلاحیتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ ایک نچلے سے بھی نچلے طبقہ کا فرد جو اپنے باپ دادا کی غربت کو چھپاتا نہیں، بلکہ جو اپنے خاندانی افلاس کا نقشہ پوری دیانتداری سے لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیتا ہے اور جس نے کسی کالج سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ محض اپنی خداداد صلاحیتوں سے کہیں عظیم الشان مجمعوں میں ایک بے پناہ مقرر بن کر سکہ جماتا نظر آتا ہے۔ جو اپنی خطابت کے سحر سے، جس بات کے متعلق چاہے لوگوں سے ہاتھ اٹھوا سکتا ہے۔ کہیں سماجی محفلوں میں شاعر رنگین نوا بن کر محبوبیت کا پیکر بنا نظر آتا ہے۔ کہیں کاروباری دنیا میں طلب اور رسد کی پیچیدگیوں سے ماہرانہ آشنائی کے باعث، کامیابی کا دیوتا بن کر چمکتا نظر آتا ہے۔ کہیں سیاسی محفلوں میں نواب ممدوٹ حسین، شہید سہروردی، شیخ خورشید احمد، نواب کالاباغ اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے مختلف النوع سیاستدانوں کے سیاسی مشیر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ کہیں صحافت کی دنیا میں حمید نظامی کا ساتھی بن کر یورپ اور مشرق بعید کے ملکوں کو

اپنے پاؤں تلے روندتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک جگہ وہ اقبال کا عاشق زار ہے، دوسرے مقام پر وہ ابوالکلام آزاد کا پرستار ہے۔ ایک کنج میں ہم اسے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے راز و نیاز میں محو پاتے ہیں تو دوسرے موڑ پر وہ حضرت مولانا ظفر علی خاں کی شفقت نگاہ کے مرتکز نظر آتے ہیں۔

احرار سے وابستگی کے باعث وہ کانگریس کی نئی امپریلیٹ یلغار میں ہراول دستے کے سپاہی بن کر جیلوں کو آباد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تو اسلام سے شیفتگی کی بنا پر وہ مولانا ظفر علی خان کے اتحاد ملت کے نقیب بن کر شہید گنج کی اینٹوں کے تقدس کے تحفظ کے لیے پابند سلاسل ہوتے نظر آتے ہیں۔

نثر لکھیں گے تو کوثر کی دھلی ہوئی زبان کا دہلی اور لکھنو کے محاورے سے میل کرا دیں گے۔ نظم کہیں گے تو مولانا ظفر علی خاں کی برجستگی کا گمان ہونے لگے گا۔ ہجو کہنے پر آئیں گے تو سودا کو پیچھے چھوڑ جائیں گے اور اگر کسی قصیدہ کہنے پر آمادہ ہو گئے تو قاآنی کی یاد تازہ کر دیں گے۔ غرض لاہور کے تنگ و تاریک کوچوں میں ایک بوسیدہ مکان میں پیدا ہونے والا عبدالکریم جو آج برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں آغا شورش کاشمیری کے نام سے بقائے دوام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ ایک نابغہ روزگار انسان تھا جو بپھرتا تھا تو سمندروں کا طوفان بن جاتا تھا۔ محبت کے موڈ میں ہوتا تھا تو پھول کی پتیوں کی سیج میں ڈھل جاتا تھا"

آغا شورش کاشمیری کی رحلت سے علم و ادب، صحافت و سیاست، اور خطابت کی محفلیں ویراں ہو گئیں اور آج ہر علم و ادب کا شیدائی آغا شورش کی کمی کو بے حد محسوس کرتا ہے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا

آغا شورش کاشمیری کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی حکیم آزاد شیرازی نے یوں منظر کشی کی ہے۔

ذہن، قلم، دماغ خطابت چلا گیا
شورش گیا کہ شور قیامت چلا گیا

سونی پڑی ہیں شعر و سیاست کی محفلیں
جان جہانِ شعر و سیاست چلا گیا

اپنے حصار ذات میں اک انجمن تھا جو
وہ فرد تھا جو فخر جماعت چلا گیا

رومی کا سوز و ساز، وہ رازی کا پیچ و تاب
اقبال کا وہ فکر حقیقت چلا گیا

اب کوئی بو کلام کا وارث نہیں
لطفِ کلام، ذوق سماعت چلا گیا

نسبت ظفر علی کے قلم سے ہے اب کسے
شورش گیا، امام صحافت چلا گیا

بزم سخن میں اب کسے یارائے اجتہاد
وہ یادگار غالب و حسرت چلا گیا

وہ شخص اٹھ گیا جو قلم کی تھا آبرو
قائم تھی جس سے شعر کی عظمت چلا گیا

سب ٹوڈیوں کے بند قبا کھولتا ہوا
وہ دردمندِ مذہب و ملت چلا گیا

کھیلے گا کون پادشاہی کے نقاب سے
وہ رازدارِ جلوت و خلوت چلا گیا

کس کے قلم میں تاب و تواں ہے لکھ سکے
سقراط عصر، حرف صداقت چلا گیا

علم و تحقیق، شعر و ادب، وعظ و خطابت، سیاست و صحافت، جرات و شعلہ نوائی کو اگر یکجا کر دیا جائے تو اس مجموعہ کا نام آغا شورش کاشمیری ہے۔

"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق وہ بارگاہ الٰہیہ سے بے شمار خوبیاں اور کمالات لے کر دنیا میں آئے تھے۔ بچپن میں ہی وہ ایسا دل و دماغ رکھتے تھے کہ ؎

بالائے سرش زہوشمند ی
می تافت ستارہ بلندی

ابتدائی عمر میں ہی انہیں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رفاقت میسر آئی۔ ان کے مقدر کا ستارہ چمکا اور وہ کندن بن گئے۔ مخلص اور باکمال استاد اور باصلاحیت شاگرد ہوں تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ آغا شورش نے شاہ جی کی خطابت، ابوالکلام آزاد کی تحریر اور مولانا ظفر علی خان کی قادر الکلامی کی خصوصیات کو اپنے میں مکمل طور پر جذب کیا۔ ان بزرگوں کی حق گوئی و بیباکی، عزیمت و استقامت آغا کے دل و دماغ پر اس طرح نقش ہوئی کہ انہوں نے اپنے وقت کے بڑے بڑے فرعونوں کو للکارا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

انگریزی دور حکومت ہو یا پاکستان کے خود غرض اور غیروں کے آگے جھکنے والے حکمران۔ عہدوں اور منصبوں کے طلبگار صحافی ہوں یا شراب و شباب کے رسیا شاعر، باطل کے سامنے سرنگوں ہونے والے علمائے سُو ہوں یا مریدوں کی عقیدتوں سے کھیلنے والے جعلی پیر، وہ ہر ایک طبقہ سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ اور اکثر چو مکھی لڑائی کرتے ہیں۔ بیک وقت کئی کئی محاذوں پر لڑنا، حق گوئی و بے باکی کے انمٹ نقوش قائم کرنا، آغا کے لئے مشکل نہ تھا۔ ان خصوصیات کی بنا پر آغا صاحب خواص و عوام کے دلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

جملہ معترضہ کے طور پر یہ واضح رہے کہ آغا شورش کاشمیری علمائے حق، پیرانِ عظام اور اصول پسند صحافیوں اور شاعروں کے مداح تھے اور ان کی مدح و توصیف میں بہت کچھ لکھتے رہتے تھے جو کہ ارباب نظر سے مخفی نہیں ہے۔ حق گوئی کے لئے عظمت کردار ایک بنیادی شرط ہے، جو شخص خود طرح طرح کی معصیتوں سے آلودہ ہو، وہ کسی دوسرے کو کیسے للکار سکتا ہے؟ چھلنی لوٹے کو دو سوراخ ہونے کا طعنہ دے تو کیوں دے۔ آغا

شورش اگرچہ صوفی وزاہد نہ تھے لیکن ان کا دل ودماغ حرص وآز، خوف وہراس اور نفسانی گناہ کی آلودگیوں سے پاک تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے مخالفین کو للکار کر کہتے تھے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں بیک جنبش میں
جسے ہو غرور، آئے کرے شکار مجھے

لیکن کبھی کسی کو اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

اس حق گوئی کے پس منظر میں ان کے درج ذیل افکار کارفرما تھے۔

۱۔ ''میں چاہتا ہوں موجودہ معاشرہ تہس نہس ہو جائے۔ اس کی جگہ ایک نیا معاشرہ پیدا ہو۔ جس کی بنیاد مجلسی اور معاشی انصاف پر ہو۔ لیکن جس کی حاکمیت اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہو۔ حکومت لوگوں کے اخلاق کی نگہبان و پشتیبان ہو۔ اس زمانہ کی حکومتیں سیاسی الجھاؤ میں اتنا پھنس چکی ہیں کہ انہیں لوگوں کے اخلاق اور لوگوں کی سیرت سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ وہ صرف اپنے ہی وجود کی بقاء کے لئے کوشش کرتی ہیں۔ انہیں اخلاقی یا انسانی سیرت کا شاذ ہی خیال آتا ہے، ان حکومتوں نے انسان کے اخلاق کو ان کا ذاتی فعل قرار دے رکھا ہے۔ وہ سمجھتی ہے۔ قانون کا مقصد صرف ان کی حفاظت کرنا ہے۔ اس کا کام اخلاق عامہ کی حفاظت کرنا نہیں۔ جہاں معاشرہ عمومی خرابیوں اور خصوصی بیماریوں میں مبتلا ہو۔ وہاں قانون ہی سب سے بڑی قوت نافذہ ہے اور کوئی قانون اس وقت تک قانون نہیں ہوتا۔ جب تک اس کے پیچھے طاقت نہ ہو۔

۲۔ موجودہ سرمایا دارانہ نظام قطعاً ختم کر دینے کی چیز ہے۔ میں اپنے اسلامی مطالعہ کی بنا پر علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اسلام اور انسان کو سب سے زیادہ نقصان جاگیرداری اور سرمایہ داری نے پہنچایا ہے۔ سرمایہ داری نے جاگیرداری نظام کی برائیوں اور ذاتی ملکیتوں کی خرابیوں کو موجودہ نظام میں اپنے ارتقا کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ اس نظام نے نہ صرف انسان کی محنت کا استحصال کیا بلکہ انسان کی توانائی کمزور کر دی ہے۔ حتیٰ کہ انسانی غیرت کا گلا بھی اس کے ہاتھوں گھٹ گیا ہے۔ انسان کی عزت اس نظام کے مذبح خانے کی بھینٹ ہو چکی ہے۔

۳۔ میرے نزدیک صحافت بھی عبادت ہے، جس طرح عبادت میں شرک کا تصور مسلمان کے نزدیک حرام ہے۔ اسی طرح صحافت میں جو خیال، نظریہ یا چیز طمع وحرص یا فریب وہوس کی بدولت راہ پاتی ہے۔ سب سے بڑی معصیت ہے۔

۴۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہمارے ادیب عصری تقاضوں کو سمجھتے ہی نہیں یا ان کے سمجھنے سے معذور ہیں۔ لیکن جس خلا کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ادیب بعض تحریکوں اور بعض نعروں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ روٹی کا یا جنس کا مسئلہ ہے۔ بوجوہ نوجوان پود کا فکری محور انہی کے گرد گھومتا ہے۔

۵۔ اس دور کے اس سانحہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کی اس طویل ترین مدت میں جس گروہ نے سب سے زیادہ غداری کی، بلکہ رات کے عمیق سناٹوں میں طرفدار ہو گئے۔ وہ پاکستان کے یہی اہل قلم تھے۔ چند ایک نے بھلے وقت کے انتظار میں سکوت اختیار کیا۔ کیبوں کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا۔ بیشتر حکومت کے مختلف نگارخانوں میں مجراعرض کرنے پہنچ گئے۔ مصلحت اندیشی اور مفاہمت پسندی ان کا ایمان ومسلک اور ملفوف خوشامد ان کا دھرم ہو گیا ہے۔

پچھلے دس سال سے ادیبوں نے قوم کو غیر ملکی ترجموں کا زہر پلانا شروع کیا۔ شاعروں نے گریز وفرار اختیار کیا۔ مؤرخوں نے تاریخ کے چہرے کو اتنا مسخ کیا۔ جیسے کسی نے تارکول مل دیا ہو۔

۶۔ رہ گئے صحافی تو معاف کیجئے صحافی چلے گئے، منشی آگئے۔ سارے ملک میں (الا ماشاء اللہ) کوئی صحافی نہ رہا۔ جو یہ کہہ سکے کہ اس کو اپنے قلم پر اعتماد ہے۔ ساری صحافت میں ایک بھی ابوالکلام، ظفر علی خان، محمد علی جوہر، حسرت موہانی نہیں۔ کلرک جرنلسٹ ہو گئے ہیں۔ انہی خود فروشی پر حیا نہیں آتی۔

ایک نئی دلیل وضع کی ہے کہ ذاتی خیالات اور شخصی ملازمت دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہم اخباروں میں مالکوں کی مرضی کے تابع کام کرتے ہیں۔ ان اشقیاء کو یہ معلوم نہیں کہ دنیا میں ہر چیز محنت نہیں ہوتی کہ فروخت ہو، قلم کی عصمت، ماں، بہن کی عصمت ہے۔ قدرت جن لوگوں کو فکر ونظر کا جوہر بخشتی ہے اس لئے نہیں کہ اس کو فروخت کیا جائے اور اس کے ٹکے کھرے کیے جائیں۔

اب صحافت کسی تحریک، جماعت یا مقصد کو جنم نہیں دے رہی۔ اپنے عناصر ترکیبی کی بدولت ایک نمائش گھر ہو گئی ہے۔ جس میں مختلف اشیاء کے سٹال لگے ہوتے ہیں اور جس کے پنڈال میں سبھی قسم کے لوگ گھوم پھر سکتے ہیں۔ میں اس تصور ہی سے گھبرا اٹھتا ہوں کہ مستقبل کا مورخ ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔ صحافت اب صحافت نہیں رہی۔ بساطی کی دکان ہو گئی ہے۔ جن لوگوں کا اس پر قبضہ ہے یعنی جو اس کے مالک ہیں وہ یا تو نوکر شاہی کے بتاشے ہیں یا پھر بے دماغ صنعتیے جو صحافت کو تجارت اور صنعت سمجھ کر چلا رہے ہیں۔ انہیں قوم کے مستقبل سے زیادہ اپنا بیلنس شیٹ عزیز ہے۔

۷۔ قادیانیت کے وجود کی سیاسی غرض و غایت سمجھنے کی ضرورت ہے، اگر چہ ان کا دینی تعاقب بھی ضروری ہے تا کہ سادہ دل عوام گمراہ نہ ہوں لیکن اس تحریک کا سیاسی پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ ایک صیہونی تحریک ہے۔ جب تک صیہونی تحریک کے پس منظر میں قادیانی تحریک کا جائزہ نہ لیا جائے اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین نہ کیا جائے کہ قادیانی، مسلمان خواص کو مسلمان عوام سے الگ کر کے اپنے قبضہ اقتدار کی راہیں ہموار کر رہے ہیں اور ان کا رسوخ پاکستان میں ایک نئے ملوکانہ نظام کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت تک ان کا تعاقب و استیصال ناممکن ہے۔ (ماخوذ از شورش کاشمیری ایک مطالعہ، ایک تجزیہ)

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ایسے انقلابی خیالات ہوں، اور وہ حرص و آز اور خوف و ہراس سے بے نیاز ہو۔ زبان و بیان کا ماہر اور انتہائی حساس دل رکھنے والا ادیب، شاعر اور صحافی ہو، وہ لازماً حق گوئی اور جرأت و استقامت کی راہ میں نئی تاریخ قلمبند کرے گا۔

وہ ''ترقی پسند مصنفین'' کی انجمن کو انجمن ستائش باہمی کے نام سے پکارا کرتے تھے جو کہ ان کے نزدیک ''من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو'' کی آئینہ دار تھی۔ ان لوگوں نے ملی بھگت کر کے جرائد و رسائل اور محافل و مجالس کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ حتیٰ کہ ایک ادبی تحریک میں وہی سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کئے جو اشتراکی تحریک کے لئے خاص ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان سے متفق نہ ہو سکے ان کا مقاطعہ کر دیا۔

آغا صاحب کی اس بے لاگ تنقید و تجزیہ کا اثر یہ ہوا کہ آغا صاحب صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کی ایک کثیر تعداد کے نزدیک گردن زدنی ہو گئے۔ آغا کی زندگی میں تو ان کے سامنے خس و خاشاک کی مانند رہے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد بال و پر نکالنے شروع کئے اور جوابی اقدامات کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ایسے ایسے مضامین لکھے جانے لگے کہ قاری کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ آغا صاحب کی تعریف ہے یا تنقیص! وجہ یہ ہے کہ تعریف و الزامات کے دونوں پہلو ساتھ ساتھ لکھے گئے ہیں۔

ایک پیراگراف تعریف پر مبنی ہے تو دوسرا توہین و تذلیل پر۔ معلوم نہیں اخلاق و صحافت کا یہ کون سا معیار ہے اور اس اسلوب میں ایسے صحافیوں کا استاد کون ہے؟

منہ پر ہی گرا جس نے چاند پہ تھوکا۔

بہرحال آغا صاحب کو خود بھی ان حاسدوں کے وجود کا اعتراف تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

''ہر وہ آدمی جو پبلک لائف میں آتا ہے یا جس کو ان گوشہ ہائے زندگی سے واسطہ پڑتا ہے جس کا تعلق پبلک سے ہو تو اس کو زندگی میں ان تھوتھلے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ جس آدمی کے مخالف نہ ہوں

میرے نزدیک وہ مکمل نہیں اور جس کے حاسد نہ ہوں وہ ادھورا ہے۔

حاسد ہمیشہ بدقسمت ہوتا ہے۔ اس کی روح کو ایک گھن لگا رہتا ہے۔ جو اس کے خون میں سڑاند پیدا کرتا ہے، حاسد صرف اس لئے جلتے ہیں کہ وہ چیز جو ان کے محسود میں آ گئی ہے وہ ان میں کیوں نہیں، یہی آگ ان کے اندر سلگتی رہتی ہے، پھر ایک دن بھڑک اٹھتی ہے۔ آخر کار ان کو بجھا دیتی ہے۔ حاسد سے بڑھ کر کوئی انسان بدقسمت نہیں۔

آغا صاحب اس صورت حال کو اپنی خوش قسمتی قرار دیتے ہیں۔

''ظاہر ہے جس شخص کے حاسد، رقیب یا دشمن ہوں گے وہ خوش قسمت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں ضرور کوئی خوبی رکھی ہے جس سے یہ لوگ جلتے اور بھنتے ہیں۔ ایک بڑا فائدہ ان سے یہ پہنچتا ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے آگاہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ اپنے حسن کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نگرانی کرتا اور ان سے پرہیز کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری بہت سی کوتاہیاں اور کمزوریاں میرے حاسدوں کی وجہ سے چھٹ گئی ہیں۔''

حاسدوں کی کثرت بلاشبہ آغا صاحب کی خوش قسمتی ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں میں جو آغا شورش کے حاسد تھے، وہ ان وفات تک تو منقار زیر پر رہے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد خوب بال و پر نکالے ہیں۔ اپنی تحریروں میں، ادبی تاریخوں اور نصابی کتب میں آغا شورش کا ذکر اولاً تو کرتے ہی نہیں، اگر کرنا بھی پڑے تو انتہائی مختصر اور دبے الفاظ میں۔ ثانیاً وہ تحریریں اسلامی نظریات کے تحفظ کے محاذ پر آغا شورش کی خدمات کے تذکرہ سے خالی ہوتی ہیں۔

حاسدوں کی حقائق پوشی اور شپرہ چشم ہونے کی صفت کے باوجود آغا شورش زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''میرے نزدیک نقاد حضرات کو چاہیے کہ وہ شورش کی تحریروں سے اغماض کا مسلک ترک کریں ان کے علمی، ادبی اور سفری کارناموں کا خاکہ پیش کریں۔ تا کہ اردو ادب میں ان کے صحیح مقام کا تعین ہو سکے۔ شورش ادبی نقادوں سے کچھ شاکی تھے اور میرے نزدیک بجا طور پر شاکی تھے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ان سے اغماض برتا گیا لیکن میں نے انہیں یہی کہا کہ ادیب کو دوسروں کی تحریریں نہیں، اس کی اپنی تخلیقات زندہ رکھتی ہیں۔ اس لئے کوئی نقاد نوٹس لے یا نہ لے آپ کی تخلیقات، آپ کو زندہ رکھیں گی۔''

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا اگر چہ یہ کہنا درست ہے کہ آغا شورش کے ادبی کارناموں کو چھپانا

حاسدوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

لیکن ان لوگوں کی ادبی بددیانتی پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

حاسدوں کے حوالہ سے یہ چند سطور جملہ معترضہ کے طور پر تحریر کی گئیں ہیں۔ آمدم برسر مطلب! آغا شورش کی جرأت و بیباکی کا تذکرہ چل رہا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حق گوئی کی چند مثالیں پیش کی جائیں۔

۱۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کے سلسلہ میں احتجاجی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "گوری چمڑی والے گورنر کو راستے سے ہٹ جانا چاہئے۔ وہ ایک گندا ناٹک کھیل رہا ہے۔ جو کچھ بھی وہ کر رہا ہے، ہم اس سے باخبر ہیں۔ وہ ہمارے صوبہ میں خون خرابہ کرانا چاہتا ہے۔ شہید گنج سکھوں نے نہیں گرائی۔ گورنر نے گرائی ہے۔ مسجد تو ہم لے کر ہی رہیں گے۔ آج نہیں تو کل، لیکن ہم دلی کے لال قلعہ پر بھی پرچم اسلام لہرانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

(ہفت روزہ چٹان شورش کاشمیری نمبر صفحہ ۴)

آغا صاحب اس حق گوئی پر گرفتار ہوئے اور تقریباً چار ماہ قید رہے۔

۲۔ ملتان میں عدالت سے خطاب کرتے ہوئے شورش نے کہا۔

"میں اس ملک کی آزادی کے نام پر آپ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اس کرسی کو خالی کر دیں۔ یہ کرسی ہندوستان کی آزادی کے خلاف انصاف کا لوح مزار ہے۔ آپ اس کرسی پر بیٹھ کر جس قانون کے تحت فیصلے سنا رہے ہیں۔ اس قانون نے ہماری قومی غیرت کو کچل ڈالا ہے، آیئے اس قانون، اس انصاف، اس حکومت اور اس کے نظام کے خلاف بغاوت کر دیں۔ ہندوستان کی آزادی اپنے لئے کم سے کم یہ مطالبہ ضرور کرتی ہے کہ اب تک اس کرسی کا مزہ چکھا ہے، اب اس کٹہرہ کا شرف بھی حاصل کیجئے۔ آپ اس کی لذت سے آشنا ہو گئے، تو آپ کے لئے ہی نہیں آپ کی آئندہ نسلوں کیلئے بھی عز و شرف کا باعث ہوگا۔"

اس پر سنت رام مٹی اے ڈی ایم ملتان نے پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی اور آغا شورش شکریہ کہہ کر جیل چلے گئے۔

ہو مبارک یہ میری جرأتِ گفتار مجھے
کیا تماشا ہے ڈراتے ہیں ستمگار مجھے
کج کلاہوں کے در و بام ہلا ڈالے ہیں
اپنے اس جسم کی شدت کا ہے اقرار مجھے

آغا صاحب اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی ادبی و شعری صلاحیتوں کا تجزیہ کرتے رہے۔ اس کی قطعاً پروانہ کی کہ متعلقہ شخصیات ناراض ہو جائیں گی۔ اس حق گوئی کے دو نمونے درج ذیل ہیں۔

۱۔ پطرس ادب میں کب تک زندہ رہ سکتے ہیں یہ محل نظر ہے مرحوم ایک ادیب سے زیادہ ایک محفل آراء شخصیت تھے۔ انہیں مختلف زبانوں کے ادبیات کا انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا تھا لیکن ان کی یہ خوبی ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔ تاثیر کا ادبی ترکہ محدود ہے اور اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت بھی برائے نام ہے لیکن وہ ایک زبردست ادبی اور سیاسی کھلاڑی تھے۔ انہیں اس برعظیم کی ترقی پسند تحریک کا سرخیل کہا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے ہی داؤں پیچ کی وجہ سے وہ اسی پود کے ہاتھوں مارے گئے جسے انہوں نے خود تیار کیا یا جس کا بیج ان کے اپنے ہاتھوں بویا گیا تھا۔ تبسم عمر بھر طلباء کے استاد رہے۔ پھر ریڈیو کے ہو گئے۔ ان کے کلام میں پختگی ضرور ہے، شگفتگی ناواں ناواں ہے۔ امتیاز علی تاج مرنجاں مرنج ہیں، لیکن انارکلی یا چچا چھکن میں اتنا بوتا نہیں کہ انہیں دوام حاصل ہو۔ ان کی حیثیت ایک مہر شدہ ادیب کی ہے۔ البتہ حفیظ میں ایک بڑے شاعر کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں۔ ان کے بغیر اردو غزل یا اردو نظم کا ہر تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ (نورتن)

۲۔ فیض کے سوا ترقی پسندوں میں دوسرا کوئی شاعر عبقری و عصری نہیں۔ فراق گورکھپوری اگر ترقی پسندوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں تو وہ نعرہ باز یا محض اشتراکی نہیں ان کے لہجہ میں وہی غزل کی آن بان ہے۔

احمد ندیم قاسمی صرف شاعر ہیں۔ جہاں انہوں نے اشتراکی ہونے کی کوشش کی، خود اپنی چال بھول گئے۔ ظہیر کاشمیری نوجوان اشتراکی شاعروں میں رزم و بزم کا نوجوان شاعر ہے لیکن اس کو ترقی پسند مصنفین اپنے حلقہ ستائش باہمی سے خارج کر چکے ہیں۔ ساحر لدھیانوی میں شاعری کا حسن ہے اور وہ نوجوانوں کے دل و دماغ کی سرکشی سے قریب ہو کر شعر کہتا رہا ہے لیکن اب وہ فلم ہی کا ہو کے رہ گیا ہے۔

کیفی اعظمی اشتراکی شاعری کی تحریک میں صرف ایک رضا کار ہے۔ سردار جعفری کو میں شاعر ماننے ہی سے انکار کرتا ہوں۔ سردار جعفری نے ترقی پسندوں کی رہنمائی کر کے انہیں وہی نقصان پہنچایا ہے جو روس میں بیریا کے ہاتھوں وہاں کے بیشتر سائنس دانوں، مفکروں، دانشوروں اور ہم سفروں کو پہنچا تھا۔

(شورش کاشمیری ایک مطالعہ ایک تجزیہ صفحہ ۱۳۹/ ۱۳۸)

آغا صاحب کی خدمات کو بیان کرتے ہوئے احقر نے گزشتہ صفحات میں نامور اہل قلم کے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر خیال امروہوی کے انتہائی خوبصورت تاثرات نقلکر

کے اس سلسلہ کا اختتام کیا جاتا ہے۔

۱۔ انہیں وہ سب کچھ پسند نہ تھا جو اوروں کو پسند تھا۔ وہ ایسی فلاحی مملکت کے خواہاں تھے جو آج تک پیدا نہ ہو سکی۔ وہ دین اسلام کے ساتھ وہ تمسخر برداشت نہیں کر سکتے تھے جو آج کرایا جا رہا ہے۔ وہ ایسے علم وادب کی ترویج کے قائل نہ تھے جس سے انسانی نسل بوذنہ تمثال بن جائے۔

وہ ایسی نسل کو یکسر مرفوع القلم دیکھنا چاہتے تھے جو اپنے اسلاف کی تہذیبی اقدار کا چوراہے پر نیلام کروادے، وہ ایسے تمام رہبروں کے لئے تازیانہ تادیب اور شلاق تہذیب تھے جن کا فلسفہ حیات ہی استحصال رہا۔ شورش کے تنقیدی دھارے کسی دور میں بھی بند نہیں ہو سکے۔ انکے عالمانہ اور تجزیاتی سوتے کبھی خشک نہیں ہوئے۔ وہ ایسے نقاد نہیں تھے جنہیں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور بن جانسن کو پڑھکر ان کے اصولوں کی روشنی میں کچھ لکھنے کی ضرورت ہو۔ وہ ڈرائڈن، پوپ اور شیلے کی کتابوں کا کیڑا نہیں تھے جو اپنا پس خوردہ عوام کو چٹواتے۔ وہ ہیگل، کارل مارکس، لینن اور اسٹالن کے اضدادی فلسفوں کے شیفتہ اور سرگشتہ نہیں تھے کہ انہیں کی روش کو عام کرتے، شورش تو فطرتی ناقد اور مبصر تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

حق بات بہر گام، بہر طور کئے جا — اس شان سے اے زادۂ توحید جئے جا
توحید سے بڑھکر کوئی شے خاص نہیں ہے — قرآں جو کہتا ہے اسے عام کئے جا
ہرگز نہ جھکے خواجہ کونین ﷺ کا پرچم — توحید کا پیغام زمانے کو دیئے جا
اسلام کے سینے میں کئی چاک پڑے ہیں — فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ چاک سیے جا

۲۔ حضرت شورش کاشمیری کی عبقریت اور نابغیت یہی تھی کہ مرحوم نے ابتدا ہی سے اپنی فکر کی اساس قرآنی شواہد پر رکھی اور تدریجاً ان کا مکتبہ فکر ہر، ان متعلقات کو اپنی گرفت میں لیتا چلا گیا جو مقبولیت سے مربوط تھے۔ وحدانیت کے بعد خواجہ گیہان ﷺ سے قلبی عشق، پھر اقبالیات سے گہرا شغف پھر ان تینوں عوامل سے مربوط دیگر موضوعات مثلاً سیاست مدن، تدبیر منزل، شعائر اسلامی اور پھر تحریکات اسلامی مثلاً احرار، نظریہ پاکستان، ابطال ملاحدہ، تنسیخ قادیانیت۔ غرضیکہ ترتیب کے اعتبار سے ان کی ذات ''مسلمان انجمن'' اور ان کی شخصیت اسلامی دبستان حیات بن کر رہ گئی تھی۔ یوں تو صدہا اسلامی مکتبے رائج رہے اور ہیں۔ لیکن شورش نے جس مکتبے کی بنیاد رکھی اس میں منقول اور معقول دونوں کا امتزاج موجود ہے۔ دوسروں کی طرح شورش کی ادبیات کے مطالعہ سے قاری کو ابکائی نہیں آتی، بلکہ شیفتگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ شیفتگی ان کی اپنی اختراع ہے۔ اس اعتبار سے شورش انتہا پسند کٹھ ملا نہیں تھے بلکہ وہ ملا شکن تھے۔ وہ اسلام کو ملغوبے کی شکل میں پیش نہیں کرتے

تھے بلکہ اسے اصلی روپ میں دیکھنے کے عادی تھے۔

۳۔ یہ مخصوص اسلوب شورش کی زندگی میں اور بعد اُبھی کسی نے اختیار کرنے کی جرات نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو فطری میلان اور طبع زاد وجدان شورش نے پایا تھا۔ وہ غالباً کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا اور نہ ہی کوئی دانشور شورش کے نقش قدم پر چل کر ان کا عکس بننے کو تیار ہو سکا۔ یہاں ناقدین یہ کہہ سکتے ہیں کہ سماج کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان عوامل کی ضرورت نہیں رہی۔ میرے خیال میں یہ عذر لنگ ہے۔ شورش کی تحریک ذاتی نہیں تھی، بلکہ کائناتی تھی۔ شورش نے اپنی زندگی میں بہت بڑے حلقے کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ اپنی تحریروں سے نئی نسل کو مکمل روشناس کراتے ہوئے مجتہد بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ مقام تاسف ہے کہ ہمارے ملک کے داخلی حالات نے نئی نسل کو مکمل طور پر قعر مذلت و جہالت میں گرا دیا۔ جہاں انہیں اپنے اسلاف تو کیا خود اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ لہذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

آں ساغر بشکست وآں ساقی نماند

شورش صرف تاریخ ہی نہیں تھے بلکہ تاریخ ساز تھے۔ انہوں نے آزادی فکر، صحافیانہ نقد و بصیرت، تحلیل و تجزیہ اور شعری ارقام کی زبردست تاریخ لکھی ہے اور وہ بار باران ''بے تاریخ'' افراد کی خبر لیتے رہے جو کچھ نہ ہونے کے باوجود اس ملک میں بہت کچھ بن چکے ہیں۔

۴۔ حقیقت یہ ہے کہ شورش جیسا طناز صحافی مشکل ہی سے پیدا ہوگا۔ اس کی موت کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قلم کی آبرو مر گئی، تحریر کا جنازہ نکل گیا، انداز بیاں اور انشاء کا چراغ گل ہو گیا۔ اب نہ کوئی للکارنے والا ہے اور نہ مردہ اذہان میں حرارت پیدا کرنے والا۔ اب نہ وہ نے رہی نہ نے نواز۔ نہ مضراب رہی نہ ساز و آواز۔ اب تو صرف زاغوں کے جھرمٹ ہیں اور کرگسانِ جہالت کے غول، اندھوں کی انجمن ہے اور گونگے بہروں کا گروہ۔ جو جی میں آتا ہے لکھتے ہیں اور جو سر میں سماتی ہے اگل دیتے ہیں۔ شورش کے بعد صحافت کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ شورش کے قلم کی کاٹ اب غالباً دوبارہ پیدا نہیں ہوگی۔ شورش سے پہلے کے نابغہ اہل قلم کی کونسی مثالیں پیدا ہو گئیں جو اب شورش کی تصویر پیدا ہوگی۔ اب ایسا جری شاعر و خطیب کب پیدا ہوگا جس کی آواز صور اسرافیل کا انداز لئے ہوئے تھی اور جس کی للکار سے خود ساختہ علماء کے دل دہل جایا کرتے تھے۔

اقبال اور شورش

آغا شورش کاشمیری کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ حضرت علامہ اقبال سے بے پناہ عقیدت و شیفتگی رکھتے تھے اور اقبالیات ان کا موضوع خاص تھا۔ اقبال سے ان کی محبت، فرزند اقبال، ڈاکٹر جاوید اقبال سے محبت و دوستانہ تعلقات کا سبب بنی۔ جیسا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال خود معترف ہیں۔

''شورش کی مجھ سے وابستگی کا اصل سبب علامہ تھے'' شورش اقبال کے عشاق میں سے تھے، اقبال کے کلام و پیام کے رمز آشنا اور ادا شناس تھے، اقبال کو اپنا مرشد سمجھتے تھے اور مجھ سے میری کوتاہیوں کے باوجود اس لئے محبت کرتے تھے کہ میں فرزندِ اقبال ہوں۔''

شورش اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے کلام اقبال کا ۹۰ فی صد حصہ زبانی یاد ہے'' ---- یہ امر اقبال سے شورش کی انتہائے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

آغا شورش کاشمیری مجلس احرار اسلام ہند کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اگرچہ انہیں کسی ادبی تعاون حاصل نہ تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اقبال پر کئی افراد کے برابر کام کیا۔ جس کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

☆ افکارِ اقبال کی ترویج و اشاعت کے لئے مجلس مرکزیہ اقبال قائم کی۔ اس کے تحت ہر سال یوم اقبال مناتے رہے۔ اور ان سالانہ تقریبات میں آغا صاحب کی تقریر، تقریب کی جان ہوا کرتی تھی جسے سننے کے لئے لاہور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان، وکلاء، ادباء و شعراء اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک کثیر تعداد موجود ہوتی تھی۔ اگر آغا صاحب اور اقبال کا کوئی شیدائی ان تقریبات کی روئیداد اور آغا صاحب کی تقاریر شائع کر دے تو یہ ملک و ملت اور علم و ادب کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

☆ ملک بھر کے مختلف حصوں میں یومِ اقبال کی سالانہ تقریبات سے خطاب آغا صاحب کا معمول رہا۔

☆ ''اقبال پیامبر انقلاب'' کے تحت مختلف اہل علم کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا، جس کی ابتداء میں خود ''اقبال ایک عہد، ایک تحریک'' کے زیر عنوان ایک وقیع مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ کتاب ہذا میں شامل کر دیا گیا ہے۔

☆ اقبالیات پر مشتمل کتب کا گہرا مطالعہ کر کے اقبال کے فرمودات کا انتخاب کیا۔ چٹان میں بھی

مختلف عنوانات سے یہ انتخاب بطور حاصل مطالعہ شائع ہوتا رہا۔ پھر فیضانِ اقبال کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ فیضانِ اقبال، اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے جسے کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

☆ آغا شورش اقبال اکیڈمیوں کی غیر مستند کتب کی اشاعت پر عمر بھر شاکی رہے۔ اور اقبال سے متعلق بہت سی کتب کا تنقیدی جائزہ لیتے رہے۔ پھر خود ہی تین کتابوں فکرِ اقبال، شعرِ اقبال اور ذکرِ اقبال کا تنقیدی جائزہ ''اقبالی مجرم'' کے زیر عنوان مرتب کر کے شائع کیا۔

☆ قادیانیت کے ارتدادی قلعہ پر حضرت علامہ نے جو ضرب کاری لگائی تھی، قادیانی اس کو کبھی بھول نہیں سکے۔ انہوں نے اپنے متعلق علامہ کی فکری مباحث کا جواب دینے کی بجائے ان پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا اور علامہ کی کردار کشی کی مہم چلائی۔ اس سلسلہ میں خود بھی اقبال کو محل نزاع بنانے، ان کی فکری عظمت کو گھٹانے اور ان کا شخصی مرتبہ کم کرنے کے لئے کتابیں لکھیں اور پس پردہ رہ کر دوسرے اہل قلم سے بھی لکھوائیں۔

علامہ اقبال کے خلاف اس قادیانی مہم کا سب سے پہلے آغا شورش نے جائزہ لیا، قادیانی مکر و فریب کے تار و پود بکھیرے، ان کی خانہ ساز روایات کا احتساب کیا۔ قادیانیوں کو اقبال کے خلاف ژاژ خائی پر اس بری طرح لتاڑا کہ قادیانی منہ چھپا کر رہ گئے۔

گزشتہ چند سالوں سے اقبال کے خلاف قادیانی مہم پھر تیز ہوگئی ہے۔ اس مہم کی سرکوبی کے لئے اقبالیات پر مہارت رکھنے والے حضرات کو پھر آغا شورش کے لب و لہجہ میں قادیانیوں سے گفتگو کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قادیانی اس خاص لب و لہجہ کے علاوہ دوسرے تحریری انداز کو اہمیت نہیں دیتے۔

کہ کبھی کبھی زہر بھی کرتا ہے کار تریاق

حق گوئی کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ انسان حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے لیکن آغا صاحب کی حق گوئی کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ وہ کبھی حکمرانوں کو للکارتے تھے تو کبھی سیاستدانوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ کبھی اپنے صحافتی بھائیوں کو روک ٹوک کرتے تھے تو کبھی ادبی دوستوں اور شاعروں کی اصلاح کرتے تھے۔

لرزاں ہیں میرے نام کی ہیبت سے کاسہ لیس
اربابِ اقتدار کا نوکر نہیں ہوں میں

مجھ کو رہا ہے فن خوشامد سے احتراز
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کا خوگر نہیں ہوں میں

(شورش)

آغا شورش کی حق گوئی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے علامہ اقبال کے نام پر قائم اداروں اور اقبالیات کے ماہرین کے زبانی جمع خرچ کی نشان دہی کی ان کے بلند بانگ دعاوی کی حقیقت آشکار کی۔

اقبال کے متعلق شائع ہونے والی کتب کا تنقیدی جائزہ لیا اور اپنی آراء کسی لگی لپٹی کے بغیر بیان کیں۔ یہ پروا بھی نہ کی کہ ان کی آراء متعلقہ افراد و اداروں کو ناگوار گزریں گی۔ زیر نظر مجموعہ میں شامل مضامین و شذرات، تمثیلات و منظومات سے آغا کی دردمندی اور کرب و اضطراب ہر ہر سطر میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال اور افکار اقبال دونوں ناقدرشناس لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

زاغوں کے تصرف میں ہیں عقابوں کے نشیمن

ماہرین اقبالیات کی مجموعی روش اور اقبال اکیڈمیوں کی کارکردگی کے حوالہ سے آغا شورش شاکی ہیں کہ:۔

۱ بعض لوگوں نے اقبال کو اپنی شہرت اور مفادات کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان کو اقبال سے زیادہ اپنے انفرادی و گروہی مفادات عزیز ہیں۔

۲ دور حاضر میں اقبال پر اکثر لکھنے والے اقبال فہمی سے عاری ہیں۔ انہیں علم ہی نہیں کہ افکار اقبال کی غرض و غایت کیا ہے؟

۳ اہل قلم کا ایک گروہ، اشتمالیت واشتراکیت کا دفاع کرتا ہے اور فکر اقبال کو اپنی تائید کے لئے توڑ موڑ کر پیش کرتا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال محض شاعر ہے۔ مفکر نہیں ہے۔

۴ اقبال پاکستان کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو کہ یونان کے لئے افلاطون وارسطو، فرانس کیلئے والٹیر اور روسو، جرمنی کے لئے گوئٹے اور نطشے، اور روس کے لئے مارکس اور ٹالسٹائی۔ قیام پاکستان کے بعد اقبال پر علمی ادارے قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ کراچی میں اقبال اکادمی اور لاہور میں بزم اقبال اور بعض دیگر ادارے بنائے گئے۔ لیکن ان کی کارکردگی، سالانہ دو چار اجلاسوں اور فکر اقبال سے عاری، مہمل بحثوں پر مشتمل کتب

کی تدوین و اشاعت سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

۵ جس اساس پر فکر اقبال کی عمارت کھڑی ہے، اس پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن پاکستان میں معاملہ برعکس ہے۔ یہاں جن لوگوں نے کلام اقبال پر ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ ان میں سے اکثر حقائق اسلامیہ سے بے بہرہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہت سی بنیادی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ لوگ قرآن سے نابلد ہیں، حدیث کا فہم نہیں، سیرت سے بیگانہ ہیں اور سنت کا انہیں شعور نہیں۔ اسلام کو جن داخلی فتنوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے مضمرات سے انہیں شناسائی نہیں، ان لوگوں نے اقبال کے مشن کو آگے نہیں بڑھایا بلکہ روکا ہوا ہے۔

۶ اقبال کا تدریجی مطالعہ کرنے سے ان کے دل و دماغ کی سرگزشت مخفی نہیں رہتی۔ ان کے فکر کا ارتقا ہی ان کے دل و دماغ کی سرگزشت ہے۔ لیکن اقبالیین میں سے ابھی تک کوئی صاحب یہ نہیں کر پائے کہ ان کی ذہنی سرگزشت مرتب کر لیں تا کہ مطالعہ اقبال کی راہیں واضح اور معین ہو جائیں۔ جو لوگ اقبال پر تضاد کا الزام لگاتے ہیں اصلاً وہ تضاد اور تنوع کے فرق کو نہیں سمجھتے اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہے کہ اقبال کی ذہنی سرگزشت شروع کہاں سے ہوئی اور ختم کہاں ہوتی ہے؟

۷ اقبال نے جس فکر و عمل سے روکا، وہی اقبالیین کا شعار ہو گیا۔ مثلاً قوالی کو اقبال نے طبع مشرق کے لئے افیون کہا لیکن سرکاری توشہ دانوں میں ذکر اقبال قوالی ہی سے شروع ہوتا ہے۔

۸ مطالعہ اقبال کی سہولت کے لئے فرہنگ کی تیاری ضروری ہے، جس میں ان کے موضوعات و مندرجات اور افکار و مطالب کی تشریحات و توضیحات کا پورا پورا علم ہو۔ لیکن اس طرف کوئی اقبالی توجہ کرنے کو تیار نہیں ہے۔

۹ اقبال نے ملا سے کہیں زیادہ مغربی تعلیم کے مشرقی فلسفوں پر تنقید کی ہے اور انہیں بے دین دانش مند کہا ہے۔ ان کے نزدیک مرگھٹ کا کوا ان سے بہتر ہے لیکن اقبال کے سرکاری شارحین نے کلام اقبال کا یہ حصہ ہی منسوخ کر دیا ہے۔ ان کے قلم گنگ ہیں کہ اقبال کے ہاں اہل مدرسہ کون تھے؟ کن لوگوں نے طلبہ کا گلا گھونٹا؟ کہ ان کی آوازیں لا الہ الا اللہ

سے محروم ہوگئی ہیں۔ شاہینوں کو خاکبازی کی تعلیم کون دے رہا ہے اور وہ کون لوگ ہیں جن سے مکتب مذبح ہو گئے ہیں۔

۱۰ علامہ اقبال قرنِ اول کے اسلام کی شخصیتوں پر تورطب اللسان تھے اور ان سے متعلق ان کے کلام میں کئی تلمیحات پائی جاتی ہیں لیکن بعض عصری شخصیتوں یا اپنے دور سے دو یا تین صدی پہلے کی شخصیتوں پر بھی ان کی نگاہ اٹھتی رہی ہے۔ کسی اقبالی نے حضرت مجدد الف ثانی ؒ کی تعلیمات پر کام نہیں کیا۔ شاہ ولی اللہؒ سے متعلق علامہ نے فرمایا کہ الٰہیات اسلامیہ کا ان کی ذات پر خاتمہ ہو گیا مگر اقبال کے دبستان میں ان سے متعلق کوئی صدا ہی نہیں۔ سید جمال الدین افغانی اور سید عبدالوہاب نجدی سے متعلق دانشورانِ اقبال مہر بلب ہیں۔ انہیں ''اقبال اور بابائے اردو'' تالیف کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن ان شخصیتوں سے متعلق ان کے ہاں ایک سطر بھی نہیں۔ حالانکہ اقبال نے انہیں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا مؤسس کہا ہے۔ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں جن موضوعات پر قلم اٹھانے کا سوچا' ان پر لکھنے کے لئے مضطرب رہے ان پر کسی اقبالی نے قلم نہیں اٹھایا۔ جو لوگ خود کو اقبالیات پر اتھارٹی سمجھتے ہیں انہوں نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا کہ علامہ اپنی فکر کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے؟ انہیں دادِ تحقیق دینے کے لئے ''اقبال و حیدر آباد''، ''اقبال و بھوپال'' اور ''عطیہ فیضی کے خطوط'' اہم موضوعات محسوس ہوئے۔

علامہ اقبال اپنے آخری دور میں جن موضوعات پر کام کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

(۱) Islam as I understood (اسلام جیسا کہ میں نے سمجھا) ایک دوسری جگہ اس کا نام Introduction to the study of Islam (تعارف مطالعہ اسلام) لکھا ہے۔

(۲) حضرت علامہ، نطشے کی مشہور کتاب Thus Shoke Larathnese ''بہ قول زردشت'' کے طرز پر بعض طبعی اور مابعد الطبیعی حقائق و معارف پر The book on unknown-Prophet. کے نام سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔

(۳) اقبال مستشرقین کے متعلق نپی تلی رائے رکھتے تھے کہ ہر مستشرق کا علم و فضل وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو مغرب کے استعمار اور اس کی شہنشاہیت (سامراج) کے مطابق ہو۔ وہ ان

مستشرقین کو استعمار پسندوں اور سیاست کاروں کا دست و بازو تصور کرتے تھے (مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی صفحہ ۹۷)

کسی اقبالی نے کبھی مستشرقین کی اس ذہنیت کا جائزہ نہیں لیا بلکہ الٹا ان سے مرعوب ہیں۔

(۴) علامہ نے قادیانیت کے متعلق جو فاضلانہ مقالات حوالہ قلم کئے ان میں کئی ایک کتابوں کے تجویزی خاکے ہیں لیکن ان پر کسی اجارہ دار اقبال نے توجہ نہیں کی مثلاً مسئلہ جہاد سے متعلق اقبال چاہتے تھے کہ اس بارے میں تاریخ مرتب کی جائے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد کن عناصر نے شرعی و الہامی حیلوں سے انگریزوں کی وفاداری کا جواز پیدا کیا۔

(۵) علامہ، بانی مرزائیت مرزا غلام احمد قادیانی کے نفسیاتی مطالعہ کی خواہش رکھتے تھے اور اس کے لئے مرزا کے الہامات کے مجموعہ ''منظور الٰہی'' کو انتہائی مفید خیال کرتے تھے۔ لیکن کوئی اقبالی اس طرف متوجہ ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔

(۶) علامہ اقبالؒ، شعرائے عجم کے ان تصورات کی تاریخ و تجزیہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ جن تصورات کے تحت شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی گئی لیکن ان شعراء کے کلام کی دلفریبی کا سحر اپنے اندرونی زہر کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اور اس کی ملی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن کسی دانشور اقبال کو اس کی توفیق نہیں ہوئی۔

(۷) اقبال نے مروجہ تصوف پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس کا تجزیہ کرنے اور تاریخ لکھنے کے آرزومند تھے۔ ایک حصہ لکھا بھی تھا لیکن نامکمل رہا۔ لیکن ان کی رحلت کو تیس سال ہو چکے ہیں کسی نے اس پر غور نہیں کیا۔ کوئی سلیمان ندویؒ نہیں جو اس شبلی کا سچا جانشین ہو۔

(۸) عربی اور عجمی اسلام کا موازنہ اور اس کے مضمرات پر محاکمہ جو عجمی اسلام کی بدولت برعظیم کے مسلمانوں کو پیش آئے ہیں۔

(۹) زمان کی حقیقت فلسفہ اسلام کی تاریخ میں۔

(۱۰) جدید علم الکلام کی تاریخ و ضرورت۔

(۱۱) برعظیم کے مسلمانوں کی ادبی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی تحریکوں کا جائزہ اور اس کے مثبت و منفی پہلو۔

(۱۲) اصول قانون کی روشنی میں شریعت اسلامیہ کی صداقتوں کا انضباط، تصدیق اور تفسیر جس سے احکام قرآنی کی ابدیت معلوم ہو۔

(۱۳) مشرق ومغرب کی کش مکش، دونوں کا تضاد، اس تضاد کے آثار ونتائج۔

(۱۴) وطنیت اور قومیت کے نظریوں کا ظہور وفتور، یورپی اقوام کے تصادمات اور ایشیائی اقوام کے تضادات۔

(۱۵) مسلمانوں کے سیاسی زوال کے فکری اسباب۔

یہ فہرست حتمی اور مکمل نہیں ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ کتنے اقبالیوں نے اقبال کے مطلوبہ ان موضوعات کی طرف توجہ کی ہے اور کتنی کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں؟

شورش عمر بھر مضطرب رہے کہ اقبال پر کام کرنے والے افراد اور ادارے، افکار اقبال کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں، پیامِ اقبال کو بے روح اور تعلیمات کو بے جان کر رہے ہیں۔ اقبال کے نام پر اقربا پروری اور دوست نوازی کا سلسلہ جاری ہے۔ اکیڈمیاں اقبال پر معیاری کتب کم اور غیر معیاری زیادہ شائع کر رہی ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ کلامِ اقبال کے شارحین، افکار اقبال کی تشریح وتعبیر اس انداز میں کر رہے ہیں کہ توثیق سے تنسیخ اور اقرار سے انکار کا پہلو ہو رہا ہے۔ یہ شارحین، اقبال کی سوانح کے سلسلہ میں صاحب سوانح کی اپنے متعلق تحریروں پر انحصار نہیں کرتے بلکہ غیر ثقہ راویوں پر دارومدار رکھتے ہیں، قیاسی باتیں اور مصنوعی روایتیں درج کرتے ہیں۔

یہ شارحین ان محرکات واساسات ہی سے قطع نظر کرتے ہیں جو افکارِ اقبال کی روح ہیں۔ دوم جن خیالات کا اظہار اپنی خواہش پر کیا ہے ان کا غالب حصہ اقبال کی نفی پر ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری، خطبات اور خطوط میں جو کچھ لکھا ہے اس میں رنگارنگی، اور یکسانی ہے۔ تضاد ان لوگوں کے ذہنی رویہ میں ہے جو اقبال کی شاعری پر قلم اٹھاتے ہیں لیکن ان کے نثری افکار تک نہیں پہنچتے۔ نتیجۃً بعض جگہ شدید ٹھوکریں کھائی ہیں۔

اقبال کے حوالہ سے آغا صاحب کے ذہنی اضطراب کی اجمالی کیفیت احقر نے بیان کر دی ہے۔ زیر نظر کتاب بجائے خود ایک تفصیل ہے۔ جس کے ہر مضمون سے آغا شورش کا درد دل جھلکتا ہے۔

اظہارِ تشکر

اس کتاب کی تالیف وترتیب اور نشر واشاعت کے مراحل میں درج ذیل بزرگوں اور دوستوں نے تعاون کیا ہے۔

☆ اخی فی اللہ، مخدومی، نواسہ امیر شریعتؒ، سید محمد کفیل شاہ صاحب بخاری مدظلہ ملتان، ان کی تحریک پر اس تالیف کا کام شروع کیا اور ان کے دامے، درہمے، قدمے، سخنے تعاون سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ انہوں نے تقریظات کے حصول میں تعاون کر کے مزید کرم فرمائی کی۔

☆ مخدوم گرامی، مجاہد ختم نبوت حضرت مولانا اللہ وسایا مدظلہ۔ انہوں نے چٹان کے حصول میں بے لوث تعاون کیا اور حتی الامکان حوصلہ افزائی کی۔

☆ ہر دو حضرات کے معاونین (بالترتیب) جناب محمد الیاس میراں پوری اور ماسٹر عزیز الرحمن صاحب۔ ان دونوں دوستوں نے فوٹو کاپی کے مراحل میں برادرانہ مدد کی۔

☆ ماہر شورشیات، ادیب شہیر جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری مدظلہ، سید محمد یونس بخاری مدظلہ اور محترم القام پروفیسر محمد اقبال جاوید صاحب۔ ان تینوں حضرات نے اجنبیت کے باوجود، احقر کی التماس پر گراں قدر تقریظوں سے نوازا۔

☆ سید محمد اسلم خلیق اور سید آفتاب عالم اور ان کے رفقاء۔ جنہوں نے کتاب کی کمپوزنگ کے کٹھن مراحل میں معاونت کی۔

☆ محترم جناب پروفیسر اشفاق ناصر صاحب، محترم جناب پروفیسر خالد شبیر احمد صاحب و برادرم ملک مختار احمد صاحب ایم اے، ایل ایل بی۔ تینوں بزرگوں نے کتاب کی نوک پلک سنوارنے اور مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں قیمتی مشوروں سے نوازا۔

☆ مجموعی طور پر ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے کسی بھی اعتبار سے اس تالیف کی تدوین واشاعت میں تعاون کیا اور احقر ان کے نام لکھنے سے قاصر رہا۔

اللہ جل شانہ ان تمام مہربانوں کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔ صحت وعافیت اور ہر قسم کی سعادتوں اور برکتوں سے نوازیں۔ آمین!

مشتاق احمد، 28 جون 2003ء

جامعہ عربیہ، پوسٹ بکس نمبر 25، چنیوٹ

پہلا باب: اداریے اور شذرے

☆ اقبال کے بزدل نقاد

☆ اقبال فروشی

☆ سب آشنا ہیں یہاں، ایک میں ہوں بیگانہ

☆ غلط روایتیں

☆ جعلی پیر، کھوٹے ملا، نقلی واعظ، جھوٹے منجم

☆ شرم تم کو مگر نہیں آتی

☆ اقبال کے نام پر مذاق

☆ اقبال کے نام پر نقب زنی

☆ علامہ اقبال پر فلم

☆ غیرت سے دست برداری

☆ خطا معاف

☆ شرم کی بات

☆ اقبال کے نام پر رقص

☆ اقبال فروشی

☆ مزار اقبال کی توسیع

☆ اقبال کی عظمت

☆ اقبال کے پیرو

☆ افکار اقبال سے متعلق ایک سوال

اقبال کے بزدل نقاد

صدر مملکت نے پرانے آئین کی سلبی اور جمہوری اداروں پر خطِ تنسیخ کے بعد جب بھی اس مسند پر گفتگو کی ہے۔ کہا ہے کہ ہم اپنے خصوصی حالات اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں جمہوریت کا ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے قوم کی ذہنی نشوونما اور ملکی دستور کی ترتیب و تنظیم کا ایک نیا خاکہ ہے۔ ہم اپنے حالات سے بالا ہو کر کوئی ایسا تجربہ نہیں کرنا چاہتے جس سے ملک وقوم کے استحکام کو نقصان پہنچے۔ بالفاظِ دیگر ہم وہ ہی کرنا چاہتے ہیں، جسے ہماری قوم کی دماغی قوت ہاضمہ قبول کر سکتی ہو، اور وہ ان لوگوں کی دستبرد سے محفوظ رہے جنہوں نے ماضی میں اسے اپنی سیاسی معصیتوں کی جولان گاہ بنائے رکھا ہے۔" یہ گویا صدرِ مملکت کے افکار کا افشردہ ہے۔ ایک دفعہ ان سے تقریر و تحریر کی آزادی کے بارے میں سوال کیا گیا۔ فرمایا کہ وہ اس مرحلے میں اس کے حق میں نہیں، کیونکہ ہم ایک تعمیری مقصد میں لگے ہوئے ہیں، اگر اہم ملی مسائل پر اس کو فوقیت دی گئی تو یہ خرابی کا باعث ہوگا۔"

یہ بھی سیاسی اداروں کی بحالی تحریر و تقریر کی آزادی اور جلسہ و جلوس سے متعلق سوالات کے جواب کی تلخیص ہے۔ اسی طرح صدر نے بارہا فرمایا کہ وہ سب کچھ گوارا کر سکتے ہیں۔ لیکن قوم و ملک کے مستقبل اور اس کی آزادی کو کسی صورت میں بھی خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں۔ مارشل لاء کی طوالت کے بارے میں بھی ان کا یہی ارشاد ہے، چنانچہ یہی وہ مقصد رفیع ہے جس کی بدولت نہ صرف سیاستدانوں کی ساری کھیپ کو گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہے (سیاسی اعمال کی بوقلمونیوں کے کڑوے پھل) بلکہ عوام بھی ان کے چکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک نوزائیدہ مملکت کی مہمات کار کا دائرہ کار نہائت ہی سنگین اور حد درجہ وسیع ہوتا ہے۔ پھر پاکستان نتیجہ ہے خاص قسم کے نظریات اور تصورات کا۔ جب تک یہ چیزیں باقی رہیں گی۔ اس وقت تک پاکستان کا وجود ہر خطرے اور خدشے سے محفوظ رہے گا۔ اگر اس نظریئے اور اس تصور ہی کو اپنی جگہ سے ہلا دیا جائے اور ان کی جگہ بعض دوسرے نظریات کو راہ دی جائے تو ظاہر ہے کہ دماغ بدل جانے سے جسم بدل جاتے ہیں۔ ایک قوم یا ملک اسی وقت تک پنپ سکتے ہیں، جب تک وہ اپنی آئیڈیالوجی اور اپنی خودی سے رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ جب یہ تصور اور یہ خودی جھٹکا کھانے لگتی ہے حتیٰ کہ ان کی دیوار کے بیٹھ جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، تو پھر فکری موت کا نتیجہ ملی موت ہوتا ہے۔

اب اس باب میں دو رائیں نہیں ہیں کہ اقبال اس صدی میں ہمارے فکری محسن تھے۔ انہوں نے نہ صرف پاکستان کا تصور مہیا کیا بلکہ ملی انا کو پرورش کیا، وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے بہت بڑے داعی تھے۔ وہ مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ یاد دلا دلا کر ایک ایسے اسلامی وفاق کی بنیاد رکھنے کے متمنی تھے، جہاں اسلام کو اپنی صحیح تعلیمات کے تحت جہانِ نو پیدا کرنے کا موقع مل سکے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی فکر کے شب و روز بسر کئے، وہ خود کہتے ہیں ؎

اسی کش مکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے مادی اور دماغی حکما، جنہیں یورپ نے پیدا کیا، ان کے نقد و نظر کی زد سے نہ بچ سکے، اور انہوں نے ان کے افکار و خیالات پر اس عظمت کے ساتھ تبصرہ کیا کہ ان کے خفی و جلی پہلو نکھر کر سامنے آ گئے۔ اقبال کا یہ جرم ایسا ہے کہ ایک خاص جماعت نے جو کمیونزم کی معاشی اور جنسی دلکشیوں پر فریفتہ ہے، اقبال کو اپنے لئے خطرہ محسوس کیا، اور جب ان پر یہ امر فاش ہو گیا کہ پاکستان کی نئی پود میں اقبال ان کے ذہنی راستہ کی سب سے بڑی روک ہے، تو اس جماعت نے اقبال پر تدریجی حملے کئے۔ ادھر اقبال کی ذہنی گرفت بڑھتی گئی۔ کیونکہ نہ صرف اقبال کے راز دان پیدا ہوتے چلے گئے، بلکہ اقبال کے کلام کی شرح و تفسیر مایہ ناز عالموں کے ہاتھوں ہونے لگی، جس سے اقبال کی عظمت کا نقش اور گہرا ہو گیا۔ آج بھی جب ہندوستان کی آب و ہوا مسلمانوں کے لئے ساز گار نہیں۔ علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اس قسم کے اساتذہ موجود ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اقبال کی ذہنی جد و جہد کو عام کرنے کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ مگر اقبال کے بیری (کمیونسٹ اور ان کے ادبی ہمزلف) اس سے خوف زدہ ہیں، کیونکہ وہ ہندوستان میں عام ہے، ان کا سارا ''زور'' پاکستان میں صرف ہو رہا ہے۔ ان کی (Cell meetings) میں یہ بات طے ہوتی رہی، کہ جس تیزی سے اقبال کا چرچا ہو رہا ہے، اسی شدت سے وہ اقبال کو نوجوانوں کے ناپختہ ذہن میں سے نکالیں، چنانچہ اس غرض سے انہوں نے ایک پلان تیار کیا، اور اب موقع و محل کی مناسبت سے اقبال کو سبوتاژ کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی بعض تدبیریں ہمارے سامنے ہیں، بعض تیاری کے مرحلے میں ہیں، اور کئی قسم کے منصوبے ان کے نہاں خانہ دماغ میں محفوظ اسلحہ کے طور پر پڑی ہیں۔ ان لوگوں کا ابتدائی حملہ یہ تھا کہ

اقبال صرف شاعر تھا، اسی کو عام کیا جائے، باقی ان کے عقیدت مند تکلف

کرتے ہیں، چنانچہ ان کی شاعرانہ نظموں ہی کو اجاگر کیا جاتا رہا۔

دوسرے حملہ میں انہوں نے یہ کیا تھا کہ اقبال کی شخصیت کو مدھم کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے پے در پے نہ صرف اس قسم کے مضمون لکھے، بلکہ ادبی مجلسوں اور طلبا کی جماعتوں میں ''درس'' دینے شروع کئے کہ اقبال پیغمبر نہیں، کہ اس پر تنقید نہ کی جائے، حالانکہ کسی نے ان کی پیغمبری کا کبھی اعلان نہیں کیا۔ چنانچہ ''تنقید'' کے نام تنقیص شروع ہو گئی۔ اور مخالفین اقبال کے اس ریوڑ نے یہ کہنا شروع کیا کہ اقبال کی ذاتی زندگی میں فلاں فلاں رخنہ تھا۔

اقبال نے جو کچھ حاصل کیا وہ فلاں یورپی مصنف و مفکر کا سرقہ ہے، اور یہ ہمیشہ بغیر ثبوت و دلیل کے کہا گیا۔ بالآخر سبوتاژ کی یہ مہم ایک خطرناک موڑ پر آ گئی، کئی حلقے وضع ہو گئے، ایک طائفہ اخبار نویسوں میں اقبال پر ''کرم فرمائی'' کرنے لگا۔ ایک ادیبوں میں گلفشانی پر تل گیا۔ ایک نے شاعروں کے روپ میں نکتہ چینی کی داغ بیل رکھی، کچھ نقاد شپرہ چشم ہو گئے۔ ایک محدود گروہ نے کالجوں میں ڈیرا ڈالا۔ غرض ہم اس مہم کے بوٹے بوٹے اور پتے پتے سے آگاہ ہیں مگر یہ پودا ناپختہ نوجوانوں کے ذہنی خون سے سینچا جاتا رہا۔ یہاں ایم۔ اے۔ اردو میں اقبال کے فکر و فن پر ایک پرچہ ہے۔ السنہ شرقیہ کی سب سے بڑی سرکاری درسگاہ اورئینٹیل کالج میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک لیکچرار شری محی الدین آثر اس کے ''استاد'' ہیں۔ انہوں نے اپنی بوقلموں شہرتوں کے باوجود یہ شیوہ بنا لیا تھا کہ ''اقبال پڑھانے'' کے بجائے ''اقبال گھٹانے'' کا شغل فرمائیں اور تنقید کا نام لیکر تنقیص کریں۔ ہم نے ایک سال پیشتر انہیں ٹوکا تھا۔ ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ آئندہ وہ اس روش سے پرہیز کریں گے۔ ہم نے قلم روک لیا مگر ان کی زبان نہ رکی۔ ہمیں یہاں تک بتایا گیا ہے کہ اس سال جب ان سے یہ پرچہ واپس لیا گیا تو وہ دو ماہ تک روٹھے رہے، اور انہوں نے اصرار کیا کہ وہ اقبال ہی پڑھائیں گے چنانچہ فیصلہ کنندگان سپر انداز ہو گئے۔ ہم اس ضد کے منبع سے بھی واقف ہیں۔ بہر حال انہوں نے پہلے ہی دن طلبہ کو یہ دیا کھیان دیا کہ ''تم نے اقبال کے بارے میں جو صنم خانے اپنے ذہنوں میں بنا رکھے ہیں انہیں توڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ'' ۔۔۔۔

اور پھر وہ ''بت شکنی'' میں منہمک ہو گئے۔ آخر یہ کہانی نوائے وقت جیسے موقر ملی روزنامے میں پہنچی۔ اس کے تقریباً تین کالموں میں یہ روداد چھپی ہے۔ اگلے روز نوائے وقت نے ایک مؤثر شذرہ میں مطالبہ کیا کہ گورنر مغربی پاکستان اور سیکرٹری ایجوکیشن احتساب فرمائیں۔ ۹ فروری کے نوائے وقت میں بھی فاضل ایڈیٹر نے لیکچرار مذکور کے خط و خال پر لطیف سا اشارہ کرتے ہوئے اپنے مطالبہ کا اعادہ کیا ہے۔

ہم اس مطالبے میں معاصر مذکور کے سوفی صد ہمنوا ہیں۔ بلکہ اب ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ پاکستان کے جسمانی وجود کو بچانے کے لیے اگر سارے ملک کا دستور معطل ہوسکتا ہے۔ مارشل لاء کی عمر یہاں تک پہنچ سکتی ہے اور انتظامیہ وعدلیہ کو صاف کرنے کے لئے بڑے بڑے افسروں کو سبکدوش کیا جاسکتا ہے۔ پھر ہائی کورٹ کے ایک جج کو تحقیق وتفتیش کے بعد اس کے اعلیٰ منصب سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ تو ملت اسلامیہ کے ذہنی وجود کے بچانے کے لئے ان پروفیسروں، لیکچروں اور ٹیچروں کی سکریننگ بھی ضروری ہے جو اخلاقی طور پر اپاہج، اسلامی طور پر ابولہب اور بالواسطہ یا بلاواسطہ کمیونزم کے گماشتے یعنی مارکس ولینن کے فرزند معنوی ہیں۔

شوخی باطل نگر اندر کمین حق نشست
شپر از کوری شب خونی زند بر آفتاب

انقلاب .... انقلاب

انقلاب

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۳ فروری ۱۹۶۱ء)

اقبال فروشی

اقبال کے بارے میں قارئین ہمارے خیالات سے کاملاً آگاہ ہیں، اس صدی میں اس مرتبہ وعظمت کا ذہنی محسن مسلمانوں نے شاید ہی پیدا کیا ہو؟ لیکن ہمارے ہاں اقبال کے بارے میں جو کچھ چھاپا جارہا ہے۔ اس سارے مواد کا بیشتر حصہ اس قابل ہے کہ اس کو تپتی ہوئی انگیٹھی میں رکھ کر جلادیا جائے۔۔۔۔۔۔ کئی لوگوں نے اقبال کے نام پر اپنے دوستوں کو خشکہ کھلانے کے لیے سرکاری امداد کے اسراف کی راہیں پیدا کی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح اقبال کا چرچا تو ہورہا ہے۔ لیکن اس چرچے کی آڑ میں بعض لوگوں نے اپنا چرچا کرنا شروع کررکھا ہے۔

خطرناک پہلو یہ ہے کہ اقبال کے افکار مختلف الذہن لوگوں کے تھے چڑھ گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ مثلاً

☆ ایک گروہ بذلتہ اس فکر کا مبلغ ومعلم ہے۔ (عملاً) جس فکر کے یورپی نگارخانے پر اقبال عمر بھر حملہ آور رہا۔ مگر اقبال کا نام لیکر وہ دین اور اس کی تہذیب کو مجروح ومعدوم کرنے کے درپے ہے۔

☆ ایک افسوسناک پہلو یہ ہے۔ کہ اقبال کا دینی طبقے اور دینی روایات کا حراج ثابت کیا جارہا ہے۔ مسٹر غلام احمد پرویز اور ''اقبال اور ملا'' کے مرحوم مصنف اس ذہن کے سرخیل تھے۔ موخر الذکر نے ''اقبال اور ملا''، ملک غلام احمد مرحوم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لکھی تھی، بعد میں اسکندر مرزا نے اس پر صاد کیا۔۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتابیں اقبال کا صحیح عکس پیش نہیں کرتیں، بلکہ اقبال کے مقام ومرتبہ کی نفی کرتی ہیں۔

فکر اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ افرنگ کی علمی قیادت کو چیلنج کرتے ہیں۔ اقبال کے نام لیواؤں کی کھیپ کا منتہیٰ یہ ہے کہ وہ اس طرف آتے ہی نہیں۔ اس متاع کو گم کرکے اس کی جگہ بعید از جہد عقلی مباحث کے تانے بانے بنتے ہیں۔ سیاسی طور پر بھی اقبال کے نام کو استحصال کی زد میں رکھا جارہا ہے۔ اور اس کے کرتا دھرتا بھی کچھ مخصوص لوگ ہیں۔۔۔۔۔۔ جب تک ماضی سے حال تک ان خود فروش اقبالیوں کا پردہ چاک نہ کیا جائے گا، اور لوگوں کو معلوم نہ ہوگا، کہ اقبال کی اصل تعلیمات کا ملخص کیا ہے۔ اس وقت تک حقیقتیں پردۂ اخفا میں رہیں گی۔ اور اقبال کے نام پر اس قسم کے لوگ معروف وممتاز ہونے کی کوشش کریں گے، جو اقبال سے وابستگی کے بغیر مرجائیں تو شاید دوسرے دن انہیں یاد کرنے والا بھی کوئی نہ ہو؟

(ہفت روزہ چٹان۔ ۵ جون ۱۹۶۱ء)

سب آشنا ہیں یہاں ایک میں ہوں بیگانہ۔۔۔۔ (اقبال)

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ لاہور سنٹرل جیل کے نیررسٹ وارڈ میں انقلابی نوجوانوں کے علاوہ پنجاب اور دہلی کے بعض سرکردہ راہنما بھی قید و بند کے دن گزار رہے تھے۔ بمبئی کے مسٹر یوسف مہر علی (مرحوم) بھی یہیں قید تھے۔ احباب سے ملنے کے لیے پنجاب آئے تھے۔ صوبہ کی گورنمنٹ نے نکل جانے کا حکم دیدیا، نہ مانے اور چھ ماہ کے لئے قید ہوگئے، ان کا کمرہ (Cell) سنجیدہ قسم کے نوجوانوں کا حجرہ بحث و نظر تھا۔ گئی رات تک مختلف مضامین پر بحث ہوتی رہتی۔ راقم الحروف کے منٹگمری سنٹرل جیل سے منتقل ہو کر لاہور آنے پر ان مباحث میں اقبال اور اس کے فکر کے موضوعات کا اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ بحث و نظر کا یہ سلسلہ کئی کئی دن رہتا۔ گو ان نوجوانوں کو اقبال کے بعض نظریات سے اتفاق نہ تھا، اور اس کے وجوہ بھی تھے۔ مگر وہ مختلف الخیال اور مختلف المذاہب ہونے کے باوجود اقبال کی عظمت و پیام کے دل و جان سے قائل تھے۔ بلکہ ان پر فریفتہ تھے۔ راقم کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی، کہ ان انقلابی نوجوانوں میں سے تقریباً سبھی کے پاس کلام اقبال کے مختلف مجموعے تھے، اور وہ کبھی کبھار بعض منتخبات کو بڑے آہنگ سے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن راقم الحروف سے فدا کار حریت سردار بھگت سنگھ کے بھائی سردار کلبیر سنگھ نے ذکر کیا کہ انہوں نے کلام اقبال کا اردو حصہ بڑے غور و خوض سے پڑھا اور اس کے ایک ایک حرف پر دقت نظر سے سوچا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس قوم کے پاس اقبال ہو، وہ اس طرح بے ہمت رہے۔ راقم نے ان کا "مذاق" کہا کہ کیا آپ بے ہمت ہیں؟ بلکہ تھوڑی دیر کے لئے کسر نفسی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عرض کیا کہ راقم الحروف بھی تو آخر اسی قوم کا فرزند ہے۔ آپ نے مجھ میں کیا بے ہمتی دیکھی ہے؟ کلبیر بڑے ہی کھرے نوجوان تھے۔ کہنے لگے کہ میں ایک اجتماعی بات کر رہا ہوں، اقبال نے اپنے لئے مسلمانوں کی جماعت منتخب کی ہے۔ اور وہ انہیں اپنی دعوت کا مرجع و مرکز سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے، کہ مسلمانوں میں وہ خصائص کیوں پیدا نہیں ہوتے، جس سے اقبال کا کلام لبریز ہے، اور جس کے لئے وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا یقین و اعتماد کے ساتھ بار بار اعلان کرتے ہیں۔ مثلاً

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
اگر نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کلبیر کی ان باتوں سے راقم الحروف کا ذہن فوراً ہی ایک دوسرے انقلابی شیر جنگ کی طرف پھر گیا جس نے ایک دفعہ ملتان سنٹرل جیل میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے سوال کیا تھا، میں قرآن مجید پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کتاب میں یہ تو موجود ہے، کہ مسلمان آزاد رہ کر کیوں کر زندگی بسر کریں؟ لیکن یہ موجود نہیں کہ غلام ہوں تو کیونکر رہیں؟ گویا غلامی کا ادارہ یا معاشرہ ہی قرآن مجید میں سرے سے موجود نہیں ہے۔ پھر یہ کتاب اتنی ولولہ انگیز اور حرارت خیز ہے کہ قرآن پڑھنے کے بعد غلام رہنے کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کا مسلمان اور غلامی کا انسان اجتماع ضدین ہے۔۔۔۔ شاہ جی کہا کرتے تھے، کہ میں نے شیر جنگ کو مطمئن کرنے کی بہتیری کوشش کی، مگر جواب کیا ہوتا۔ کسی طرح انہیں مطمئن نہ کر سکا۔۔۔۔

ایک ایسا ہی کلمہ حضرت سید انور شاہ نور اللہ مرقدہ نے بھی ایک بڑے ہندو راہنما کے بارے میں کہا تھا کہ ہم سچے مسلمان ہوتے تو اس شخص کے اندر سچائی کو قبول کرنے کا اتنا جوہر موجود ہے کہ یہ مسلمان ہو چکا ہوتا لیکن ہماری بداعمالیوں نے اس کی فکر کو اس رخ پر آنے ہی نہیں دیا ہے۔

اقبال نے جو کچھ کہا، جس مقام سے کہا، اور جس جس ادا سے کہا، وہ اتنا عظیم اور اتنا ارفع ہے کہ ہماری پستیاں اور ویرانیاں اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتی ہیں۔ اقبال خود کہتا ہے کہ اے رب العالمین! میری ساری کائنات فکر کا انحصار تیرے ارشادات پر ہے اور رسول اللہ (فداہ امی وابی) سے دعا کرتا ہے کہ میرا کارخانہ خیال اگر تیرے آفتاب فکر کی روشنی سے محروم ہے اور میں نے تیرے سوا کسی اور طرف تاکا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کائنات کو میرے وجود سے پاک کر دے، بلکہ روز محشر مجھے اپنے دیدار سے بھی محروم رکھ، اور نہ اپنے قدوم پاک کا بوسہ دینے کی سعادت بخش، کیونکہ ایک دریوزہ گر غیر کو اس کا حق ہی نہیں پہنچتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اقبال کو وقتی ضرورتوں کے تحت ایک قومی شاعر کی حیثیت سے منتخب کر رکھا ہے۔ ورنہ ہمیں اس کے پیغام اور ان کے خیالات سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ ہم اس کے اہل ہیں کہ ہم اس کے خطوط فکر کو سمجھ سکیں۔ واقعی امر یہ ہے کہ، کہ ہم میں جو اونچا طبقہ ہے، وہ اقبال کو سرے سے سمجھتا ہی نہیں اور یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہی جا رہی ہے۔ اس کا تجزیہ اور مشاہدہ موجود ہے، جو لوگ باقی رہ جاتے ہیں، ان میں بھی ننانوے فی صد اقبال کو جذباتی معیشت سے مانتے یا جانتے ہیں، جن مٹھی بھر لوگوں کو اقبال کا شعور ہے۔ ان کی اکثریت علم کی سنجیدگی سے زیادہ سیاست کی شوراشوری کے قریب ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اقبال پر۔۔۔۔ ہمارے ہاں۔۔۔۔ قلم اٹھایا ہے، وہ یا تو اپنے علم کی فرومایگی کے باعث اقبال کے فہم سے عاری ہیں۔ اور یا ان کی مصلحتوں کا کاروبار اتنا وسیع ہے کہ وہ اقبال کو ایک مخصوص فکر سے باہر لانے اور لوگوں

کے ذہن میں اس کا نقش بٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں ان کا اپنا وجود ننگا ہو جاتا ہے اور عریاں تصویر کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔

اقبال اس عہد، اس معاشرے، اس تہذیب، اس تمدن، اس کلچر، اس ثقافت، اس تعلیم، اس نظام اور اس سیاست، غرضیکہ اس ساری کائنات کے خلاف ایک زبردست آواز ہے۔ لیکن یہ بات ہمیں اعتراف جرم کے طور پر تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہم اقبال کو اسی حد تک ماننے کے لیے تیار ہیں جس حد تک کہ وہ ہماری قومی علامتوں میں رونق پیدا کرتا ہے ورنہ جو کہتا ہے، ہم اس کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنا کہ فکر اقبال کے کسی اور مخالف سے توقع کی جاسکتی ہے یا جس کا گلہ کیا جاسکتا ہے۔

(ہفت روزہ چٹان ۲۳۔ اپریل ۱۹۶۲ء)

غلط روائتیں ۔۔۔۔۔۔۔ایک لحظ کے لئے سوچیے

ہمارے ہاں بعض غلط روائتیں رچ بچ گئی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم اپنی آزادی کو سنبھال نہیں سکے۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم نے اپنے آپ کو آزادی کا اہل ثابت نہیں کیا، بلکہ ہماری آزادی اگر محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یا ہم بنیادی حقوق کیلئے ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں تو اس کی وجہ خود ہمارے سیاسی اللے تللے ہیں۔ ہم نے نعرہ بازی کو سیاسی زندگی کی اصل سمجھا، اور نعرہ بازی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے ابھی تک اپنے اندر قومیت یا وطنیت کا احساس پیدا نہیں کیا، ہم ایک ایسے اسلام سے چمٹے ہوئے ہیں جو واقعۃً اسلام نہیں، لیکن ہم اسی کو اسلام سمجھتے ہیں۔

چنانچہ یہ بات علی وجہ البصیرت کہی جاسکتی ہے کہ جتنا نقصان اسلام کو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر منبر و محراب پر وعظ کرنے والوں نے پہنچایا ہے اتنا اس جماعت نے اسلام کو مجروح نہیں کیا، جو خانقاہ و مدرسہ کے بیوپار سے باہر ہے اور سیدھے سادھے مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ علماء کی اکثریت دوکانداریوں کا شکار ہے۔ یہ لوگ قرآن و سنت کے تاجر ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں، جن کی ذاتی زندگیاں تقویٰ و دیانت کا پیکر ہیں۔ لیکن ایسے لوگ خال خال ہیں، اجتماعاً اس طائفہ میں ایک فرد بھی ایسا نہیں جو کلمۃ الحق کا پشتیبان ہو اور مسلمانوں کے موجودہ اسلام کو قرنِ اول کے اسلام کی طرف لے جاسکتا ہو، کسی میں کایا پلٹنے کا بوتا نہیں۔ ہمارے علماء نہ اجتہاد کر سکتے ہیں۔ نہ انہیں فکر و نظر میں کمال حاصل ہے۔ نہ مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ نہ قدیم و جدید کے امتزاج پر قادر ہیں، اور نہ کسی ملک یا قوم کی تقدیریں پھیر دینے کی صلاحیتوں سے آگاہ ہیں۔ یہ اسلاف کی کار بن کاپیاں ہیں۔ اور ان سے نفس اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ افسوس ہے کہ جس رجل رشید کی اسلام کو ضرورت ہے وہ پیدا نہیں ہوا، جس دن مسلمانوں میں ایسا کوئی فرزند پیدا ہوا جس نے محسوس کیا کہ افکار تازہ ہی انقلاب عوام لا سکتے ہیں۔ اور عوام نے سمجھ لیا، کہ اسی میں ان کے دکھوں کا مداوا ہے۔ اس دن نہ صرف کعبہ کے برہمنوں کی کھیپ غفرلہ ہو جائے گی، بلکہ ہم ایک ایسی شاہراہ اجتہاد و انقلاب پر آجائیں گے۔ جو اس وقت ہمارے لئے دیوانے کا خواب ہو چکی ہے۔ دنیا صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ اسلام ایک زندہ طاقت ہے یا نہیں، اور مذہب کا مستقبل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ علماء میں کوئی سا شخص ملت اسلامیہ میں انقلابی فکر و نظر کا مالک نہیں۔ یہ سارا گھر ہی حسرت تعمیر کے باعث معمار کا منتظر ہے۔۔۔۔

اُدھر یہ دین کی حالت ہے۔ اُدھر دنیا کے امور ہماری رسائیوں ہی سے بالاتر ہوتے جارہے ہیں۔ خود بخود سوال کرتے جایئے اور سوچتے جایئے۔

☆ آپ کے ہاں کوئی بڑا مصنف ہے، جو اس دور نے پیدا کیا ہو۔

☆ آپکے ہاں کوئی ایسا مقنن ہے، جس کا فکر ونظر کی بلندیوں کے باعث ملک کے باہر بھی احترام ہو۔

☆ آپکے ہاں کوئی ایسا ادیب ہے، جس کی نگارشات عالم انسانی میں احترام ووقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہوں۔

☆ آپ کے ہاں کوئی ایسا شاعر ہے، جس کے کمالاتِ شعر کو غالب واقبال سا دوام ہو۔ چلیے ان سے قطع نظر کیجئے، فرمایئے کوئی ایسا شاعر پیدا کیا ہے، جس کا کلام حسرت، جگر، فانی اور اصغر کا ہم پلہ ہو۔

☆ آپ کے ہاں کوئی ایسا صحافی ہے، جس کو آپ جوہر، ظفر علی، ابوالکلام کے ہمدرد، زمیندار اور الہلال کا درجہ دے سکیں۔

☆ آپ کے ہاں کوئی سلیمان ندوی، حسن نظامی ہے۔

☆ آپ کے ہاں کوئی علی گڑھ، دیوبند، ندوہ اور جامعہ ہے

☆ آپ کے ہاں کوئی ایسا انجینئر ہے جو ملکی وسائل کے تحت اپنے فنی دماغ کی تحقیقات سے عوام الناس کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں کوئی ایسا شہ دماغ ہے، جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہو۔

☆ کوئی سائنسدان ایسا بھی ہے، جس نے کوئی چیز ایجاد کی ہو۔

☆ کسی ایسے معمار کا نام لیجیے جو گلبرگ ہی آباد نہ کرسکتا ہو، بلکہ مفلوک الحال عوام کے لیے تازہ بستیاں بسانے پر بھی قادر ہو۔

☆ کسی مصلح کا نام لیجیے جس نے سماجی زندگی کو بدل دینے کا تہیہ کیا ہو۔

☆ کسی سرسید کو نکالیے، کوئی وقار الملک یا محسن الملک اٹھایئے۔

☆ اس دور نے کوئی ایسا انسان بھی پیدا کیا، جو گنگا رام کی طرح ٹرسٹ بنا سکتا ہو، یا دیال سنگھ کی طرح ادارہ بنانے پر قادر ہو۔

☆ کتنے وکلاء نے بنیادی حقوق کی عام حفاظت کے لئے اپنی خدمات بلا معاوضہ پیش کی ہیں۔

اقبال ہمارا سب سے بڑا شاعر ہے اور اقبال کے نام پر کتنے اداروں کو یہاں خشکہ مل رہا ہے۔ کتنے بھگت ان کے نام سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کتنوں کو ان کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی ہے کتنوں نے اقبال پر ایسا کام کیا ہے جو یادگار ہو اور جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ منفرد ہے۔ ''روحِ اقبال'' جیسی جامع کتاب بھی ہمارے سنگدل ہمسائے ہندوستان ہی کے ایک شہری ڈاکٹر یوسف حسین کے قلم سے ہے۔ اور جو لوگ پاکستان کے خزانہ عامرہ سے امدادی رقمیں لے کر اقبال کے نام پر اجارہ دار بنے ہوئے ہیں ابھی تک تہی داماں ہیں۔ اقبال کو اسلام کا سب سے بڑا شاعر کہنا، اس کی فکر کو مسلمانوں کے مستقبل کا ضامن قرار دینا ہمارا شیوہ گفتار ہے۔ لیکن اسلام کی سب سے بڑی زبان عربی میں اقبال کے سوانح منتقل کرنے کی سعادت بھی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جلیل القدر استاد سید ابوالحسن علی ندوی کے حصہ میں آئی ہے۔ ''روائع اقبال'' دارالفکر دمشق سے شائع ہوئی۔ قیمت دو سو قرش ہے۔ یہ کتاب اس تمہید وغایت کے ساتھ حوالہ قلم کی گئی ہے کہ اقبال کی فکر کے اولین مخاطب عرب ہیں۔ جوفی زمانہ قومیت ووطنیت کے نرغہ میں ہیں۔ مولف کے نزدیک اقبال کے فکر وفلسفہ کی اشاعت سب سے زیادہ عربی میں ہونی چاہیے۔ اور یہ کتاب اس عظیم نصب العین کا ابتدائیہ ہے۔ مؤلف نے ''روح اقبال'' میں نہ صرف کلام کے فکری انتخاب کا فصیح وبلیغ ترجمہ کیا ہے بلکہ وہی روح اور اعتماد اس ترجمہ میں موجود ہے جو کلام اقبال کی خصوصیت ہے۔ حضرت علامہ کے سوانح حیات بھی شروع میں دیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس ہم نے آزادی کے بعد جو کچھ کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت سے باہر رہ کر حکومت پر تنقید کرنا اور پھبتی اڑانا۔ حکومت میں جاکر خوشامد چاہنا، خوشامد کرنا اور غلط روایتوں پر مصر ہونا، ہماری فطرت ثانیہ کا طغرائے امتیاز ہو چکا ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۷ جنوری ۱۹۶۴ء)

جعلی پیر، کھوٹے ملا، نقلی واعظ، جھوٹے منجم

سادہ لوح مسلمانوں کی ضعیف الاعتقادی کے عناصر اربعہ

علامہ اقبالؒ کے کلام کی "بدقسمتی" ہے کہ ان کے فرمودات ریڈیو کے ہتھے چڑھ گئے۔ انہوں نے وقتی مصلحتوں کے تحت وہی حصہ انتخاب کیا، جو ان کے نزدیک پیغام سے خالی تھا۔ لیکن شعر و نغمہ سے پر، یا پھر جس کی روح پر کسی مغنیہ یا مغنی کی آواز غالب آئی ریڈیو کے بعد کلام کے وارث و مختار قوال ہو گئے۔ جو خود حضرت علامہ کے نزدیک افیون فروشی کرتے ہیں۔

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون ہے
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم الکلام

(ارمغان حجاز)

علامہ اقبالؒ کے کلام پر تیسرا قبضہ بعض "مرحوم" سرکاری افسروں نے کر لیا۔ جو اپنے آپ کو علامہ مرحوم و مغفور کا دست راست سمجھتے رہے، یا جن کا یہ دعویٰ رہا کہ وہی کلام اقبال کے اسرار غوامض کو سمجھتے ہیں ان لوگوں نے علامہ اقبال کے کلام کو خود ساختہ اکیڈمیوں کی معرفت سرکاری روپے سے اپنی مخصوص روایتوں اور حکایتوں کا اکھاڑہ بنا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرکاری روپے سے قائم شدہ اکادمیاں جو کچھ اقبال کے بارے میں شائع کرتی ہیں ان کا بہت بڑا حصہ تو رخرافات کا شکم ہے اس میں کلام نہیں کہ بعض لیکن بہت تھوڑی قیمتی کتابیں بھی اس موضوع پر شائع ہوئی ہیں مگر وافر حصہ ان کتابوں کا ردی میں فروخت کر دینے کے قابل ہے جس طرح سیاسین کی ایک منڈلی نے ادھر ادھر قبضہ کئے رکھا اسی طرح ادب بھی بعض چونکہ، چنانچہ قسم کے لوگوں کی جاگیر ہو گیا ہے۔ ایک دو فضلا اور ایک، دو اساتذہ مثلاً ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کو چھوڑ کر اکثریت ان اقبالی فضلا اور اقبالی اساتذہ کی ہے جو اقبال کے کلام کی مبادیات سے ناواقف ہیں۔ ہم ایک یونیورسٹی کی قسمت فارسی کے ایک ایسے سربراہ کو جانتے ہیں جو جاسوس کے فرائض بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ لیکن کلام اقبالؒ کی روح سے قطعی بے بہرہ ہے حتیٰ کہ کلام اقبال بھی صحیح لب و لہجہ کے ساتھ پڑھ نہیں سکتا بعض اقبالی قلمکاروں کا بھی یہی حال ہے وہ اقبال پر صرف اس لیے کتابیں لکھتے ہیں کہ انہیں معاوضہ ملتا ہے یا سرکاری زراعانہ ہڑپ کرنے کی باضابطہ سہولتیں حاصل ہوتی ہیں ہم ان زندہ مردوں کا کفن پھاڑنا نہیں چاہتے ورنہ ان کی صورتیں بے نقاب کرنا کوئی

مشکل کام نہیں ہے۔

اقبال نے جو کچھ لکھا ایک بہت بڑے نقاد کے الفاظ میں انگریز اور مسلمان دونوں سے سمجھے نہیں انگریز سمجھتا تو شاید تختہ دار پر کھنچوا دیا تا یا انگریز نے مسلمانوں کی مٹی کے بنجر ہونے کا احساس کر کے اس ابر نیساں سے صرف نظر کیا۔ ادھر مسلمان کلام اقبالؒ کی روح کو پا جاتے یا جس عشق و جذبہ کے تحت مشرق کے مسلمانوں کی بیداری کا ولولہ ان کے کلام میں وجود ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی مشرق کی روح قبول کر لیتی تو مسلمانوں کا زوال اب تک ٹل چکا ہوتا۔ مگر انگریز نابلد رہا یا اغماض کیا۔ مسلمانوں کو ان کی بے علمی کھا گئی۔ نتیجاً اس کا یہ نکلا، مسلمانوں کے معاشرہ کو چار بیماریاں اس بری طرح چمٹ گئیں کی مسلمان گویا ان بیماریوں کا اوڑھنا بچھونا ہو کر رہ گئے۔ اولاً جعلی پیر، ثانیاً کھوٹے ملا، ثالثاً نقلی واعظ، رابعاً جھوٹے منجم حالات ایسے ہیں کہ قلم مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور قوم ایسی ہے، کہ ان بلاؤں کی زہرناکی اس کے رگ و ریشے میں اتر گئی ہے۔ روزمرہ کے واقعات سامنے ہیں جعلی پیر دن دہاڑے مریدنیوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں لیکن ضعیف الاعتقاد عورتیں بلکہ ان کے ساتھ مردوں کا ایک غول بھی ان بدبختان ازلی کی زلف گرہ گیر کا شکار ہو رہا ہے۔ ع

اف نہ کر آہ نہ کر چوٹ پہ چوٹ کھائے جا

اللہ والے لوگوں کی کمی نہیں۔ خیبر سے سلہٹ تک اس قسم کے لوگ بھی مل جاتے ہیں، جن کی نظریں روح و دل کی دنیا پلٹ دیتی ہیں۔ لیکن ننانوے فی صد سجادے اور ننانوے فی صد قوم، خود فروش سجادوں، ناکارہ گدیوں آوارہ آستانوں اور سنگ مرمر کی قبروں کا طواف حج اکبر سمجھتی ہے۔

ضعیف الاعتقادی کے اس کارخانے سے ایک حکایت یاد آ گئی۔ ایک صاحب سفر میں تھے، جہاں جاتے وہاں قبروں کا طواف کرتے، منتیں مانتے، نذرانہ دیتے، چڑھاوا چڑھاتے، لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب سے گزر رہے تھے، سنگ مرمر کی منقش قبر دیکھی۔ پھر یہ معلوم کئے بغیر کہ کس کی قبر ہے، اور کون اس میں آسودہ خواب ہے، الحاح وزاری سے دعائیں کرنے لگے۔ یا ولی اللہ میں بڑا گنہگار ہوں، میں نے سب کچھ گناہوں میں کھو دیا۔ اب صرف بخشش چاہتا ہوں، گور کنارے ہوں، روز محشر وسیلہ بن جائے وغیرہ وغیرہ۔ ایک صاحب وہاں سے گزر رہے تھے، انہوں نے الحاح وزاری کا منظر دیکھا، تو پوچھا۔ خان بابا کیا کر رہے ہو؟ جوب ملا۔ بھائی ولی اللہ کی قبر پر اپنی بخشش کے لئے دعا مانگ رہا ہوں مستفسر کو حیرت ہوئی۔ کہنے لگا خان بابا یہ تو ایک طوائف کی قبر ہے، خان کو فوراً طیش آیا، اپنی سرحدی چپل اتار کر قبر پر دھڑا دھڑ بارش شروع کر دی خوب بے ایمان کا بچہ، سور، خنزیر، زندگی میں بھی دھوکا دیا۔ اور اس حال کو پہنچا دیا، اب مر کر بھی دھوکا دے رہا ہے۔ سنگ

مرمر کا لبادہ پہن لیا ہے۔

ہمارے پیروں اور صوفیوں کی غالب تعداد اس سے مختلف نہیں۔ ان زندہ قبروں کو واقعتہً مسمار کر دینے کی ضرورت ہے۔ ع

ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

دوسری نانجار مخلوق کھوٹے ملا ہیں مثلاً ملا محمد عمر اچھروی یہ لوگ قرآن وحدیث میں تحریف کرتے ہوئے شرماتے نہیں۔ جب واعظوں کے زمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اس کی حیثیت ایک گویے کی ہو جاتی ہے، ان کا کام صرف قرآن پاک کو گا کر پڑھنا اور لطیفے تراش کر جدن بائی کی طرح مور پنکھی ناچ دکھانا ہے،

تیسری جنس نایاب بلکہ جنس عام واعظوں کی ہے۔ جو قرآن وحدیث کے نام پر روپیہ بٹورتے ہیں اور الفاظ کی میناکاری سے اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ مثلاً انکے سرخیل ہمارے پرانے دوست صاحبزادہ فیض الحسن ہیں۔ جن کے پاس روحانی کمالات کا اتنا حصہ بھی نہیں جتنی ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔

چوتھا گروہ جھوٹے منجموں کا ہے، جو بازاروں اور مکانوں میں دوکانیں لگائے بیٹھے ہیں، یہ گروہ بھی بہت بڑی لعنت ہے۔ ان لوگوں نے تعویزوں، دھاگوں، ٹوٹکوں اور ان اشیاء کی ہم رشتہ چیزوں سے گھروں کے گھر تباہ کر دیے ہیں۔ یہ لوگ گویا اللہ کے قریب ہیں۔ (معاذ اللہ)

اقبال نے ان چاروں عناصر کے خلاف اپنے کلام بالخصوص آخری دور کے کلام میں سخت تنقید کی ہے۔ بلکہ ان کے کلام کا آخری عہد ہی ان کے خلاف احتجاج پر مبنی ہے، ہماری قوم میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اس بدبخت مخلوق سے مسلمانوں کو نجات دلائے ہم اللہ کو گواہ بنا کر کہتے ہیں۔ قیامت کے روز ہمیں حضور سرور کونین کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اگر ہم اس بارے کسی کو ملحوظ رکھیں۔ اس کا ثانیہ تک ہمارے دل میں ہو۔ یا ہم کسی رخ سے اس معاملہ میں کوئی پہلو وار نشتر رکھتے ہوں ہم نے پیروں کی اکثریت ملاؤں کی تعداد غالب، واعظوں کی کھیپ کا بیشتر حصہ اور منجموں کا ننانوے فیصد گروہ محض جھوٹا اور فاش پایا ہے۔ اگر فیض الحسن شاہ جیسے بزرگ اپنے اندر کوئی کمال رکھتے ہیں، یا ملا محمد عمر اچھروی جیسے لوگ کسی دینی ہنر سے بہرہ مند ہیں الا ایک ہنر کے جس کا ذکر ہم ایک خاص دور میں کر چکے ہیں۔ تو اللہ کی ہم پر لعنت ہو، ورنہ آج قوم کو عذاب و ابتلاء سے بچانے کا

ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم میں کوئی ایسا رجل رشید ہو، جو قوم کو ان عوارض سے نجات دلا سکتا ہو۔ ان واعظوں کو جیل میں ڈالنا چاہیے جو مسلمانوں میں تفریق کا بیج بوتے اور ان کے دل ودماغ میں غلط قسم کے خیالوں کا ایک حشر زار قائم کرتے ہیں، آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے سر سے یہ ارضی بلائیں ٹل جائیں جو ایں شریف وآں شریف کے آستانوں میں رہتی اور مخلوق خدا کی جیبیں کترتی ہے۔

جس طرح سانپوں کی قسمیں نہیں گنوائی جاسکتیں کہ کس قدر ہیں اسی طرح یہ بتانا مشکل ہے کہ ان عناصر اربعہ کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کے کاٹے کا علاج کیا ہے۔؟ اللہ مسلمانوں کا محافظ و نگہبان ہو۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

شرم تم کو مگر نہیں آتی

کیا آپ یہ گزارش کرنے کی اجازت دیں گے کہ پاکستان میں مدۃ العمر سے دین و دانش ہی کا نہیں بلکہ علم و ادب کا بھی قحط ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک یہ ایک قومی المیہ رہا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں طاقت رہی ہے ان کی عظیم اکثریت کو بذاتِ خود دین و دانش یا علم و ادب سے واجبی سا تعلق ہی رہا۔ ہمیں معلوم ہے کہ مرحوم وزارتوں کے بعض سربرآوردہ اصحاب کو تقریبی تقاریر نہ صرف لکھ کر دینی پڑتی تھیں بلکہ کئی کئی دن انہیں تلفظ یاد کرایا جاتا اور ان کے حافظہ میں یہ بات اتاری جاتی تھی کہ وہ اس لفظ کا تلفظ اس طرح کریں۔ انہیں واو معدولہ، واو معروف، واو مجہول، یائے معروف، یائے مجہول، ہائے مخفی، حرف ساکن، حرف مشدد اور حرف متحرک کے فرق و امتیاز سے آگاہ کرنا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ یہ لوگ کسی انسانی وصف کی بنیاد پر نہیں بلکہ خاص اسباب کی بنیاد پر برسر اقتدار رہے۔ گویا ان کا انتخاب ''**حسن انتخاب**'' تھا۔ اس حسن انتخاب ہی کے صلے میں علم و دانش کی مسندوں پر وہ لوگ فائز ہو گئے کہ انہیں ادب و ثقافت کے واسطہ سے قبروں تک نوازا گیا۔ بعض لوگوں نے ''ان جمہوری درباروں'' میں رسوخ حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو **نورتن** سمجھا مثلاً کوئی شخص کسی بینک کا مختار ہو گیا۔ تو اس نے اپنے آپ کو **عبدالرحیم خانخاناں** سمجھا اور سخی ہو گیا۔ پھر جس کو چاہا اور جس طرح چاہا نوازا۔ یہ ادب پروری یا علم دوستی نہیں بلکہ ایک خاص رنگ کی شعبدہ بازی ہے۔ جس کا مفہوم گئے وقتوں کے چاندنی چوک کے مخصوص محاوروں ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔

زبان کو بنانے اور اجالنے پر ادبی شہزادے اور سبکدوش افسر مامور ہو گئے۔ تاریخ سیاسی لفندروں کے ہاتھ آ گئی ------ اقبال پاکستان کی سب سے بڑی فکری متاع تھا۔ اس کو ان لوگوں نے ہتھیا لیا جو اقبال کے حقیقی افکار سے لازماً اتنی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ جتنی نسبت کسی شائیلاک کو خوف خدا سے ہوتی ہے۔

اقبال اکیڈمی اور بزم اقبال لاہور ہمارے اس الزام کی تغلیط نہیں کر سکتی ہیں۔ کہ ان دونوں مجلسوں کو جتنا روپیہ سرکار سے اقبال کے نام پر ملا ہے۔ اس کا بہت بڑا حصہ اسراف و تبذیر کی نذر ہو گیا ہے۔ غلط کتابیں شائع کی گئیں۔ خاص دوستوں کو نوازا گیا۔ اقبال کے نام پر جو لٹریچر موجود ہے۔ وہ زیادہ تر اقبال سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ جہاں تک اقبال کے پیغام کا تعلق ہے ان دو اداروں نے ہماری نپی تلی رائے کے مطابق اقبال کا صحیح فکر اور اس کا صحیح عکس پیش کرنے میں ارادی اور غیر ارادی طور پر بے شمار ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بسا اوقات یہ

احساس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اقبال کے مینارۂ عظمت کو توڑنا چاہتے یا پھر اس کا نام لیکر خود زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

اقبال کے افکار کی عمارت چار بنیادوں پر قائم ہے۔

اولاً۔ خودی

ثانیاً۔ اتحاد ایشیا

ثالثاً۔ توحید و رسالت سے شیفتگی

رابعاً۔ مغرب پر مدافعانہ ہی نہیں جارحانہ تنقید

محولا بالا اداروں نے ان بنیادوں کے بارے میں کوئی ثقہ، مستند، جامع، تحقیقی اور تاریخی مواد فراہم نہیں کیا جو کچھ پیش کیا اس سے اقبال کی عظمت قائم نہیں ہوتی۔ بلکہ بڑی حد تک تنقیص ہوتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان لوگوں کو یہ کتابیں لکھنے کا حق نہ تھا۔ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ انہیں اقبال کے نام پر سرکاری روپیہ بانٹنے اور اپنے خاص رجحانات کو اجالنے کا کوئی حق نہیں یہ نہ صرف ایک ذہنی خیانت ہے بلکہ مجرمانہ فعل بھی ہے اور صرف اس لیے روا ہے کہ حکمران جماعت میں فکر و نظر، علم و ادب اور دین و دانش کے مزاج شناس مفقود ہیں۔

اس سال بھی پچھلے سال کی طرح کراچی میں جشن اقبال منایا جا رہا ہے۔ پس منظر کو چھوڑیئے اور اس کو طاق پر رکھیے کہ اقبال کے نام پر قوالی خود کلام اقبال کی نفی کرتی ہے۔ یا مشاعرہ دماغی لہو و لعب کی ایک حرکت مذبوحی کے سوا کچھ نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے قدموں کا یہ میلہ لگانا شروع کیا ہے وہ اثباتی طور پر قوم کے سامنے کیا پیش کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ اقبال کے عشق میں ہو رہا ہے! یا اختیار کی بوقلمونی اپنا طربیہ پیش کر رہی ہے۔ جن لوگوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ ان میں اکثریت ایسے افراد کی ہے کہ اقبال کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ان کے لیے کراچی کی سیر و سیاحت اور یاران سرِپل کی زیارت کا انتظام ہو گیا ہے! اقبال زندہ ہوتے تو ان چہروں کو سامنے آنے کی جسارت نہ ہوتی؟ کیونکہ اقبال کا دروازہ ان کے لیے بند تھا۔ اور اگر آج اقبال زندہ ہو جائیں تو چراغاں کے اس میلے کو دیکھ کر دوبارہ خودکشی کر لیں کہ ان کے نام پر قومی روپیہ یا زراعانہ کی بدولت کیسے کیسے انحوکہ روزگار ناٹک رچائے جا رہے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان ۲۴۔ اپریل ۱۹۶۷ء)

اقبال کے نام پر مذاق

علامہ اقبال کے نام پر بعض اداروں نے مذاق شروع کر رکھا ہے۔ مثلاً اقبال اکیڈمی اور بزم اقبال نے آج تک لاکھوں روپے کی سرکاری امداد کے باوجود فکرِ اقبال پر کوئی ایسی کتاب شائع نہیں کی جس کو نظریہ پیش کیا جا سکے یا اس کے مطالعہ کی افادی حیثیت کا اعتراف کسی گوشہ میں موجود ہو۔۔۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مطبوعات کا نوے فیصد حصہ بے کار ہے۔ اور باقی صرف سطحی معلومات ہیں۔ آج بھی ہندوستان ہی کے اہل قلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اقبال پر بہترین کتابیں شائع کی ہیں۔ اور انہی سے یہاں بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ اولاً ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب "روحِ اقبال" ہے جو مکتبہ دہلی نے شائع کی ہے۔ اور اب اس کی اشاعت آئینہ ادب نے یہاں بھی کی ہے۔ دوسری کتاب "اقبال کامل" مولانا عبدالسلام ندوی کی تالیف ہے۔ دار المصنفین کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ یہاں کسی کے پاس اس کے حقوق اشاعت نہیں۔ تیسری کتاب انگریزی میں خواجہ غلام السیدین کی "اقبال کا فلسفہ تعلیم" ہے۔ چوتھی کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی کی عربی تالیف ہے۔ جو انہوں نے اقبال کے افکار و سوانح پر تحریر کی ہے۔ اور دمشق سے شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے مصنفین کی بیش قیمت کتابیں اور مقالے بھی ہیں جو علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور الہ آباد یونیورسٹیوں کے فاضل اہل قلم نے ترتیب دیے ہیں۔ اور جن سے علامہ اقبال کے فکر و نظر کی سینکڑوں راہیں تشنگانِ علم پر کشادہ ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اس کے برعکس ہمارے فضلاء نے اقبال کے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے۔ وہ اتنا پست ہے کہ مقابلۃً پیش کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کتاب فکرِ اقبال مصنفہ عبدالحکیم کے نوادرات ہم پچھلے شمارے میں پیش کر چکے ہیں۔۔۔۔۔ دوبارہ پڑھیے کہ اقبال کے نام پر کیا رطب و یابس پیش کیا گیا ہے۔ یومِ اقبال کے نام پر دو تین برس سے عروس البلاد کراچی میں سوانگ رچایا جا رہا ہے۔ یہ محض روپے کا ضیاع ہے۔ اگر نیشنل بینک آف پاکستان کے مسٹر ممتاز حسن اور کراچی کے کمشنر سید دربار علی شاہ اس کمیٹی کے کرتا دھرتا نہ ہوں تو جس ٹھاٹھ سے میلہ لگایا جاتا ہے ظاہر ہے بیکار ہے۔ اس تقریب میں اکثر چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے علامہ اقبال عمر بھر متنفر رہے۔ مثلاً قوالی، علامہ اقبال مشرقی عوام کے لئے افیون قرار دیتے ہیں۔ مشاعرے، علامہ نے ان میں شرکت کو دماغی لہو و لعب قرار دیا۔۔۔۔۔۔ رہ گئے، اقبال کے نام پر ڈرامہ اور رقص، تو اس بارے میں بھی اقبال کہہ چکے ہیں۔۔۔۔۔۔

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

..... تصویروں کی نمائش کی جارہی ہے۔ اور اس کے لئے انعام بھی رکھے گئے ہیں لیکن اس سے اقبال کی تعلیمات کو قطعی فائدہ نہیں پہنچتا۔ علامہ اقبال کے مصوری سے متعلق خاص نظریات تھے۔ کسی کو نوازنا مقصود ہے تو اقبال ہی کے نام پر کیوں؟ کوئی اور راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے.......

۔۔۔۔۔۔ جن لوگوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں دو چار علامہ اقبال کے ہاں سال ششماہی پھیرے ڈالا کرتے تھے لیکن انہیں (الا ما شاء اللہ) اقبالیات میں کوئی درجہ و مقام حاصل نہیں۔۔۔۔۔ ان میں اکثر اقبال کی موت کے بعد، ان کے احباب بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو اقبال کے ہاں وہ درجہ حاصل تھا جو بڑے آدمیوں کے ہاں کورنش بجالانے والوں کا ہوتا ہے۔

اقبال نے لوگوں سے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ سوچنا بھی ان کی عظمت کے منافی ہے۔ انہوں نے اقبال سے کیا حاصل کیا۔۔۔۔۔۔ وہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے ان پر فہم اقبال کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ صرف ان کے نام پر کہانیاں گھڑ کے سنا دیتے ہیں۔ یا پھر غلط تفسیریں۔

اقبال کے خطوط چھپ چکے ہیں۔ اقبال نامہ کی جلد اول میں ۲۶۷ اور جلد دوم میں ۱۸۷ خطوط ہیں۔ اگر اس جماعت کے کسی شخص کے نام کوئی خط ہے تو ان کے کسی استفسار کا جواب ہے۔ لیکن خود علامہ نے جن لوگوں سے علم و ادب اور دین و شریعت میں استفسار کیا یا استاذ الکل کہا اس خانوادے کا ایک فرد بھی ان میں نہیں۔

یہ لوگ بتا سکتے ہیں کہ اقبال نے انہیں کبھی کوئی خط لکھا، کسی تحریر میں ذکر کیا؟ اب اس اعتماد سے سامنے آرہے ہیں گویا دربار اقبال کے نورتن تھے۔ اقبال پر اگر کوئی شخص بات کر سکتا ہے تو وہ سید نذیر نیازی ہیں۔ کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، خواجہ عبدالوحید، مولینا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ہیں۔ لیکن ان سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔ کارپردازوں کو یقین ہے کہ ان کی شخصیت کے سامنے ان کا چراغ مدھم ہو جائے گا۔ مزید برآں خویش پروری یا اقربا نوازی کا جو سلسلہ جاری ہے۔ اس کے منقطع ہونے کا امکان ہے؟

ہم یہ بات بہت جلد منظرِ عام پر لائیں گے کہ علامہ اقبال کے "حلقہ سخن" میں جو لوگ اب شریک ہو رہے ہیں۔ ان کی اکثریت برطانوی حکومت کے جاسوسوں پر مشتمل تھی۔ اور ان کا کام علامہ اقبال کی ذہنی

سرگزشت حکومت تک پہنچانا تھا۔بعض لوگ ان میں وہ بھی تھے، جنہیں علامہ اقبال سے ایک آدھ دفعہ شرف ملاقات ہوا۔اور بس۔ دو چار بزرگ جواب پیش پیش ہیں، انہیں علامہ اقبال نے اپنے بنگلہ سے دھکے مار کر نکال دیا تھا کہ وہ معلومات حاصل کرنے آتے اور سرکار تک جھوٹی سچی خبریں پہنچاتے ہیں۔ کیا ہمارا فرض نہیں کہ ہر قسم کا خطرہ مول لے کر ان لوگوں کو بے نقاب کریں؟ انشاء اللہ چٹان ہی یہ فرض انجام دے گا۔

(ہفت روزہ چٹان۔ یکم مئی ۱۹۶۷ء)

اقبال کے نام پر نقب زنی

پاکستان میں اس امر کا نوٹس کبھی نہیں لیا گیا کہ ایوانِ حکومت سے امداد حاصل کرنے کے لئے یہاں معمولی افراد کو بھی قومی ہیرو، ادبی راہنما، علمی شہ دماغ اور فکری پیشوا بنایا جارہا ہے لیکن جن لوگوں نے ملک قوم کی واقعی خدمات سرانجام دی ہیں جس سے دین و ادب اور فکر و نظر کو فائدہ پہنچا ہے وہ التزاماً ملک وقوم کے ہن سے خارج کئے جارہے ہیں۔ان کا تذکرہ بعض ایسے لوگوں نے زبان وقلم کے نرغے میں لے لیا ہے جن کا اپنا وجود مشتبہ ہے اور جو روایات وسیاسیات میں بلاخوف تردید، کرنل لارنس کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہاں سب سے زیادہ مظلوم وہ شخصیتیں ہیں جن کی عمریں، برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد یں گزریں جن کے قلم سے حق کی اشاعت ہوئی۔جن کا جہاد، افراد وافکار باطلہ کے خلاف رہا، جنہوں نے ین حقہ کے چراغ روشن رکھے، ان کی جگہ کون لوگ آگے آئے وہی لوگ جو اس جدوجہد کے زمانے میں پیدا ی نہیں ہوئے تھے، جن کا قلم بازار میں فروخت ہوتا رہا، جن کی خدمات حکومت انگریزی کے حوالے تھیں، جنہوں نے تلبیس کے فرائض انجام دیئے۔ جو کبیروں کی حیثیت سے سرکاری نگارخانوں میں کورنش بجالاتے ہے۔ یہ ایک قومی المیہ اور ملی سانحہ ہے یہ ایک ادبی حادثہ اور فکری استہزا ہے۔

علامہ اقبال کا تذکرہ کیا جارہا ہے تو ان کا معاملہ دوسرا ہے۔ انہیں تسلیم کئے بغیر ان کوتاہ کاروں کی یرانی ختم ہی نہیں ہوتی ہے تاہم اقبال کو بھی نقب لگائی جارہی ہے۔ جو روپیہ سرکاری خزانے سے اقبال کے نام پر قائم شدہ اکادمیوں کو ملتا ہے اس کا مصرف صحیح نہیں ہو رہا۔

کراچی کی مجلس اقبال میں ایک آدھ سے قطع نظر سرے سے کوئی عالم ہی نہیں۔ وہاں کسی شخص کی بصیرت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ لاہور کی بزمِ اقبال نے اقبال پر جو کچھ شائع کیا ہے وہ ننانوے فی صد ناقص، ادھورا، بدمزہ اور روحِ اقبال کے منافی ہے۔ مجلس اقبال کراچی کے شائع کردہ لٹریچر کا بیشتر حصہ افسوسناک ہے۔ کسی مصنف، مولف یا مرتب نے موضوع ومقصد کے علاوہ غور وفکر سے کام نہیں لیا۔ اقبال عمر بھر شاہینوں کا سبق دیتے رہے۔ لیکن ان کے افکار پر بگلا بھگت قابض ہو گئے ہیں۔ جو اقبال کے نام پر خودنمایاں ہونا چاہتے ہیں۔ یعنی اقبال کی آڑ میں اپنے آپ کو چمکانا چاہتے ہیں۔ ان کا محاسبہ کرنے والا کوئی نہیں۔ حکمران علمی محاسبہ کرنہیں سکتے۔ وہ ان کے کشکول میں روپیہ ڈال سکتے ہیں۔ محاسبہ صرف اہل علم کرسکتے ہیں اور وہ مدت سے علم کے اس مذبح میں خاموش ہیں۔

جوافسر بھی ریٹائرمنٹ کے قریب آتا اور اس کی توسیعی ملازمت کے دن پورے ہونے لگتے ہیں ر
وہ اس قسم کا کھڑاگ رچا کر بزعمِ خویش دانشور یا مفکر بن بیٹھتا ہے پھر انجمن ہائے ستائش باہمی کے ارکان، اس کی شخصیت کو منفعتی تعریف وثنا کے سانچے میں ڈھالنے لگتے ہیں۔ علامہ اقبال کی اصل تعلیمات کے خلاف ایک زبردست تحریک باطنی طور پر شروع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک مرکز تو کراچی کی مجلس اقبال ہے۔ جس نے اقبال کے مصنوعی روح شناس پیدا کر کے بعض عجیب الخلقت لوگوں کے لئے رزق ومعیشت کا دروازہ کھول دیا ہے۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مرزائیت اقبال کے دینی کارناموں کو پسِ پشت ڈلوا کر ان کے ذاتی پہلوؤں یا صرف شعری کارناموں کو باقی رکھنا چاہتی ہے اور وہ بھی بہ امر مجبوری کیوں کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں، اقبال کے فکری آثار، دین سے لگاؤ اور قادیانی عقائد کے تعاقب کو بالکل ہی سبوتاژ کیا جا رہا ہے۔

اقبال علی بخش نہیں کہ ہر سال اس کی نمائش کی جائے یا اقبال کے نام پر چند مسیلمہ جمع کر لئے جائیں اور کہا جائے کہ انہیں اقبال سے دوستانہ قرابت رہی ہے۔ اقبال کے نام پر سب سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ ان کا بھتیجا اعجاز احمد میرزائی ہے۔ وہ اپنے چچا کا نہیں میرزا غلام احمد کا متبع ہے، ذرا اس سے گفتگو کر لیجئے آپ محسوس کریں گے کہ وہ اقبال کے افکار کو کس حد تک تسلیم کرتا ہے۔ یہ گویا اقبال سے ایک زبردست انتقام لیا جا رہا ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۲ جون ۱۹۶۷ء)

علامہ اقبال پر فلم

علامہ اقبال نے سینما کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ بال جبریل کے صفحہ ۲۱۰ پر سینما کے عنوان سے موجود ہے اقبالیین کی وہ جماعت جو سرکاری توشہ خانے سے پرورش پاتی ہے اور پیروؤں کا وہ گروہ جس کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار کی توجیہہ وتعبیر کا انحصار اس کے اپنے تخیل پر ہے۔ اگر ذوقِ سلیم سے محروم نہیں تو یہ لوگ ایک نگاہ ان اشعار پر ڈال لیں۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
سینما ہے یا صنعت آذری ہے
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا
یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی
وہ بتخانہ خاکی یہ خاکستری ہے

فقیر سید وحید الدین نے علامہ اقبال کے افکار وسوانح پر دستاویزی فلم تیاری کی تو جن لوگوں کے سپرد اس فلم کا مزاج کیا۔ یقین تھا کہ ان کے ذوق سلیم سے وہی چیز پیدا ہو گی جس پر ڈاکٹر جاوید اقبال، جسٹس سجاد احمد جان، چودھری نذیر احمد اور دوسرے اکابر نے احتجاج کیا ہے۔ فلم کی نمائش سے پہلے فقیر صاحب نے دعوت نامے جاری کیے تھے۔ ہمیں بھی دعوت نامہ ملا تھا۔ ہم نے فقیر صاحب کو ایک خط میں مطلع کر دیا تھا کہ جن لوگوں کے نرغہ میں ہیں۔ وہ ذکرِ اقبال کی آڑ میں فکر اقبال کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ لہٰذا اس فلم کو دیکھنے سے کوئی چیز حاصل نہ ہو گی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے راقم سے کہا ضرور چلنا چاہیے۔ عرض کیا کہ ان لوگوں کو پڑھ لیا ہے اب ان کے رشحات کو پڑھنا بے معنی ہے۔ نتیجہ وہی نکلا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی فلم کے قبائح پر احتجاج کرنا پڑا۔

فقیر صاحب ہمارے خیال کے مطابق ایک مخلص انسان ہیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک صحیح کام ایک غلط جماعت سے لے رہے ہیں۔ فیض صاحب کا مقام وفکر الگ ہے، ان سے اقبال پر مکالمے لکھوانا ایسا ہی ہے۔ جیسا مولانا مظہر علی اظہر سے کہا جائے کہ وہ قائد اعظم کی سوانح عمری لکھیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(ہفت روزہ چٹان ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ء)

غیرت سے دستبرداری

جن لوگوں کی صحت رقص وسرود سے قائم رہتی ہے ان لوگوں نے اس سال پھر یوم اقبال پر رقص و سرود کی نیو رکھی ہے۔ آفاق لاہور میں چھپا ہے کہ لائل پور کے ایک تعلیمی ادارہ (پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ) میں یوم اقبال رقص سرود کے ساتھ منایا جارہا ہے۔ انجمن اصلاح نوجوانان اسلام کے صدر کوئی صاحب مولوی فقیر محمد ہیں۔ انہوں نے صوبائی وزیر تعلیم سے درخواست کی ہے کہ وہ روکیں؟ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وزیر موصوف مداخلت کریں گے یا نہیں؟ لیکن خواہش ہماری یہی ہے کہ مداخلت ہونی چاہیئے بلکہ اس قسم کے احکام جاری ہونے چاہئیں کہ آئندہ تعلیمی ادارے اس قسم کی جسارت ہی نہ کریں۔

ذرا غور کیجئے۔ نام اقبال کا، ادارہ تعلیمی، اور لذتِ نفس چند بوڑھی روحوں کی یا چند سرکش نوجوانوں کی جنہیں حیا نہیں آتی کہ وہ ایک مسلمان معاشرے کے فرد ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ناچ گانے کا شوق ہے تو اپنے خرچ پر اپنے گھروں میں انتظام کریں، انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تعلیمی اداروں کو استعمال کریں اور قومی خرچ پر اپنے مخفی شوق کو پروان چڑھائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک میں رقص وسرود کا جو مزاج تیار کیا جارہا ہے اور جو لوگ اس کے سرپرست ہیں ان پر علماء کے کسی طبقے کا اثر نہیں، وہ اپنے ہی نشے میں مست ہیں۔ ان کا گھمنڈ فرعون کا دماغ چرا کر غرور کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے۔ علماء حق کو بے دین دانشمندوں اور تہی غیرت منعموں کی یہ جماعت گالی دیتی ہے، علماء سوان کی پالی کے مرغ ہیں جو چونچیں لڑانے کے سوا کچھ نہیں جانتے، نتیجۃً اسلام اور اس کے مضمرات پر ضرب لگائی جارہی ہے۔ جو شخص رقص وسرود کا جواز پیدا کرتا ہے کیا وہ اپنی فراست کو رسول اللہ ﷺ کی فراست سے زیادہ قرین حقیقت سمجھتا ہے۔ (معاذ اللہ! خاکم بدہن)

جب ہمارے آقا ﷺ فرما چکے ہیں کہ باپ اور بیٹی کا ایک کمرے میں تنہا ہونا بھی صحیح نہیں۔ تو یہ لوگ جو رقص وسرود کی ان منڈیوں کا راستہ ہموار کرتے اور ان کے انعقاد پر اصرار کرتے ہیں، کہاں کے غیرت مند ہیں۔ اور انہیں ایک اسلامی مملکت میں کس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ کیا ان کی نگاہیں فیض یافتگانِ نبوت سے بھی زیادہ دور رس ہیں۔ ان لوگوں کو روکنے کا ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا ہے کہ ان تہذیبی کنجوں کے خلاف قوم کے اجتماعی ضمیر کو بیدار کرکے زبردست جذبہ مدافعت پیدا کیا جائے اور بس۔

(ہفت روزہ چٹان ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء)

خطا معاف

اقبال کی فکر کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے جہاں تک قبول عامہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ پاکستان اور پاکستان سے باہر کوئی دوسرا مسلمان مفکر جس نے اپنے خیالات سے مسلمانوں کے اجتماعی ذہن کو متاثر کیا ہے اقبال سے زیادہ اثرات پیدا نہیں کرسکا ہے اقبال اولاً ایک شاعر تھے انہوں نے شاعری کے مزاج اور شاعری کی سرشت کو یکسر بدلا جس انقلاب کی بنیاد حالی واکبر نے رکھی تھی اقبال نے اس انقلاب کو جذبات کی سطح سے بلند کیا اور ایک حکیمانہ فکر کی بناڈالی۔ اس حکیمانہ فکر نے بال و پر پیدا کئے اقبال شاعر سے مبصر اور مبصر سے مدبر ہو گئے۔ انہوں نے شاعری میں فہم وتدبر کی نئی راہیں قائم کیں لہجہ ان کا شاعرانہ رہا بلکہ شاعرانہ دلکشی انتہا کو پہنچ گئی لیکن خیال ان کے حکیمانہ ہوتے گئے حتیٰ کہ وہ فکر کے ایک ایسے دور میں داخل ہوگئے کہ بہت جلد مسلمانوں کی قومی زندگی اور ایشیا کی سیاسی زندگی میں ان کی چھاپ نمایاں ہوگئی۔

پاکستان بلاشبہ ان کے خواب کی تعبیر ہے اکثر چھچھوروں نے پاکستان کے تصور پر بحث ونظر کی ایک عمارت بنائی اور اپنے طور پر ثابت کرنا چاہا کہ اقبال سے پہلے بھی کئی راہنماؤں کے ذہن میں مسلمانوں کی ایک ریاست قائم کرنے کا خیال تھا انہوں نے مختلف مرحلوں میں اس کا اظہار بھی کیا لیکن اس حقیقت سے سطحی دماغوں کی یہ جماعت آشنا نہیں کہ اقبال 1857ء کی سازھ دنی کے بعد ایک ہی مسلمان راہنما تھے جن کی فکر نے ہندوستان کی سیاسیات میں سارے زمانہ سے الگ راہ اختیار کی۔ وطنیت اور قومیت کے نظریات کو سم قاتل کہا اور مسلمانوں کی فکر میں ایک الگ ملی وجود کا احساس پیدا کیا۔ ان سے پہلے یہ احساس جس سے ایک علیحدہ ریاست کا تصور پیدا ہو مسلمانوں کے کسی ملی یا علمی راہنما کے خیالات میں موجود نہیں تھا۔ اقبال نے اس فکر کی اور آبیاری کی حتیٰ کہ مسلمانوں کا قومی وجود ہندوستان میں مشخص ہوگیا۔

ہندوستان کے مشہور ہندو راہنما اور بنارس یونیورسٹی کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ نے کہا تھا۔

''اقبال سے پہلے ہم یہ بات محسوس نہیں کرسکتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا الگ وجود بھی ہے ہم انہیں متحدہ قومیت کا جزو سمجھتے تھے۔''

اور یہ بات پنڈت جی نے علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کے فوراً بعد کہی جس سے سیاسیات میں بحث ونظر کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ خود مسلمان سیاستدان علیحدہ ریاست کے تصور پر ہنستے تھے۔ قائداعظم علیہ

الرحمۃ 39-1938 میں اس نصب العین کے راہنما ہوئے پھر انہی کی غیر متزلزل سیادت کے باعث پاکستان بنا لیکن 1919 سے لیکر 1938 تک مسلمانوں کی قومی وحدت، ان کے ملی وجود، ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کی اساطیر و روایات کے الگ ہونے کا تحریکی اور تاریخی عنصر صرف اور صرف اقبال نے پیدا کیا۔ کوئی دوسرا راہنما اس میدان میں ان کو ہمسری نہیں کرسکتا۔ اور نہ ان سے پہلے کسی گوشے میں اس کا احساس یا اظہار موجود تھا یہ احساس اور اظہار اس دور میں صرف اقبال کو حاصل تھا اور یہی احساس و اظہار تحریک پاکستان بنا ضرورت تھی کہ پاکستان بن جانے کے بعد اقبال کے افکار جن کا ماخذ توحید ختم نبوت اور قرآن کے بنیادی تصورات ہیں۔ پاکستان کے جسم کی روح ہوتے لیکن یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ پاکستان میں اقبال کا اسلامی معاشرہ پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کو نیم حکیموں کی پخت و پز ختم کر رہی ہے اور اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ان اقبال اکادمیوں کا ہے جو سرکاری توشہ خانہ سے اپنے لیے رزق پیدا کرتی ہیں اور جنہیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ وہ کونسا رزق ہے جس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے اور جس سے بقول اقبال موت اچھی ہے۔

(ہفت روزہ چٹان ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء)

شرم کی بات

ہم نہیں جانتے اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ لیکن ہم تک یہ روایت ثقہ ذرائع سے پہنچی ہے۔ اور اگر درست ہے تو شرمناک بھی ہے، افسوسناک بھی اور قابل مذمت بھی۔ روایت یہ ہے کہ سندھ یونیورسٹی کے طلباء نے یوم اقبال منانا چاہا۔ لیکن وائس چانسلر نے فرمایا! اقبال نے سندھ کے لئے کیا کیا ہے؟ کہ یہاں ان کا یوم منایا جائے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے احاطہ میں اقبال کے نام پر تقریب کا انعقاد ہی روک دیا گیا۔ جب تک سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا ان کا کوئی ترجمان وضاحت نہ کرے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ اس وقت تک ہم اس پر تبصرہ کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ سندھ یونیورسٹی میں اس قسم کے خیالات موجود ہیں۔ اور جو لوگ حکومت کے دوائر میں بیٹھ کر اس قسم کے خیالات کی پرورش کرتے ہیں ہمیں ان کے مکروہ چہرے بھی معلوم ہیں۔ ان بدباطن حضرات کا حدود اربعہ ہم سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ جو اس ذہن کو اپنے خیالات ہی کی وجہ سے ہوا نہیں دیتے بلکہ انہیں اس خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اگر یہ حوصلہ کیا اور ان کے خیالات کی سطح اتنی پست ہے تو ہمیں اس پر افسوس ہے۔ گورنر مغربی پاکستان نے دو روز پہلے ان لوگوں کو سخت انتباہ کیا ہے جو صوبائی وحدت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ گورنر مغربی پاکستان کو ان بزرجمہروں اور دانشوروں کا بھی احتساب کرنا چاہیے جو ملت کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ اور جن کی صوبائی عصبیتیں فکر و نظر کے معاملہ میں جسارت کی حد تک شرمناک ہیں۔

اب ذرا مقابلتاً ہندوستان کے سب سے زیادہ مسلمان دشمن صوبے یوپی کا حال سن لیجیے۔ اس کے دارالحکومت لکھنو میں اقبال کے نام پر دو روز کی تقریب منعقد کی گئی۔ اس کے مہمانِ خصوصی گورنر یوپی تھے۔ انہوں نے اقبال پر خالص علمی تقریر کی۔ نقطہ نگاہ ان کا اپنا سہی لیکن جہاں تک خراج کا تعلق ہے۔ انہوں نے کہا! اقبال عالمگیر ورثہ ہے۔ وہ کسی ایک جماعت یا ملک کے نہیں بلکہ سب کے ہیں۔ انہوں نے ایک فکر و نظر کا نیا ذہن عطا کیا۔ ساری روئیداد قومی آواز لکھنو میں چھپی ہے۔ اور یہ اس ملک میں ہوا ہے جہاں مسلمانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ لیکن جو ملک اقبال کے تصور سے بنا اور جس کی فکری محافظت سب سے زیادہ اقبال نے کی۔ اس کے ایک علاقہ کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا بروایت یہ حال ہے کہ وہ یوم اقبال منعقد کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ صحیح ہے تو ہم طلبا کے اس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کیا عرض کر سکتے ہیں جس نے اقبال کا نام لینا ہی اپنی حدود میں ممنوع قرار دیا ہے۔ خوش رہو میاں!

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء)

اقبال کے نام پر رقص

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی تعلیمات نے قوم کو جو ولولہ تازہ دیا ہے اس سے ہر شخص آگاہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اقبال کی تعلیمات اور ان سے مسلمانوں کے شغف کا جذبہ صادق دن بدن وسیع ہو رہا ہے لیکن بسا اوقات بعض منچلوں کی بد اخلاقی پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جنہیں لے دے کے نفس کی آلودگیاں عزیز ہیں، ہوس کی نشاط کاری کے لئے کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ لاہور میں نہ جانے کہاں (؟) بہر حال روزنامہ جنگ میں ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس میں ایک رقاصہ ٹھک ٹھک تا تھیا کر رہی ہے نیچے لکھا ہے یوم اقبال کی ایک تصویر۔۔۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

ظاہر ہے کہ یہ رقص کسی عام جگہ پر نہیں ہوا، ادھر ادھر کہیں رچا لیا ہوگا۔ اخبارات کے فوٹو گرافروں، ورنگین طبیعت کے سٹاف رپورٹروں کو اس قسم کی دلچسپیاں خود بھی عزیز ہوتی ہیں۔ آخر دن بسر کرنے، شام گزارنے، اور رات کاٹنے کے لئے کوئی مشغلہ چاہیئے۔ اچھی خبریں چھوڑ کر ان خبروں کا پیچھا کرتے ہیں۔

اقبال آج زندہ ہوتے تو جاوید اقبال کے الفاظ میں ملک چھوڑ کر بھاگ جاتے یا خودکشی کر لیتے۔ علامہ اقبال تو بے دوا اور بے علاج اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن ان کے نام پر بعض بر خود غلط لوگ فیلسوف بن گئے ہیں۔ بعض نے اپنے تن و توش کی پرورش و نگہداشت کا سرکاری توشہ خانہ سے انتظام کر رکھا ہے بیشتر اقبال کے نام پر روٹیاں توڑ رہے ہیں جہاں تک ان کی فکر کا تعلق تھا یونیورسٹی کے دانشوروں نے ایک قادیانی کو مسند اقبال کا سربراہ بنا دیا ہے۔ اب اقبال کے سوز کو رقاصاؤں کے حوالے کر کے کسر پوری کی جا رہی ہے۔

ان بے غیرتوں کو شرم نہیں آتی جو اس قسم کے اہتمام کرتے اور اقبال کے نام پر اپنے جنسی میلانات کی آسودگی کیلئے رقاصاؤں کو نچوا کر بزعم خویش پاکستان اور اقبال کی عزت میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر رسوائی اور ذلت ہے اور کوئی باغیرت قوم اسے برداشت نہیں کر سکتی ہے۔

(ہفت روزہ چٹان مئی ۱۹۶۵ء)

اقبال فروشی :-

پچھلے ۲۵ برس میں اقبال کی آڑ میں بعض معروف وغیر معروف لوگوں نے جو ناٹک کھیلا ہے۔ ہم اس ناٹک کی شکمی اغراض سے کماحقہ واقف ہیں، اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مضمون ہمارے زیر غور ہے۔ جس میں اس حقیقت کی نقاب کشائی کی جائے گی کہ اقبالؒ کے نام پر حکومت کے خزانے سے رقمیں حاصل کر کے کیا کیا گل کھلتے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں نے اپنی توندوں کو اس روپے سے ضخیم کیا ہے، ان کا حدود اربعہ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کے نام پر بعض لوگوں نے مختلف واسطوں سے صرف اپنی پرورش کی ہے۔ وہ افکار اقبالؒ کی اشاعت کرتے اور ان کے سوز و ساز رومی سے لے کر پیچ و تاب رازی کو عوام تک پہنچاتے تو ان کی جلب منفعت پر چنداں اعتراض نہ تھا۔ مگر ان لوگوں نے اقبال کی آڑ میں نہ صرف روپیہ پیدا کرنے کا ایک ڈھنگ نکالا، بلکہ بعض عجیب الخلقت مصلحتوں کے تابع افکار اقبال کو بھی سبوتاژ کیا۔

اس کہانی کی بہت سی شاخیں ہیں، لیکن اب ہم مجبور ہو چکے ہیں کہ اس عوامی دور میں افکار اقبال کے ان تاجروں کے چہروں کو ننگا کریں اور ان کے خط و خال کی بے نقابی سے عوام کو بتائیں کہ اس طائفہ میں کس قسم کے لوگ حصول زر کی خاطر شریک ہیں:۔

(۱) ہم ثقہ معلومات کے مطابق اس راز سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ کہ علامہ اقبالؒ کے بعض خدمت گزار (جنہیں خدمت گزاری کا دعویٰ ہے) میرزائی امت کے ایجنٹ کی حیثیت سے حرکت و عمل کی راہ پر قلم و زبان کی فصل کاشت کرتے ہیں۔

(۲) علامہ اقبالؒ کے نام پر نیم سرکاری اداروں کی بیشتر کتابیں، اقبال کی فکر کو سبوتاژ کرنے کی اوچھی اور شکمی حرکت کا مرقع ہیں۔

(۳) جو لوگ اپنے تئیں اقبال کا یار غار کہتے ہیں، ان میں اسی فیصد کذاب ہیں وہ صرف علامہ اقبال کی سرکار کے ہاں مخبری کرتے تھے۔

ان سب کو آئندہ اشاعت سے بے نقاب کرنے کا چٹان نے فیصلہ کیا ہے۔ انشاء اللہ

(ہفت روزہ چٹان ۷ جنوری ۱۹۷۴ء)

مزار اقبال کی توسیع

حضرت علامہ اقبال کے مزار کو توسیع دینے کے لیے مرکزی حکومت نے وزیر اعظم بھٹو کی زیر قیادت بعض افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کا اعلان کیا ہے۔ جہاں تک مزار کو توسیع دینے کا سوال ہے۔ ہم حکومت کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کمیٹی کے شریک ارکان کی فہرست کا تعلق ہے۔ ہمیں بعض مضحک ارکان کے انتخاب پر حیرت ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت میں ابھی تک کئی ایک مفلوج ذہن مقتدر بن کر بیٹھے ہیں۔ کمیٹی کے ارکان میں کئی ایک علمی ڈوم اور کئی ایک ادبی بھانڈ ہیں۔ کچھ اقبال کے دشمن ہیں۔ اور کئی اقبال کے بنیادی تصورات کی الٹ۔ کسی ملک میں اکابر کی یادگاریں قائم کرنے کے سلسلے میں اس طرز سے احباب نوازی نہیں ہوتی جس طرح ہمارے ملک کی روایت بن چکی ہے۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ان ارکان میں دو چار شخص ایسے بھی ہیں جو خلوت میں بیٹھ کر حضرت علامہ نور اللہ مرقدہ کے خلاف گالیاں بکتے ہیں۔ اور اکثر وہ ہیں کہ انہیں کلام اقبال صحیح پڑھنے کی توفیق سے اللہ تعالیٰ نے محروم رکھا ہے۔

ہم وزیر اعظم بھٹو سے عرض کریں گے کہ وہ اس کمیٹی سے ان ارکان کو نکال دیں۔ جنہیں اقبال سے اتنی ہی دشمنی ہے۔ جتنی ابولہب کو اسلام سے تھی۔ اس کے علاوہ ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ مسٹر حنیف رامے سے یہ کہنا ضروری ہو گیا ہے۔ کہ دوست نوازی کے حدود ہیں۔ آدمی تو اور بھی ہیں لیکن ہم وزیر اعلیٰ کے شکر گزار ہوں گے اگر وہ ازراہ کرم یہ بتا سکیں کہ علامہ اقبال کی تعلیمات سے متعلق جناب صفدر میر کی خدمات کیا ہیں؟ اور برخوردار پروفیسر محمد عثمان سلمہٗ اقبال سے متعلق کیا جانتے ہیں؟

وزیر اعلیٰ کی خوشامد کرنے یا دوستی کا دم بھرنے سے کوئی شخص علم و دانش کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔

(ہفت روزہ چٹان ۵ اگست ۱۹۷۴ء)

اقبالؒ کی عظمت

اقبال کی عظمت گرد و غبار کی حدوں سے منزلوں آگے نکل چکی ہے۔ جب کبھی اسلام کو نشاۃ ثانیہ کا موقع ملا اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اس پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ اسلام کو ایک دفعہ پھر کرۂ ارض میں طاقت وسطوت حاصل ہوگی۔ اس صورت میں اقبال کا نام تاریخ کے افق پر سورج کی طرح چمکے گا۔ وہ اس دور انحطاط میں مسلمانوں کے ان ذہنی محسنین میں سے تھے۔ جنہوں نے ملت اسلامیہ کے گمشدہ راستوں کا سراغ لگایا، اور جدید و قدیم کی شاہراہوں سے فکر و عمل کے خطوط تلاش کر کے مستقبل کا سنگ میل تیار کیا۔ تمام دنیا میں ان کے نام کا نقش موجود ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کے نابغہ ان کے نام اور کام سے واقف ہیں۔ ان کا چرچا بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ یہ چاندنی پھیلتی ہی چلی جائے گی۔ جو لوگ ان کے افکار کو کچلنے اور ان کے نام کو مٹانے کا پاگل پن اپنے دماغ میں رکھتے ہیں۔ وہ انشاءاللہ پٹ کر رہیں گے۔ تاہم اقبال کی عظمت کا راز قومی عظمت میں ہے۔ اور قومی عظمت اسی صورت میں نشوونما حاصل کر سکتی ہے۔ جب ہم اس امر کا تہیہ کر لیں۔ کہ حیات ملی کے جن عناصر کی اقبال نے نشاندہی کی ہے۔ ہم ان سے بہرہ مند ہوں۔ ایک حکیم اور ایک سیاستدان میں فرق یہ ہوتا ہے کہ سیاستدان اپنے مستقبل کو سامنے رکھتا، اور حکیم ملت کے مستقبل پر سوچتا ہے۔ اقبال نے حکیمانہ انداز میں سوچا۔ اور اس سوچ کے خمیر سے افکار ملی کا ایک ایسا چہرہ تیار کیا۔ جس کا ماخذ قرآن و سنت ہے۔۔۔۔۔۔ اور ہم اقبال کی عظمت کا اسی طرح اقرار و اعتراف کر سکتے ہیں۔ کہ اس کے افکار کو اپنا موقف قرار دے کر اس سے حیات تازہ کی روشنی مستعار لیں۔

اقبال روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ آب و گل میں مدتوں آرائش ہوتی ہے تب کہیں نظر و فکر کا آدمی کتم عدم سے بساطِ ہستی پر رونق افروز ہوتا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کے اس دورِ منزل میں اعلائے کلمۃ الحق کیا۔ جس عہد میں ان کا قومی وجود بالکل ہل چکا تھا۔ اور وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ اس اندھیری رات میں وہ ایک نالۂ جانگنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال مسلمانوں کی اس بیداری کے داعیوں میں سر فہرست ہیں اور ان کی عظمت کا یہی اجالا نقش ہے۔

اقبالؒ کے پیرو

پیرو کا لفظ لغوی اعتبار سے صحیح نہیں۔ اصلاً اس کا اطلاق ایک ارفع مفہوم پر ہوتا ہے۔ یہاں پیرو سے عقیدت مندوں، خوشہ چینوں اور ہمنواؤں کی جماعت مراد ہے۔ جہاں تک بازارِ عقیدت کی رونق کو بڑھانے اور گرمانے کا سوال ہے۔ اس جماعت نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ہر سال ''یوم اقبال'' بڑے اخلاص اور خاصے ہجوم کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت ایک میلے یا عرس کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے، کہ اقبال کے بارے میں عقیدت مندوں نے کسی علمی اور فکری کارنامے کا ثبوت بہم نہیں پہنچایا۔ حادثہ یہ ہے کہ جو لوگ اقبال کے نام پر حکومت کے دوائر سے رقوم و وظائف حاصل کر رہے ہیں، وہ اقبال سے زیادہ اپنے خیر اندیش ہیں۔ ان کے سامنے اپنی معاش یا اپنے رشتوں کا روزگار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال پر جس پائے کی تحقیقی اور علمی کتابوں کے ترتیب پانے کی ضرورت ہے۔ وہ عنقا ہونے کی حد تک ناپید ہیں۔ اور جو کچھ زود نویسوں کی عاجلانہ طبیعتوں کے باعث ان اداروں کی معرفت بازار میں آیا ہے۔ ان میں اصل اقبال گم ہے۔ اور اس کی جگہ ایک ایسا اقبال موجود ہے۔ جو سلبی طبیعتوں کی خواہشوں کا مرجع ہے۔

اقبال کے نصب العین کی اصل سے ان کے عقیدتمندوں کا پورا حلقہ غافل ہے۔ یا پھر وقتی مصلحتوں کے تحت مداہنت کا شکار------ کیونکہ اقبال ''مشرق'' کے حلیف اور مغرب کے حریف تھے۔ وہ دونوں کے تصادم میں مشرق کی نشاۃ ثانیہ کے قائل تھے۔------ یہ مذاق کی انتہا ہے کہ جن لوگوں نے ان کے گرد ارادت کا حلقہ باندھ رکھا ہے۔ وہ نہ صرف مغرب کی بالادستی سے مرعوب ہیں۔ بلکہ خود سپردگی کا انداز اختیار کر چکے ہیں۔ اس کیمپ نے اثباتی نتائج کی کوئی کہاں تک توقع کر سکتا ہے؟ اور بازارِ عقیدت میں چہل پہل بڑھانے کا مقصد یہ ہے کہ حقیقت کو افسانہ بنا کر اپنے آپ کو اس میں گم کر دیا جائے۔------

ضرورت ہے کہ ہم لوگ اقبال کے بارے میں اپنے حجرہ ارادت کی تنہائیوں پر غور کریں ---- اور میدان افکار میں سینہ سپر ہو کر اسلام کو اپنے دلوں کی گرمی اور دماغوں کی توانائی سے تائیدی قوت بہم پہنچائیں۔ تاکہ حیات ملی کا بجھا ہوا چراغ دوبارہ روشن ہو۔

افکار اقبال سے متعلق ایک سوال

علامہ اقبال میوزیم منعقدہ لاہور سے دانشوروں کے علاوہ چوہدری فضل الٰہی صدر پاکستان، مسٹر محمد حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب اور ملک معراج خالد وفاقی وزیر قانون نے خطاب کیا۔ ہم نے تینوں مقررین کی تقاریر نہایت غور سے پڑھی ہیں۔ المختصر یہ کہ معنوی اعتبار سے نہایت عمدہ ہیں۔

چوہدری فضل الٰہی نے کہا۔

(۱) ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ وفاداری کا عہد کریں اور اس عہد کو محض قول ہی نہیں اپنے عمل سے نبھائیں۔

(۲) اگر ہم فکر اقبال کو نئی نسل کی گھٹی میں ڈال دیتے تو آج ہر طرف صرف اعتماد کی فضا ہوتی۔ ہمیں کوئی سا خطرہ یا تذبذب نہ ہوتا۔

(۳) اب بھی وقت ہے کہ ہم فکر اقبال کا احیاء کریں۔ اسی فکر نے ہمیں تصور پاکستان بخشا تھا۔ حضرت علامہ اقبال کے نزدیک معاشرتی و معاشی انصاف کے لیے اسلامی معاشرہ کا قیام ضروری ہے۔

(۴) علامہ اقبال کے فکر ہی کی روشنی میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب نے کہا

۱۔ اسلام نے اجتہاد کے دروازے بند نہیں کیے بلکہ قرآن حکیم کو خود ایسی حیثیت حاصل ہے جس کا درجہ آئین کا ہے۔ علامہ اقبال عصر حاضر کے مطابق اسلامی فقہ مرتب کرنا چاہتے تھے۔ عمر نے انہیں مہلت نہ دی۔

۲۔ اسلام اپنے اندر عصر حاضر کے مسائل کا حل رکھتا ہے۔ دین اور وطن کا وہی تعلق ہے جو بدن اور روح میں ہوتا ہے۔ وطن بدن ہے، دین روح، پاکستان بدن ہے، اسلام اس کی روح۔

۳۔ نوجوان پود کو چاہیے کہ اسلام کی تعلیمات پر سختی سے عمل کرے اور قرآن کی تعلیمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے۔

۴۔ اقبال ہر دور کا شاعر اور مستقبل کا خضر راہ ہے۔

۵۔ اقبال تمام جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک ہی وحدہ لاشریک کی طرف رجوع کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

۶۔ اسلام ہر لحاظ سے سوشلزم اور بالشویزم سے فائق اقتصادی نظام کا حامل ہے۔

ملک معراج خالد وفاقی وزیر قانون نے کہا

۱۔ حکیم الامت کی فکر پر عمل کر کے اور ان کی فکر کو اپنا کر ہی ملت اسلامیہ اپنی عظمت رفتہ بحال کر سکتی ہے۔

۲۔ ملک کے نوجوان کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کے چپہ چپہ کو تعلیمات اقبال سے منور کر دیں۔

۳۔ حکیم الامت کی تعلیمات کا ماخذ قرآن ہے۔ انکی فکر اسلامی ہے۔ ہمیں ان کی تعلیمات کو جزو ایمان بنانا ہوگا۔

۴۔ آپ نے دوسرے صوبوں میں یوم اقبال کی تعطیل کے نہ کئے جانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ واقعہ انتہائی شرمناک ہے۔

سوال صرف ایک ہے کہ مقتدرین کے ان اجلے خیالات کے بعد وہ کونسی روک ہے جو پاکستان کو اسلامی معاشرہ بنانے کی راہ میں مزاحم ہے؟

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۱۲ مئی ۱۹۷۵ء)

دوسرا باب : نقد و نظر

- ☆ فکرِ اقبال
- ☆ ذکرِ اقبال
- ☆ شعرِ اقبال
- ☆ اقبال کے آخری دو سال
- ☆ اوراقِ گم گشتہ
- ☆ تلمیحات اقبال
- ☆ اقبال اور تہذیب مغرب
- ☆ عطیہ فیضی کے خطوط
- ☆ اقبال اور بھوپال
- ☆ اقبال اور حیدر آباد

فکرِ اقبال

فکرِ اقبال۔ خلیفہ عبدالحکیم کے قلم سے ۱۸×۲۳/۸ سائز کے ۸۶۵ صفحات کے تجزیاتی کتاب ہے، جس میں اقبال کے فکر کا جائزہ لیا گیا، ان کے ماخذ تلاش کیے گئے اور کلام اقبال کی مختلف خصوصیتوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ خلیفہ صاحب نے اپنی تمہید میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''روحِ اقبال'' کے جامع و مانع اور فصیح و بلیغ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی لکھا ہے کہ ''اقبال کے افکار میں اتنی گیرائی اتنی پرواز اور اتنی وسعت ہے کہ مزید تصنیف کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔'' خلیفہ صاحب نے فکرِ اقبال کو موضوع کے اعتبار سے جامع تو نہیں کیا تخمیم ضرور کیا ہے اور آخری ۱۴۴ صفحات میں تشکیل جدید الٰہیات کا خلاصہ دے دیا ہے

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے اس کتاب پر بیس ہزار روپے معاوضہ وصول کیا، جو اقبال سے متعلق یقیناً کسی مصنف یا مؤلف نے کبھی حاصل نہیں کیا۔ اس لحاظ سے خلیفہ صاحب سرِ فہرست اقبالی تھے۔ گو بزمِ اقبال لاہور کا سرکاری ادارہ تھا، لیکن اس کے کرتا دھرتا خلیفہ عبدالحکیم ہی تھے، خلیفہ صاحب قیامِ پاکستان کے ڈیڑھ دو سال بعد حیدر آباد سے سبکدوش ہو کر لاہور پہنچے تو ملک غلام محمد (تب وزیرِ خزانہ پھر گورنر جنرل) سے عہدِ ریاست کے دوستانہ تعلقات کی بنا پر دو لاکھ کی سالانہ امداد لے کر ادارہ ثقافت اسلامیہ اور بزمِ اقبال قائم کی۔ ان کے تحت جو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۹۰ فی صد قلم کے اسراف پر سرکاری روپے کا سوءِ استعمال تھا۔

خلیفہ صاحب نے سب سے پہلے تحریکِ ختم نبوت (۱۹۵۳ء) کے زمانے میں ''اقبالؒ و ملا'' کے نام سے کتابچہ لکھا، جس میں ملا کی آڑ لے کر اسلام کی بھد اڑائی، اقبال کے اشعار کی غلط توجیہیں کیں اور اس طرح لغویات کا ایک پلندہ تیار کیا۔ اس کتابچہ کے پس منظر میں ایک تو حکومت کا لادینی طائفہ تھا، جس کا سرغنہ خود ملک غلام محمد تھا، دوسرے اس میں قادیانی امت کی خواہشوں کا دخل تھا۔ مرزا بشیر الدین خلیفہ صاحب کے ملاقاتی تھے ان کی سوانح عمری مصنفہ ممتاز اختر مرزا شائع کردہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے صفحہ ۷ پر چھپے لطیفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب عموماً ملک غلام محمد اور سر ظفر اللہ خاں سے ملاقات کرتے اور راز و نیاز فرماتے تھے۔

اقبال کا ملا وہ ہے جو دین کے فہم سے محروم ہے، لیکن ملا کہلاتا ہے۔ وہ ملا ہرگز نہیں، جس کی تاریخ مسندِ رسول کا صحیح وارث ہونے کے باعث قربانی و استقامت کی تاریخ ہے، خلیفہ صاحب نے دین کے ان عظیم نمائندوں کو اقبالؒ کے ملا میں لپیٹ کر، نہ صرف استہزاءِ اسلام کا جرم کیا بلکہ روحِ اقبال کو بھی ناخوش کیا۔ اس

کتابچے کے بہت سے ایڈیشن شائع ہوئے، لیکن اس کی ایک بڑی تعداد تحریکِ ختمِ نبوت کے استبدادی زمانے میں حکومت نے مفت تقسیم کی۔ دوسری بڑی تعداد ربوہ نے خرید کر قادیانی گماشتوں کی معرفت مختلف لوگوں کو ارسال کی۔ اس کی انفرادی خریداری پانچ فیصد سے نہیں بڑھی، اس کتابچے کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خلیفہ صاحب نے دینِ قیم سے تلعب کیا، اور علمائے حق کی اہانت کی۔

فکرِ اقبال متضاد خیالات کے مختلف المعنی مقالات کا مجموعہ ہے۔ کوئی مربوط کتاب نہیں۔ ہر باب کا موضوع الگ ہے۔ اول تو ایک ہی موضوع میں کئی ٹکراؤ ہیں، لیکن ہر باب میں دوسرے باب کی تغلیط بھی ہے۔ خلیفہ صاحب کے سوانح نگار ممتاز اختر مرزا کے نزدیک:

''اقبال کے بعد خلیفہ صاحب کے فلسفہ و فکر کو دنیائے اسلام میں اہم مقام حاصل ہے، اور ان کی ہمہ جہت شخصیت فلسفہ، ادب، تاریخ اور مذہب غرضیکہ علوم و فنون کے بے شمار گوشوں پر حاوی نظر آتی ہے۔''

لیکن خلیفہ صاحب کی یہ خصوصیت کہاں ہے؟ اور اقبالؒ کے بعد انہیں یہ مقام کیونکر حاصل ہوا؟ ممتاز اختر نشان دہی فرماتے تو بہتر ہوتا، حقیقت بس اتنی ہے کہ خلیفہ صاحب نے حیدر آباد دکن کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد لاہور میں سرکاری زراعانہ کی سالانہ یافت سے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور بزمِ اقبال قائم کیں اور اپنے وجود کی نمائش کے لیے ایک خود ساختہ قافلہ کے سرخیل ہو گئے۔ اقبال سے ان کے مراسم کا طول و عرض کیا ہے؟ ایل ایل بی کیا تو اپنے بزرگوں کی معرفت اقبال سے سفارشی خط لے کر عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہو گئے۔ وہاں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک ملازمت کی۔ پھر ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وظیفہ لے کر ۱۹۲۵ء میں بعدِ مراجعت عثمانیہ یونیورسٹی ہی میں شعبہ فلسفہ سے منسلک ہوئے اور ۱۹۴۳ء تک وہاں رہے وہاں سے امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل ہو کر گئے۔ اور ۱۹۴۷ء تک ملازمت کی۔ سری نگر سے حیدر آباد لوٹ کر ۱۴ جون ۱۹۴۹ء تک ملازم رہے۔

قیامِ پاکستان کے دو سال بعد لاہور تشریف لائے۔ اقبال سے ان کا تعلق کب تھا؟ اگر ان کے نام اقبال کا کوئی خط ہوتا تو وہ ضرور کسی مجموعے میں شامل کراتے یا خود چھاپتے اور اگر بہت سے خطوط ہوتے تو انہیں کتاب بنا دیتے، لیکن راقم کے علم میں ایسا کوئی خط نہیں، البتہ علامہ اقبال کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال کے پاس بہت سے خطوط محفوظ ہیں جو علامہ کے نام مختلف افراد لکھتے رہے، ان میں خلیفہ صاحب کے بھی دو چار خط ہیں۔ ان میں خلیفہ صاحب نے خدا کی ہستی سے انکار کیا ہے اور ایسی ہی بعض دوسری باتیں لکھی ہیں۔ اگر اقبالؒ نے جواب دیا تھا تو لازماً ایسا ہوگا کہ خلیفہ صاحب شائع کرانے کا حوصلہ ہی نہ کر سکے ہوں۔ اگر

جواب نہیں دیا تو ظاہر ہے کہ اقبال خلیفہ صاحب کو لائقِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے، خلیفہ صاحب کے لیے پاکستان میں اپنے خیالوں پر زندگی گزارنا مشکل تھا، انہوں نے اقبال کا سہارا لے کر اپنی ذات کا ناد پھونکا۔ معلوم ہوتا ہے خلیفہ صاحب ژولیدہ مغزی کا شکار تھے اور اسی کا بدیہی نتیجہ ان کی ژولیدہ بیانی ہے۔ وہ اقبال کے گن گاتے، اور بڑی اونچی سروں میں اس کی عظمت کا نغمہ چھیڑتے ہیں، لیکن کلامِ اقبال کے عناصرِ خمسہ کی چھتاز بھی کرتے ہیں۔ انہیں یا تو احساس ہی نہیں رہا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں یا اقبال کے فہم و فکر سے نابلد تھے یا پھر اس کی عظمت پر اپنی عظمت فائق کرنا چاہتے تھے۔

''اقبال اور ملا'' کے متعلق عرض کیا کہ ''مجموعہ خرافات'' ہے لیکن فکرِ اقبال کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) اسلام کے متعلق ان کی معلومات سطحی تھیں۔

(۲) انہیں شاید قرونِ اولیٰ سے للّٰہی بغض تھا، یا وہ اس دور کی عظمت ہی سے آگاہ نہیں تھے۔

(۳) یورپ کے مادی غلبے، اور ذہنی بازیچے سے انہیں غایت درجہ وابستگی تھی۔

(۴) انہیں علماء کے ادارے سے تنفر تھا۔ غالباً اسی وجہ سے ان پر بے لگام تبرّی بازی کی ہے۔

(۵) اہلِ صفا سے قلبی و قلمی عداوت رکھتے تھے۔

(۶) شاید جانتے تھے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا مقامِ ادب کیا ہے، ان کا قلم بے احتیاط تھا، حضور ﷺ کے تذکرے میں الفاظ کے چناؤ کا انہیں سلیقہ ہی نہ تھا۔

(۷) یورپی دانش و تہذیب سے لگاؤ تھا، اور اس کے لیے احترام و اعتراف کے جذبات رکھتے تھے۔

(۸) غلط زبان لکھتے اور محاورہ و روزمرہ سے بیگانے تھے۔

(۹) کج مج تعبیریں کرتے اور مریز و کجدار قسم کا اسلوب رکھتے تھے۔

(۱۰) قدماء کے اشعار میں الفاظ کا غیر ارادی حک و اضافہ فرماتے اور محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ اس موضوع پر کن لوگوں سے ہمکلام ہیں۔

(۱۱) اقبال کی بصیرت پر فرنگی دانشوروں کی چھاپ لگائے بغیر اقبال کے بنیادی تصورات کو تسلیم نہیں کیا۔

(۱۲) ''فکرِ اقبال'' میں اول تا آخر وحدتِ بیان کا فقدان ہے۔

(۱۳) انہیں اسلامیات سے رسمی شغف تھا۔

(۱۴) اقبال کے افکار کی معنوی روح سے کاملاً بیگانہ رہے۔

(۱۵) انگریزوں کے دور سے ابلہانہ عشق تھا۔

(۱۶) اسلاف کا تذکرہ بے ادبی سے کرتے تھے۔

(۱۷) تمام کتاب فی الجملہ بات کہنے پر غیر ضروری اعتماد، لیکن بات نہ کہہ سکنے کے عجز کا شہ پارہ ہے۔

(۱۸) ان کی سیاسی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یا تو ان کے جیب و داماں خالی تھے یا ان معلومات کو حسب حال نہ پا کر چپ سادھ لیتے تھے۔

(۱۹) مطالعہ مشرق کی لطافتوں سے محروم لیکن مطالعہ مغرب کی غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے تھے، لیکن مغربی دانش سے ان کا دماغ سوءِ ہضم کا شکار تھا۔

پہلا باب، ''اقبال کی شاعری کے ارتقائی منازل پر'' ہے، آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

''راقم کو علامہ کے والد شیخ نور محمد سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جس زمانے میں علامہ اقبالؒ انارکلی میں رہتے تھے وہ در حقیقت اسم با مسمٰی تھے۔ نور محمدی ان کے چہرے پر متجلی تھا۔ ایک محمدی کیفیت ان میں یہ تھی کہ وہ نبی امی کی طرح نوشت و خواند کے معاملے میں امی تھے۔''

اس سے قطع نظر کہ جملوں کی ترتیب ہی غلط ہے، خلیفہ صاحب حضور ﷺ (فداہ امی و ابی) کے ادب احترام کی حدوں سے پھسل گئے ہیں، انہیں معلوم ہی نہیں کہ اسم با مسمٰی کے معانی کیا ہیں۔ فرماتے ہیں: ''ایک محمدی کیفیت ان میں یہ تھی'' گویا ان میں کئی ایک محمدی کیفیتیں تھیں اور وہ کیا کہ نبی امی کی طرح نوشت و خواند کے معاملے میں امی تھے۔ ایک چیز ہے سہو، ایک ہے جہالت۔ خلیفہ صاحب جہالت کا شکار ہوئے ہیں۔ انہیں ''طرح'' کے معنی معلوم ہوتے تو کبھی شیخ نور محمد کو حضور ﷺ کی طرح امی نہ لکھتے، لیکن خلیفہ صاحب کا اسلام چونکہ جبلی تھا اور دماغ افرنجی اس لیے حضور ﷺ کے مرتبہ و مقام سے نابلد تھے۔ اور نہ انہیں معلوم تھا کہ حضور ﷺ کا نام لکھتے وقت ﷺ کا اشاریہ لکھتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے ساری کتاب میں کہیں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ

چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست

فکر اقبال کا ہر باب تجزیہ و تنقید کا مستحق ہے۔ لیکن چند ہی باتوں کی نشاندہی سے پوری کتاب سامنے آ جاتی ہے اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب نے کیا لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی عظیم شخصیت کے مینار پر کھڑے ہو کر انہوں نے اقبالؒ کی تغلیط کی اور ان کی منزلت کا راگ چھیڑ کر اپنے خیالات کے اندھیروں میں ناک ٹوئیاں ماری ہیں۔ اگر کلامِ اقبال اور افکارِ اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوتا تو

علمیات کے ویرانے میں چہل قدمی نہ کرتے۔ اقبال کو اقبال ہی کے مقام سے پیش کرتے، لیکن بہت کچھ لکھنے کے باوجود وہ نظریاتِ اقبال کا ادراک نہیں رکھتے، اور نہ انہیں تصوراتِ اقبال کے حدود سے آگاہی ہے۔

اقبال کے مستند مجموعوں میں کل بارہ ہزار چار سو اکانوے (۱۲۴۹۱) اشعار ہیں۔ جن میں چورانوے اشعار اور ایک مصرعہ دوسرے شعراء کے ہیں۔ راقم نے ۱۹۳۰ء میں کلامِ اقبال کا مطالعہ شروع کیا اور آج اس کو پینتالیس برس ہوتے ہیں۔ راقم کے نزدیک کلام اقبال کے عناصرِ خمسہ حسب ذیل ہیں:

اولاً۔ خودی۔ اقبال نے مختلف مقالوں اور بعض خطوں میں بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک خودی کا مطلب ہے احساسِ نفس، معرفتِ حق اور تعینِ ذات۔ ان کے اپنے الفاظ میں خودی کا عرفان قرآن کے سوا اور کہیں نہیں۔ کیونکہ حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔

ثانیاً۔ مشرق کی نشاۃ ثانیہ! اس بارے میں ان کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب کے بطلان اور مشرق پر ایقان سے ایشیا کو نئی زندگی مل سکتی ہے۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر ''ہمایوں'' سے علامہ نے فرمایا تھا کہ ''وسطِ ایشیا کے دل پر ایک پپڑی جمی ہوئی ہے۔ میں اس کو صاف کر دینا چاہتا ہوں۔''

ثالثاً۔ توحید و رسالت کی اصل پر اسلام سے غیر متزلزل وابستگی!

یہ گویا ان کے افکار کی مرکزی روح ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ہی وہ سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں۔ وہ توحید اور ختمِ نبوت کو مسلمانوں کی وحدت کا اساسی محور قرار دیتے اور فرماتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کی نفی پوری عمارت کو ڈھا دیتی ہے۔

رابعاً۔ تنقیدِ مغرب۔ ان کے نزدیک مغرب اپنے عروج و اقبال کے باوصف تقلید کا نہیں، تنقید کا مستحق ہے۔ فرماتے ہیں: اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز مغرب کے ہر نوعی استیلاء اور ہمہ جہتی اقتدار کی تباہی پر ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے، اور مغربی کالجوں میں پڑھے ہوئے نوجوانوں کو وہ روحانی اعتبار سے فرومایہ سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو خطوط بنام سید سلیمان ندوی و عبد الماجد دریا بادی)۔ ''تشکیلِ جدید الہیات'' کے چھٹے خطبے میں فرماتے ہیں کہ یورپ سے بڑھ کر انسان کے اخلاقی ارتقاء کی راہ میں بڑی رکاوٹ کوئی نہیں ہے۔

خامساً۔ عشق کی پختگی اور عقل کی خامکاری۔

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

شاطبی کے الفاظ میں، ان کا خیال تھا کہ فکر کو حق کی، علم کو یقین کی، اور عمل کو محکم اساس کی ضرورت ہے، جب یہ تینوں خصائص فرد یا جماعت میں تحریک کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کا اجتماعی پیکر عشق سے جلا پاتا ہے، ان کے کلام میں جہاں آرزو کا لفظ آیا ہے اس سے مراد عشق ہے، اور جہاں جستجو کا لفظ آیا ہے وہاں اس کا مطلب عقل ہے۔

''فکر اقبال'' شروع سے آخر تک کلامِ اقبال کے ان عناصر خمسہ کی تشریحات وتصریحات سے محروم ہے۔ اگر ان کے مطالب ومعانی پر کہیں گفتگو کی ہے تو وہ اقبال کی مندرجہ بالا تصریحات وتوضیحات کے الٹ ہے، خلیفہ صاحب نے اقبال کے طائرِ افکار کو اپنے بال وپر دے کر اڑانا چاہا ہے۔ نتیجۃً پرواز میں کوتاہی محسوس ہوتی ہے۔

ساتواں باب۔ مغربی تہذیب وتمدن پر علامہ اقبال کی تنقید کے عنوان سے ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰۱ پر فرماتے ہیں۔

''اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے، اور یہ مخالفت ان کے رگ وپے میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا وبے جا اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ اثر ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت وعرفان، تصوف اور ذوق وشوق کے اشعار کہتے کہتے یونہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بال جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں۔ اکثر اشعار میں حکمت اور عشق کی دلکش آمیزش ہے، لیکن اچھے اشعار کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بے زاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے صاحب ذوق انسان کو دھکا لگتا ہے کہ عیوب سے لبریز سہی، لیکن یہاں اس کا ذکر نہ ہی کیا جاتا تو اچھا تھا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفا آب رواں کا لپ جو بیٹھے لطف اٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بیک ایک مردہ جانور کی لاش بھی تیرتی ہوئی سامنے آ گئی۔ ایک غزل کا مطلع ہے کہ

ایک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

اس کے باقی اشعار بھی اسی طرح بلند پایہ ہیں، لیکن چلتے چلتے ایک یہ شعر بھی فرما دیا جس میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھی متہم کیا ہے۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

اور کئی غزلوں میں بھی یہی کیفیت ہے کہ بات کچھ بھی ہو رہی ہو لیکن ضرب لگانے کے لیے فرنگ کا ذکر لازمی ہے۔

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

علامہ اقبال کی وہ غزل۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

خلیفہ صاحب کے نزدیک ''اسرار الہیہ کا خزینہ ہے'' لیکن ان کے نزدیک ایسی عرفانی غزل میں بھی مقطع سے پہلے فرنگ پر ٹھوکر لگانا لازمی سمجھتے ہیں۔

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

اور خلیفہ صاحب کو یہی ناگوار ہے۔ اسی باب کے صفحہ ۲۱۵ پر لکھتے ہیں کہ:

''مغرب کے خلاف اقبال نے اس قدر تکرار کے ساتھ لکھا ہے کہ پڑھنے والا اس مغالطے میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ اقبال بڑا مشرق پرست جامد ملا اور رجعت پسند ہے۔''

خلیفہ صاحب نے صفحہ ۲۱۷ پر لکھا ہے کہ:

''فرنگ کے ہر قریہ کو فردوس کی مانند دیکھ کر اس کا یہ جی چاہتا ہے کہ ہماری بستیاں بھی جنت کا نمونہ بن جائیں۔ یورپ کے کافروں کو وہ اپنے مسلمانوں سے زیادہ عملاً اسلام کا پابند سمجھتا ہے اور یورپ کو اس زندگی کی جو نعمتیں حاصل ہوئی ہیں ان کو وہ اسی اسلام کا اجر شمار کرتا ہے، جو ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں میں پایا جاتا ہے۔''

خلیفہ صاحب کی ایک اور اپچ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

''مشرق مدت سے فرنگ کے سیل بے پناہ میں بہہ رہا ہے۔ اب اقبال کی پیشگوئی ہے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیل بے پناہ میں ہے

چلو قصہ تمام ہو، ''ہم تو ڈوبے تھے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔''

خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ خلیفہ صاحب نے اقبال کو پیش کیا ہے یا اقبال کی اوٹ میں اپنے تئیں پیش کیا ہے۔

جہاں تک محولہ اقتباسات کا تعلق ہے، خلیفہ صاحب انشا کے اصولوں سے واقف ہی نہیں، چونکہ وہ کوئی انشاء پرداز نہ تھے اس لیے ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں۔ لیکن افرنگ کا دفاع خلیفہ صاحب کے فہم کا فتور تھا، یا وہ سرسید کے الفاظ میں مسلمان انگریز تھے کہ دین کے علماء و فضلاء کی توہین کے لیے کلامِ اقبالؒ کو توڑ موڑ کر پیش کرنا ان کا شعار تھا۔ فرنگ سے متعلق فرمودۂ اقبالؒ ان کے نزدیک مسخرا پن تھا، اور مغرب پر ان کی تنقید پسند نہ کرتے تھے۔

خلیفہ صاحب مبادیاتِ اقبالؒ سے آگاہ ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ یورپ نے معاشرۂ انسانی کے لیے کن مہلک عوارض کو جنم دیا ہے اور اس کے فکری استیلاء نے اس کے مادی استبداد کی معرفت نسلِ انسانی پر کیا ستم ڈھائے ہیں۔

اقبال کی مغرب پر تنقید اس دور کی سب سے بڑی ضرورت تھی اور ہے، یہ اقبالؒ کے طرزِ مخاطبت کی معراج ہے کہ وہ مختلف زاویوں سے مغرب کی اجتماعی مضرتوں پر حملہ آور ہوتے اور مسلمانوں کے انفرادی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں۔ اقبال جس معاشرہ میں اسلامی مفکر تھے، وہ یورپی استیلا کا معاشرہ تھا، وہ اس معاشرے کے نکتہ چیں نہ ہوتے تو پھر ان کی دعوت کا میدان کہاں تھا؟ اور عامۃ المسلمین کے لیے جدوجہد کے خطوط کیا تھے؟

مشرق اسلامی روایات کا مرجع تھا، خلیفہ صاحب کو اس کے انحطاط و ادبار کا اندازہ ہوتا یا ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا احساس کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اقبالؒ نے افرنگ پر تنقید کی تو یہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ناگزیر تھا۔ جس طرح پتھروں کے بغیر پہاڑوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح فرنگ کی بالادستی کو چیلنج کیے بغیر مشرق کے مرعوب ذہن کو، اس حصار سے نکالنا مشکل ہے۔ علامہ اقبال نے یورپی دانش و حکمت کے خلاف احتجاج کیا تو سبب یہ تھا کہ جدید مسلمان ان کا شکار ہو چکے تھے۔ خلیفہ صاحب بھی اسی دانش و حکمت کا ایک صید تھے۔

''فکرِ اقبال'' کی سیاسی و تاریخی غلطیوں کا شمار کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن مصنف کی کجرویوں کا مختصر جائزہ ساری کتاب کا چہرہ نما ہے۔ اس کے علاوہ خلیفہ صاحب نے کئی ایک فروعی

غلطیاں کی ہیں۔ فرماتے ہیں:

''سید احمد خاں اور ان کے شرکاءِ کار شبلی، حالی، چراغ علی، نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر محسوس کرتے تھے کہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون ہی نہیں بلکہ اخلاق کے معیار بھی مغرب سے حاصل کرنے چاہییں۔''

کیا ان سب پر یہ بہتان نہیں؟ شبلی، حالی، اور نذیر احمد، یورپ سے مرعوب و مغلوب تھے تو پھر مسلمانوں کا خدا حافظ تھا۔ خلیفہ صاحب نے سالک و عابد کی طرح اقبال کی سیرت پر بہ الفاظِ ذیل کرم فرمائی کی ہے:

''اقبال رندی اور شباب کے زمانے میں بھی عاشقی کے معاملے میں ''کردے وگزشتے'' ہی تھا، اور ''دل بکسے بہ باختہ'' میں اپنی نسبت صحیح بات کہی ہے ''وہ مصری کی مکھی تھا شہد کی مکھی نہ تھا۔'' (صفحہ ۲۷)

خلیفہ صاحب لکھتے ہیں کہ

''اقبال کے نزدیک جنت یا دوزخ مقامی نہیں بلکہ نفسی ہیں۔''

یہ خیال کہاں سے اخذ کیا ہے؟ خلیفہ صاحب فرما دیتے تو ہم ان کے شکر گزار ہوتے، لیکن اپنے خیالات کو اقبال کے سر منڈھنا ابلہانہ جسارت ہے۔

معلوم ہوتا ہے خلیفہ صاحب کا مطالعہ محدود و مختصر تھا۔ انہوں نے اقبال کو پڑھا ضرور تھا لیکن غور نہ کیا تھا، ان کی نگاہ سے اقبال کی خطبات و بیانات اور خطوط و مقالات گزرے ہوتے تو فکرِ اقبال کے فہم و شعور میں آسانی ہوتی، وہ یورپ سے فلسفہ پڑھ کے آئے تھے، اور اسی فلسفے کے برعظیم کی دو بڑی ریاستوں میں مدرس رہے تھے، ان کے لیے اقبال محض ایک شاعر تھا۔ اس کی فکر کو شاعری کی ترازو میں تولتے رہے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ حقائقِ اسلامیہ کیا ہیں؟ اقبال کا مطمحِ نظر کیا تھا؟ اس کی ذہنی سرگزشت کیا ہے؟ اس کے ماخذ کیا تھے؟ اس کی آرزو کیا تھی، اور اس کی جستجو جن مراحل سے نکلی اور کہاں تک پہنچی؟ خلیفہ صاحب نے محسوس ہی نہ کیا کہ اقبال کے شب و روز میں ''پیچ و تابِ رازی'' کی امنگ اور ''سوز و سازِ رومی'' کی ترنگ کے احوال کیا ہیں؟ انہیں اقبالؒ کے متعلق یاد رہا تو اس قدر کہ لہو و لعب کی زندگی میں کردے وگذشتے قسم کے انسان تھے، اقبال نے عرشی سے کہا تھا ''افسوس ہم اچھے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے۔'' خلیفہ صاحب نے فکرِ اقبال لکھ کر اپنے ذہنی افلاس سے اس کی توثیق کی، وہ اندازہ ہی نہیں کر پائے کہ اقبال نے کہاں سے کیا بات کہی ہے اور ان کے کلام میں تضاد نہیں تنوع ہے۔ ان کے ذہن کا انحصار ذرائع علم کے یورپی ماخذ پر نہیں تھا۔ ان کے نزدیک ازروئے قرآن علم کے چار ذریعے تھے:

دوسرا: علم النفس، جس کا آغاز فی انفسکم افلا تبصرون سے ہوتا ہے۔

تیسرا: صحیفۂ فطرت۔

خلیفہ صاحب نے ان حقائق سے نابلد ہونے کے باعث فکر اقبال کو اپنے ذہن کی غرابت سے مجروح کیا ہے۔

اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور کے صدارتی خطبہ (۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء) میں کہا تھا کہ:

''ہم اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہیں اور ساتھ ہی فرمایا کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے ہر وقت اپنا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے اور یہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کو قبول کرنے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ یاد رہے کہ عصبیت سے مراد قومی پاسداری ہے۔''

خواجہ عبدالوحید سے فرمایا: تہذیب مغربی تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہوگا۔ (ملفوظات)۔

روزگار فقیر حصہ دوم کے مصنف نے صفحہ ۱۸۵ پر علامہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ یورپ کی بنی ہوئی چیزیں خوبصورت ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں اخلاقی زہر ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب نے اس ظاہری حسن سے مرعوب ہو کر کلامِ اقبالؒ کے باطنی اضطراب کو محسوس نہیں کیا، بلکہ مغرب پر ان کی تنقید و علمی لحاظ سے قتلِ عمد قرار دیا ہے۔ رہا یہ الزام کہ اقبال یورپ کے حکماء میں سے فلاں فلاں کے خوشہ چیں تھے تو خلیفہ صاحب اور ان کے رفقاء نے اپنی ذہانت کا اسلحہ چھوڑ کر اقبال کے اس اعلان پر رکیک حملہ کیا ہے۔ جو اسرار و رموز کی معرفت بارگاہِ رحمۃ اللعالمین میں ایک عرضداشت ہے:

اے بوصیری را ردا بخشندہ
بربطِ سلما مرا بخشندہ
گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اقبال کو اندازہ ہو گیا تھا مبادا اس کے چمنستانِ فکر کے گلاب و یاسمین مغرب کی صرصر سے تاراج کیے جائیں۔ انہوں نے پیش بندی کی اور فرمایا:

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود!
ولیکن کس ندانند ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اور غالباً خلیفہ صاحب ایسے عبقریوں کی ذہانت ہی کے لاشعور پر کہا تھا:

زمن گیر ایں کہ مرد کور چشمے
زبینائے غلط بینے نکو تر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش
ز دانشمند بے دینے نکو تر

ذکرِ اقبال

''ذکرِ اقبال'' مولانا عبدالمجید سالک کے قلم سے علامہ اقبال کی سوانح عمری ہے۔ ناشر بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور، سائز ۲۲/۸×۱۸ صفحات ۲۹۶ سال اشاعت ۱۹۵۵ عیسوی۔

مولانا سالک ایک باغ و بہار ادیب تھے۔ ان کے سیاسی خیالات سے قطع نظر انہیں قلم پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی سیرت میں کوئی ایسا داغ نہ تھا جس سے یہ محسوس ہو کہ وہ کسی کو زخم لگانا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال سے انہیں ایک گونہ عقیدت تھی۔ ذکر اقبال کے ''عرض حال'' میں لکھتے ہیں کہ ''پچیس برس تک انہیں خود بھی علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا۔'' اقبال کا ذکر چھڑتا تو ان کا تذکرہ نہایت تپاک سے کرتے۔ راقم نے ان سے بارہا عظیم معلومات حاصل کیں۔ علامہ سے متعلق ان کے دل و دماغ میں احترامات فائقہ تھے لیکن ''ذکر اقبال'' مرتب کرتے وقت ان کا پر بہار قلم حدود انشاء پھاند گیا اور بعض اڑتی ہوئی روایتوں اور حکایتوں کے ہو گئے جو ان کے دوستوں نے بیان کیں اور انہیں سوانح میں شامل کر لیا۔ شاید ان کے علم میں نہ تھا کہ بعض حلقوں نے اقبال کی سیرت کو داغدار کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اور وہ اقبال کے حکیم الامت ہونے کا تصور پاش پاش کرنا چاہتے ہیں۔ قادیانی اس مہم میں اندر خانہ پیش پیش تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود سے مولانا سالک کا میل ملاپ تھا۔ مولانا کے والد قادیانی تھے اور سگا بھائی بھی قادیانی تھا غالباً اسی باعث مولانا قادیانیت سے متعلق متشدد نہ تھے لیکن نجی محفلوں میں مرزا غلام احمد کی ''پھبتیوں'' سے چٹخارے کرتے۔ تعجب ہے کہ ذکر اقبال میں میرزا کو سہارا دیا اور دو ایک مضحک باتیں علامہ سے اس طرح منسوب کی ہیں گویا ان کا تعلق فی الواقعہ سوانح اقبال سے ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور علامہ اقبالؒ برعظیم میں اپنے دور کے عظیم مسلمان عبقری تھے۔ مولانا سالک نے ''یاران کہن'' (مطبوعہ مکتبہ چٹان) میں مولانا ابوالکلام کے ذکر کو بھی مرزائیت کی بالواسطہ مدافعت میں استعمال کیا، اپنے مختصر خاکے میں لکھا کہ ''مولانا مرزا غلام احمد سے ملنے کے لیے قادیان گئے تھے اور ان کی رحلت پر امرتسر کے سہ روزہ ''وکیل'' میں تعزیتی شذرہ لکھا تھا'' ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تردید میں اپنے سیکرٹری پروفیسر محمد اجمل خان سے راقم کو خط لکھوایا ادھر مولانا سالک کسی مشاعرے میں شرکت کیلیے دہلی گئے تو اس خفگی میں مولانا نے ان سے ملاقات نہ کی۔ سالک نے لاہور پہنچ کر ہفتہ وار چٹان میں اس کی تصحیح کر دی۔ اب وہ تصحیح ''یاران کہن'' کے دوسرے ایڈیشن میں آ چکی ہے۔ سوانح اقبال میں سالک کا نقطہ نظر اپنی

آپ بیتی ''سرگزشت'' سے قطعاً مختلف ہے۔ اپنی سوانح عمری مشرقی انداز کی ہے۔ لیکن اقبال کے سوانح حیات، مغربی انداز میں تحریر کیے ہیں کہ جب تک حسب و نسب کی ہڈیاں توڑ نہ لیں مغرب کے سوانح نگاروں کو اپنے ممدوحین کے سوانح حیات ادھورے محسوس ہوتے ہیں۔

مولانا سالک نے صفحہ ۱۰ پر لکھا ہے۔

''علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور امام صاحب (امام علی الحق) کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے۔''

شیخ عطا محمد کا ''احمدی'' ہونا مشہور ہے لیکن خاندانِ اقبال کی روایت ہے کہ اقبالؒ کا برادر بزرگوار ہونے کے باوجود وہ علامہ کے ہاں آتے تو مرزا غلام احمد کو زبان کے اڑنگے پر لا کر پٹخنی دیتے اور اس کی خانہ ساز نبوت پر تبرّی تولتے تھے۔ اگر وہ قادیانی ہوتے تو سیالکوٹ جیسے شہر میں جو مدینۃ الاحرار تھا، ان کا امام صاحب کے قبرستان میں دفن ہونا ناممکن تھا، وہ ابتداءً کسی وجہ سے قادیانی ہوئے تھے لیکن علامہ نے مرزائی امت سے متعلق اپنے معرکہ خیز مقالات لکھے تو انہوں نے قادیانیت سے توبہ کر لی اور مسلمان ہو گئے، البتہ ان کے فرزند شیخ اعجاز احمد ضرور قادیانی ہیں۔ لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ ان کی اہلیہ اور عیال، مرزا غلام احمد پر قہقہے لگاتے اور قادیانی امت کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔

''دوسری شادی'' کے ضمن میں مولانا سالک رقمطراز ہیں:

''چونکہ علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی تھی مطمئن نہ تھے اور موافقت و مصالحت کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اس لیے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہاں تھے۔ احباب میں ذکر ہوا تو شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی جو اس وقت وکٹوریا گرلز سکول میں پڑھتی تھی، جب بات پکی ہو گئی تو علامہ کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آئے اور مرزا جلال الدین میاں شاہنواز بیرسٹر، مولوی احمد دین وکیل اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لیکر علامہ کا نکاح پڑھا گیا۔ اس موقع پر صرف نکاح ہوا تھا رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی۔ نکاح ہو جانے کے بعد علامہ کے پاس چند گمنام خطوط پہنچے جن میں منکوحہ خاتون کے خلاف نامناسب شکایات لکھی تھیں۔ علامہ سخت ضغطے میں پڑ گئے، دوستوں سے ذکر کیا، انہوں نے حالات کی چھان بین کا وعدہ کر لیا، ان حالات کی وجہ سے رخصتی کا معاملہ غیر معین وقت تک ملتوی ہو گیا۔ علامہ اس زمانے میں بے حد ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ایک بیوی سے ان کی ان بن ہو گئی تھی، دوسری کے متعلق یہ حالات رونما ہو گئے۔''

علامہ نے تیسری شادی لدھیانہ کے نولکھا خاندان میں کی۔ اس دوران میں دوسری شادی کا معاملہ معلق رہا، مولانا سالک لکھتے ہیں کہ کچھ مدت بعد یہ واقعات رونما ہوئے۔

۱۔ وکٹوریا گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس مس بوس سے مرزا جلال الدین کی بیگم نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اس نے اس لڑکی کی بے حد تعریف کی اور اس کی ذہانت طباعی اور نیکی کو بیحد سراہا۔"

۲۔ علامہ کے والد مرحوم نے جو بیحد پرہیز گار اور مقدس بزرگ تھے استخارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ لڑکی بالکل پاکدامن ہے۔"

۳۔ مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں نے اپنے منشیوں اور کارکنوں کے ذریعے سے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ گمنام خطوط کا ذمہ دار نبی بخش وکیل تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی اس کے بیرسٹر لڑکے سے ہو جائے۔"

۴۔ "جب یہ انکشاف ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اس بات پر بیحد افسوس ظاہر کیا کہ علامہ نے بہتان پر یقین کر لیا؟ اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روز قیامت آپ کی دامنگیر ہوں گی۔ آخر علامہ اس بیگم کو لانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہیں شبہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے مبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہو انہوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوئی لیکن اگر آپ کے دل میں کوئی شبہ اور وسوسہ ہے تو دوبارہ نکاح کر لیجئے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھوایا گیا۔ یہی خاتون جاوید اور منیرہ کی والدہ ہیں۔

اس کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں۔ یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔"

"اقبال عنفوانِ شباب میں اپنے شہر کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے شہد کی مکھی کبھی نہ بنے۔ آج بھی ان کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں جو اس گئے گذرے زمانہ کی رنگین صحبتوں کی یاد کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے تمام ہم نشیں اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

رموزِ بیخودی کے آخر میں بحضور رحمۃ اللعالمین عرض حال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں

مدتوں عشقِ مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا۔ فرماتے ہیں۔

مدتے بالالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں ساختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغ عافیت داماں زدم
برقبہا گردید گیرد حاصلم
رہزناں بردند کالائے الم
ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت
ایں زرا ساوا زدامانم بہ ریخت

(صفحہ ۶۷ تا ۷۱)

کیا یہ سوانح عمری ہے؟ وہ کیا چیز تھی جو اس کے بغیر تشنہ رہتی؟ یا ذکر اقبال ادھورا رہتا؟ سوانح اس لیے مرتب کیے جاتے ہیں کہ دوسروں کے لیے نمونہ ہوں اور لوگ ان سے مختلف العنوان بالیدگی حاصل کریں۔ جس سوانح حیات میں کوئی سی افادیت نہیں، یا کوئی تاریخی پہلو نہیں، اور جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں کوئی خوبی یا حسن نہیں بلکہ ذم کا پہلو ہے اس کو سوانح میں درج کرنا کس منطق و استدلال کی رو سے جائز ہے، اور اس میں کونسی برائی ہے، اس قسم کے واقعات بہت سی زندگیوں کو پیش آتے اور وہ ان سانحات میں سے گزرتی ہیں، لیکن ان کے لیے شرقی سوانح حیات میں کوئی سی جگہ نہیں۔ اور نہ مشرقی ادب کے سوانح نگاروں نے ان حادثوں کو کسی رعایت سے کوئی جگہ دی ہے۔ علامہ اقبال نے دوسری شادی کی تو عفیفہ خاتون پر افترا باندھا گیا لیکن آخر کار وہ جھوٹ چھٹ گیا۔ مولانا سالک نے اس کا ذکر کیوں ضروری خیال کیا؟ واللہ اعلم۔

آخر نئی پود کے لیے اس میں کیا ہے؟ الا یہ کہ نئی پود عنفوانِ شباب میں لہو و لعب کی زندگی بسر کرنے کے لیے علامہ کے عنفوانِ شباب کو حجت بنا لے اور اس خیال سے مطمئن ہو کہ عنفوانِ شباب میں معصیت کی راہوں سے گزرنا ناگزیر روایت ہے۔

محولہ بالا اقتباس میں سوانح حیات کی ادنیٰ سی رفعت بھی نہیں ہے۔ یہ روایت ہے کہ علامہ نے والدہ جاوید کو حرم میں لانے کے لیے مرزا جلال دین کو حکیم نور الدین خلیفہ اول کے پاس قادیان بھیجا کہ شرعی مسئلہ پوچھ آؤ۔ پھر اس کی رائے کے مطابق ایک مولوی صاحب کو بلا کر دوبارہ نکاح پڑھا گیا، بظاہر ایک افسانہ

ہی ہے۔ نہ جانے اس کا واضع کون ہے؟ سالک صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ علامہ قادیانیت کے ارتداد کا اعلان کر چکے ہیں۔ اور وہ قادیانی امت کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ اس روایت کو اس تفصیل سے بیان کیا کہ بالواسطہ احمدیت کا "دفاع" ہو گیا ہے کیا لاہور میں تب کوئی عالم دین نہ تھا، علامہ اس زمانے میں ہندوستان بھر کے جید علما سے خط وکتابت رکھتے تھے، کیا ان سے نہ پوچھ سکتے تھے، بالفرض علامہ اس زمانے میں مرزائیت کے خد وخال سے ناواقف تھے اور تب انہیں مسلمانوں ہی میں شامل سمجھتے تھے لیکن اس معمولی سی بات کے لیے اپنے ایک دوست کو حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجنا محض شوخی تحریر ہے۔ اس کے حق میں کوئی سی روایت یا درایت نہیں۔ علامہ مسئلے کی نوعیت خط لکھ کر دریافت کر سکتے تھے اور اگر خط اس لیے نہ لکھا کہ اس میں رسوائی کا پہلو تھا یا وہ سبکی محسوس کرتے تھے تو سالک صاحب نے اس واقعے یا افسانہ کو لکھ کر علامہ کی دستارِ عزت میں کونسا طرہ ٹانکا ہے؟ اگر سالک صاحب کے لیے "دوسری شادی" کا ذکر سوانح حیات کا لازمہ تھا تو چار فقروں میں بیان کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس کہانی کو پھیلا کر سیرتِ اقبالؒ کو ہیٹا کیا ہے۔ مولانا سالک نے خاندانِ اقبالؒ اور علامہ اقبالؒ ہی سے مرزا غلام احمد، حکیم نور الدین یا ان کی امت کا رشتہ نہیں ناتا بلکہ ان کے استاذ شمس العلماء سید میر حسن شاہ کے ضمن میں بھی مرزا غلام احمد اور حکیم نور الدین سے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ:

"شاہ صاحب کے داماد سید خورشید نور صاحب دق بیمار ہو گئے تو وہ انہیں قادیان لے گئے تا کہ حکیم نور الدین سے علاج کرائیں۔ قادیان پہنچ کر مسجد میں گئے اور اس دریچے میں جا بیٹھے جہاں مرزا صاحب بیٹھتے تھے، لوگ ان کو جانتے نہ تھے۔ انہوں نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا لیکن وہ پھر دریچے کے پاس ہی آ بیٹھے مرزا صاحب آئے تو سلام کا معمولاً جواب دے کر گئے، اور متوجہ نہ ہوئے، شاہ صاحب نے کہا غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ مرزا صاحب نے دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور مولوی عبد الکریم سیالکوٹی کو بلا کر کہا کہ شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ، دو باتوں کی خاص طور سے تاکید کی۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ہی صبح بھوک لگ جاتی ہے کیونکہ یہ عادتاً کالج جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، اس لیے ان کی حسب خواہش صبح ہی صبح کھانا دے دیا جائے دوسرے نہایت اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے دی جائیں، ساتھ ہی کہا صبح چائے میرے ساتھ پئیں۔ بہت خاطر تواضع کی، اور جب شاہ صاحب واپس جانے لگے تو مرزا صاحب دو میل تک کے ساتھ آئے۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب سے ایک طرف

جا کر ان کی باتیں سنیں، بعد میں مفصل معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوئیں، نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔"

(ذکر اقبال صفحہ ۲۷۸)

سالک صاحب مرزائیت کے معاملے میں اس قدر فیاض تھے کہ علامہ اقبال نے اس کے متعلق جو کچھ کہا اور جو قدم اٹھایا وہ تمام حذف کر دیا ہے۔ جہاں ذکر کیا ہے مفہوم الٹا کر اختصار کے ساتھ، لیکن مرزا غلام احمد اور ان کے حواریوں کے لیے ان سوانح میں جگہ ضرور نکالی ہے، آخر اس واقعہ کا سوانح اقبال سے کیا تعلق ہے۔ ذکر بس اتنا تھا کہ شمس العلماء میر حسن شاہ علامہ اقبال کے استاد تھے، ان کے سوانحی حالات نہیں لکھے۔ اقبالؒ کے شاگرد ہوئے یا بعض دوسرے معروف شاگردوں پر ان کے التفات کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کے قادیان جانے کا ذکر "شتر گربہ" کے طور پر جڑ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے شاہ صاحب سے علیحدگی میں باتیں کی ہوں گی، لیکن سالک صاحب کے لیے مسئلہ یہ تھا:

"معلوم نہیں ہو سکا کیا باتیں ہوئیں نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔"

اب اس سے کیا اخذ کیا جائے؟ کبھی اس طرح دو آدمی آپس میں ملیں اور معلوم نہ ہو کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں، تو ظاہر ہے کہ اس ملاقات کا ذکر ان کی یا کسی دوسرے کی مستقل سوانح عمری میں حشو محض ہو گا۔ گمان غالب ہے کہ سالک صاحب نے تاریخ احمدیہ کو مواد مہیا کرنے کے لیے اس قسم کے ماخذ قائم کیے ہیں۔

سالک صاحب نے کبھی ان لوگوں کا تذکرہ احسن طریق سے نہیں کیا جو مرزائیت کے خلاف تھے۔ مولانا ظفر علی خان: ان کے قلم کی شدید زد میں رہے، حالانکہ اپنے صحافتی سفر کا آغاز سالک نے زمیندار سے کیا تھا اور مولانا کے دبستانِ صحافت سے فیضیاب ہوئے تھے۔ مرزا غلام احمد سے متعلق ان کا قلم ہمیشہ محتاط رہا۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانحی تذکرے یا سوانحی خاکے میں مرزا غلام احمد کا ذکر بلا ضرورت شامل کیا، واضح رہے کہ برعظیم میں مسلمانوں کے سیاسی مکتب فکر دو تھے، ایک کے عظیم ذہنی رہنما اقبالؒ تھے، دوسرے کے مولانا ابوالکلام آزاد، سالک نے ان دونوں کو مرزا غلام احمد کے آستانے پر حاضر کیا۔ پس منظر میں کیا تھا؟ اللہ تعالیٰ ہی علیم وخبیر ہیں۔

برعظیم کی آزادی کے بعد مرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کی انگریز پرستی اور کاسہ لیسی کا تذکرہ عام ہوا تو مرزا صاحب کی صفائی کے خیال سے ان کے پیروؤں نے مسلمانوں کی استعمار دشمن شخصیتوں کے انگریزسے "تعاون" کی دریافت شروع کی حالانکہ قومی تحریک سے پہلے جنگ عظیم اول کے دوران یعنی بیسویں

صدی کی دوسری دہائی تک برطانوی حکومت سے تعاون ایک استبدادی امر تھا، عجیب بات ہے کہ امتوں کے لیے حجت قاطع نبیوں کا کردار ہوتا ہے لیکن "قادیانی نبی" کی امت نے شاعروں کی گفتار کو اپنے نبی کے کردار کی حجت بنایا، مولانا ظفر علی خان کے "زمیندار" کی پیشانی پر ۱۹۱۰ء سے پہلے جب ان کے والد اس کے مالک ومدیر تھے، ذیل کا شعر درج ہوتا تھا۔

تم خیر خواہِ دولتِ برطانیہ رہو
سمجھیں جنابِ قیصرِ ہند اپنا جاں نثار

مرزائیوں نے چرچا کیا کہ ظفر علی خاں مرزا صاحب پر کاسہ لیسی کا الزام دھرتے ہیں لیکن ان کے اپنے اخبار کی پیشانی پر مذکورہ شعر لکھا ہوتا تھا۔

علامہ اقبالؒ سے متعلق قادیانی امت نے سالک سے روایت حاصل کی جو اس کے جوابی لیکن ابلہانہ لٹریچر میں نقل کی جاتی ہے۔ ذکر اقبال میں سالک رقمطراز ہیں کہ:

"مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خاں اور بے شمار دوسرے علمبرداران اتحادِ اسلامی قید و بند میں تھے اگر علامہ اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکام وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی اشد شدید گرفت میں آجاتے اور کوئی نتیجہ بھی مرتب نہ ہوتا بلکہ جب اواخر جنگ میں وائسرائے نے دہلی میں وار کانفرنس منعقد کی تو بطورِ خاص نواب ذوالفقار علی خاں کی وساطت سے علامہ اقبال کو بھی طلب کیا اور اس موقع کے لیے ایک نظم کی فرمائش کی۔ علامہ نے مجبور ہو کر ایک مسدس لکھی جس کے کل نو بند تھے۔ بطور نمونہ دو بند ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ نظم یونیورسٹی ہال لاہور میں پڑھی گئی۔

اے تاجدارِ خطۂ جنت نشانِ ہند
روشن تجلیوں سے تری خاورانِ ہند
محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند
ہنگامہ وفا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذرِ محقر قبول ہو
تلوار تری دہر میں نقادِ خیر و شر
بے روز جنگ توز، جگر سوز، سینہ در

رایت تری سپاہ کا سرمایہ ظفر
آزادہ، پرکشادہ پری زادہ، یم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

(ذکر اقبال صفحہ ۸۷)

اسی کتاب کے صفحہ ۹۰ پر "جلسہ فتح اور اقبال" کے زیر عنوان سالک صاحب لکھتے ہیں:

"۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی، جرمن، آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو سر مائیکل اوڈوائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے بریڈلا ہال میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی نظمیں ارشاد فرمائیں۔"

سر مائیکل اوڈوائر انگریزی فرمانروائی میں پنجاب کا سب سے مستبد گورنر تھا، اس نے پنجاب میں مارشل لاء لگایا اور جلیانوالہ باغ امرتسر کو انسانی خون سے لالہ زار کرایا تھا وہ ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کے وجود سے ہمیشہ متنفر رہا۔ اس کے نزدیک صرف قادیانی ہی معتمد مسلمان تھے۔ سالک صاحب کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے ترکی کی شکست اور برطانیہ کی فتح کے اس جلسے میں جو سر مائیکل اوڈوائر کی صدارت میں منعقد ہوا، اقبال کی شرکت ان کے سوانح میں درج کی، گویا اس کے بغیر ذکرِ اقبال ناقص رہتا اور سوانح مکمل نہ ہوتے، اقبال کے سوانح حیات اسی کا نام ہے تو معلوم ہوتا ہے سالک صاحب نے کسی خلاء کی تشفی کے لیے انہیں سینت کر رکھا تھا، اقبال رحلت کر گئے، ملک آزاد ہو گیا، اس جلسے کو ۲۷ برس ہو گئے تو سالک نے پاکستان کی آزاد نسلوں کو آگاہ کیا، کہ تمہارا "فقر غیور" بھی اس وادی میں گلگشت کر چکا ہے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

علامہ کی سب سے بڑی نثری تحریر، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے خطبات ہیں، ان خطبات سے وہ عمر کے آخری دور میں مطمئن نہیں تھے، فرماتے تھے، "علم بہت آگے بڑھ چکا ہے، چونکہ انسانی فکر نے بہت سی راہیں ڈھونڈھ لی ہیں لہٰذا خطبات نظر ثانی کے مستحق ہیں، اس کے بعد علامہ کی سب سے بڑی نثری تحریر قادیانیت سے متعلق ہے۔ اور اس بارے میں علامہ نے آخر تک کوئی ترمیم نہیں کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے

جواب میں کچھ لکھا اس سے پہلے قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کے متعلق جو بیان دیا اور کئی اخباری سوالات کے جوابات جن تلے الفاظ میں دیے وہ سب ان کی نثری تحریروں کا ترقی آخریں، سالک صاحب نے ان عظیم بیانوں کا ذکر ایک سطر سے زیادہ نہیں کیا۔

فرماتے ہیں:

"خدا جانے علامہ اقبالؒ نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا جس میں یہ بتایا کہ اس فرقے (احمدیت) کی بنیاد ہی غلطی پر ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کیے اور آخر میں حکومت کو مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔

"علامہ نے انتہائی اشتعال و ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت امام جماعت احمدیہ اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا، بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا۔"

(صفحہ ۲۱۰)

سالک صاحب کی ذہنی اپج ہے کہ انہوں نے قادیانیت سے متعلق علامہ کے خیالات کو "خدا جانے کس عقیدت مند کی درخواست" قرار دیا ہے۔ قادیانیت کی بنیاد علامہ نے غلطی پر نہیں لکھی بلکہ اپنے مقالے کے بین السطور میں برطانوی استعماری تخلیق قرار دیا، اسلام سے غداری پر محمول کیا اور اس کا تجزیہ مستقبل میں ایک طاقتور قلم کے حوالے کیا ہے۔

سالک صاحب نے سوانح کے ضمن میں بعض سرسری واقعات بھی رقم کیے ہیں لیکن حضرت علامہ نے کشمیر کمیٹی سے جس اساس پر استعفا دیا اس کا رخ ہی پھیر دیا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ علامہ کشمیر کمیٹی سے قادیانی امت کی دسیسہ کاری کے باعث الگ ہوئے تھے۔ اسی طرح سالک صاحب نے انجمن حمایت اسلام سے مرزائی امت کے نکالے جانے کا ذکر ہی نہیں کیا کہ علامہ نے اس وقت تک اجلاس ہی نہ ہونے دیا جب تک ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو اجلاس سے اٹھا کر رخصت نہ کیا۔ قادیانی امت سے متعلق سالک صاحب کی اس فیاضی کا سبب کیا ہے کہ ان کے والد قادیانی المذہب تھے، ان کے بھائی بھی قادیانی تھے اور وہ خود بھی مرزا بشیر الدین محمود سے ملتے ملاتے تھے۔

تاریخ احمدیت جلد ہفتم مولفہ دوست محمد شاہد ادارۃ المصنفین ربوہ نے ۱۹۶۷ء میں شائع کی۔ اس کے صفحہ ۲۴۰ پر عبدالمجید سالک کے ایک خط کا عکس ہے جو مرزا بشیر الدین محمود کے نام لکھا تھا۔ اس میں لکھا ہے:

مخدومی حضرت قبلہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"چند ساعتیں میں نے قادیان میں گزاریں آپ کی برکت سے بے حد مسرت و اطمینان سے بسر ہوئیں، مولوی عبدالوہاب عمر، عبدالعزیز خاں صاحب، شاکر صاحب نے میری خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، افسوس ہے کہ میں بوقت رخصت آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا اس لیے کہ آپ مجلس شوریٰ میں مصروف تھے مہر صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔

عبدالمجید سالک

۱۱ نومبر ۱۹۵۱ء کو (ذکر اقبال کی اشاعت کے بعد) سالک صاحب نے ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج کے متعلق لکھا کہ:

"تعلیم الاسلام کالج احمدی جماعت اور پرنسپل میاں ناصر احمد کی مخلصانہ مساعی اور شبانہ روز محنت کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ اس کالج کے کارکن جماعت کے تعمیری و تعلیمی تصورات کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہیں اور میرے نزدیک ایک ایسی درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور برکت یہ ہے کہ ربوہ کی فضا آج کل کی شہری آلودگیوں سے قطعی طور پر محفوظ ہے اور وہ ترغیبات بالکل مفقود ہیں جو تربیت اخلاقی میں حائل ہو کر تعلیم کے بلند تصورات کو برباد کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس درسگاہ کو پاکستانیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید و بابرکت بنائے اور اس کے کارپردازوں کو بیش از بیش سعی و جہد و جہد کی توفیق عطا فرمائے۔

ربوہ۔ ۱۱ فروری ۱۹۵۶ء عبدالمجید سالک

(تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۱۶۱۔۱۶۲)

واضح رہے کہ "ذکر اقبال" اور "محول اقتباس" پنجاب کی خلاف قادیان تحریک ۱۹۵۳ء کے بعد کی تحریریں ہیں مسلمانوں کا فیصلہ دوٹوک تھا کہ وہ قادیانی امت کو ملت اسلامیہ میں شامل نہیں کرتے اور دائرہ اسلام سے خارج گردانتے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے اس کے فوراً بعد اپنی مدافعت کے لیے مسلمان اکابر کے تذکروں میں پناہ لینا شروع کی اور اس غرض سے ان اہل قلم کو تلاش کیا جو اپنے قلم کی معرفت مسلمانوں میں قادیانی امت کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔ "ذکر اقبال" اس رعایت سے ایک مدافعتی شہ پارہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کئی ایک سیاسی ڈنڈیاں ہیں۔ مثلاً "یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ" کے زیر عنوان صفحہ ۲۰۳ پر لکھا ہے کہ:

"یونینسٹ پارٹی ہندو، مسلمان، سکھ زمینداروں کی مخلوط پارٹی تھی، اور اس کی وجہ سے شہری و دیہاتی حلقے الگ الگ ہو گئے تھے لیکن علامہ اس طرز سیاست کی افادی پہلو کو پس پشت ڈال کر یہ مثالی عقیدہ اپنے سامنے رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت سے کوئی مفاہمت کرنے کی ضرورت نہیں اور طبقات

و درجات کی تقسیم غیر اسلامی ہے۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ یونی نسٹ پارٹی پنجاب کی بہترین سیاسی پارٹی تھی۔"

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے۔ گویا علامہ اقبال کا سوءِ تدبر تھا کہ وہ یونی نسٹ پارٹی کے افادی پہلو کو پس پشت ڈال کر پنجاب کی اس بہترین سیاسی پارٹی پر مسلم لیگ کی بالادستی قائم کرنا چاہتے تھے۔

فی الجملہ سالک صاحب نے سوانحِ اقبال اس طرح مرتب کیے ہیں کہ اقبال کی عظمت کا معیار قائم نہیں رہتا، اس میں بہت سی دراڑیں یا خلل محسوس ہوتے ہیں۔ سالک جہاں ان کے سوانح کا ذکر کرتے وہاں اس انداز سے قلم لگاتے ہیں کہ علامہ کی شخصیت لہو ولعب سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور جہاں ان کے افکار کا ضمناً تذکرہ کیا ہے وہاں ہندوؤں سے متعلق ان کی مغائرت کھل کے لکھی ہے۔ گاندھی و نہرو پر طنزیں کی ہیں اور وہ مسلمان جو انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ تھے، انہیں بھی نیشلسٹ ہونے کے جرم میں رگیدا ہے، لیکن رجعت پسند سرکاری مسلمانوں کا ذکر احترام سے کیا اور ان کی کاسہ لیسی کو مخفی رکھا ہے، قادیانیت کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا علامہ اقبالؒ نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا وہ بداہتہً کسی عقیدت مندی کی درخواست پر تھا، ان کے اپنے "مطالعہ و تجزیہ" اور "غور و فکر" کا حاصل نہیں تھا ورنہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد قادیانی العقیدہ تھے اور والدہ جاوید کے متعلق علامہ کی بدگمانی رفع ہو گئی تو ازدواجی زندگی قائم کرنے کے لیے حکیم نور الدین (خلیفہ اول) سے شرعی مسئلہ دریافت کیا پھر انہی کے حسبِ مشورہ عمل کیا۔

حضرت علامہ نے یہ کہیں نہیں کہا کہ قادیانی امت کی بنیاد غلطی پر ہے، انہوں نے اس کی بنیاد اسلام سے "غداری" قرار دی ہے۔ غداری کو غلطی کہنا قلم کی اچھوتی باگی ہے۔ المختصر ذکرِ اقبال کئی ایک غلطیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سالک کے بہار آفریں قلم کی سب سے بڑی غلطی ہے۔

شعرِ اقبالؒ

"شعرِ اقبال" عابد علی عابدؔ کے قلم سے علامہ اقبال کی شاعری پر ایک مطالعاتی کتاب ہے۔ بہ قول مؤلف اقبال کے شعورِ تخلیق کا جائزہ!

بزمِ اقبال کے دوستانہ طائفے نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ فی صفحہ کے حساب سے کتاب کی اجرت لیتے اور اس طرح سرکاری زراعانہ کی بندر بانٹ کرتے تھے۔ نتیجتہً ہر مؤلف، مصنف یا مرتب کتاب کو زیادہ سے زیادہ ضخیم کرتا اور ٹائپ کی ترتیب کو کھلا رکھواتا، کہ اس طرح زیادہ سے زیادہ رقم پا سکے۔ عابد علی نے معاوضہ وصول کرنے کا پورا اہتمام کیا۔ شعرِ اقبال ۸/۱۸x۲۳ سائز کے ۶۳۷ صفحات ہیں۔ ایک دوسری کتاب "تلمیحاتِ اقبال" بھی ان کے قلم سے اسی طرح کا ایک کھڑاگ ہے۔

عابد علی شعرِ اقبال کو مختصر کر سکتے تھے اس طرح کتاب جامع ہوتی اور شاید اقبال کے شعورِ تخلیق کا جائزہ بھی۔ لیکن انہوں نے پیسے کے لیے کتاب لکھی، نتیجتہً رطب و یابس جمع کیا اور اس طرح کتاب مضحک ہو گئی۔ عابد صاحب نے اکسٹھ صفحے پس منظر کی سطحیت میں ضائع کیے، اگر پس منظر ضروری تھا تو اس سائز ہی کے پانچ چھ صفحوں میں نہایت جامع طور پر آ سکتا تھا۔ اس کے بعد ۶۵ سے ۱۳۷ صفحات تک "ابتدائی تعلیم و تربیت، محفلِ احباب، اور داغ وار دو شاعری کی روایت" کا اَنمل بے جوڑ مضمون لکھا ہے جو قرطاس و قلم کی آنکھ مچولی ہے، اس کے بعض مندرجات حد درجہ افسوسناک ہیں۔

عابد علی عابدؔ شاید اپنے بارے میں وہ گوارا نہ کرتے جو داغ کے متعلق لکھا ہے۔ تیسرا حصہ ابتدائی عواملِ تخلیق اور ان کے اثرات پر ہے جو ایکسو اکتالیس صفحے سے شروع ہوتا اور ۲۱۰ صفحے پر ختم ہوتا ہے، اقبال زندہ ہوتے تو سر پیٹ لیتے۔ انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔

من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

جزو دوم میں اقبال کے سفرِ یورپ اور فکری انقلابات کی روداد ہے۔ عابد نے وہی اسلوب اختیار کیا ہے، جو ان کے لیے اعادہ شباب کا موجب رہا ہے۔ یہ حصہ ۲۱۳ صفحہ سے ۳۶۰ صفحے تک پھیلا ہوا ہے، اور محض الفاظ کی شعبدہ بازی ہے۔ عابد نے اقبال کو اس بارے میں عطیہ فیضی کے سپرد کیا، اور قلم سے ابکائیاں لی ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اقبال کی روشِ تخلیق عطیہ فیضی کی شخصیت و رفاقت سے متاثر ہوئی، متعدد موقعوں پر عطیہ کی طباعی و ذہانت اور اصابت رائے اقبال کے کام آئی اور اقبال نے محسوس کیا کہ انکی رفاقت کا میسر آجانا مغتنمات میں سے ہے۔''

یہ باب خیالات کی پیچ رنگی کا مجموعہ ہے، اور کوئی سا پہلو درست نہیں۔ جز سوم کا عنوان ہے۔ ''اقبال کے شعور تخلیق کا ابلاغ و اظہار''صفحہ ۳۶۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۷۶۳ پر ختم ہوتا ہے۔ ان کے ضمنی عنوان ہیں: مطابقت الفاظ و معانی، علائم و رموز، صنعت گری!

عابد نے ایک تو کتاب کی ضخامت بڑھانے کے خیال سے اور دوسرے اپنے ذہنی خلاء کو پر کرنے کے لیے مختلف مصنفوں اور شاروں کی تصنیفات کے طویل حوالے دے کر کتاب کی شکم پری کی ہے۔ چونکہ انتخاب شعر کا انحصار ہر شخص کے انفرادی ذوق پر ہے، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے کلام اقبالؒ سے جو شعر انتخاب کیے وہ کس حد تک حسب موضوع ہیں لیکن ان کا انتخاب سرسری ضرور ہے، جن حوالوں کے ساتھ انتخاب کیا گیا ان حوالوں کے تحت کلامِ اقبال میں اشعار کا بہترین ذخیرہ ہے اور ان میں متعلقہ مطالب کی عمیق روح پائی جاتی ہے۔ خرابی یہ ہے کہ عابد نے اقبالؒ کے شعری ارتقاء کا تدریجی مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے جائزہ لینے کی خصوصیت سے محروم رہے ہیں۔ وہ زیادہ تر ''بانگ درا'' پر انحصار کرتے ہیں، اور بانگِ درا اقبال کے شاعرانہ سفر کا آغاز ہے۔ بانگِ درا میں اقبال فکر کے جادہ پر آچکے تھے لیکن فکر کی منزل میں نہیں تھے۔

عابد نے اس بارے میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اقبال کے فکری ارتقاء کے پر پیچ مرحلوں تک رسائی نہیں رکھتے تھے، چونکہ وہ عمر بھر مدرسے میں استاد رہے، اس لئے انہوں نے قارئین کو طالب علم فرض کیا، اور مختلف حوالوں کی لیپا پوتی سے یہ کتاب گھسیٹ ڈالی ہے۔ ان کے سامنے اقبال کا فن ہوتا تو ڈاکٹر یوسف حسن خاں کی ''روح اقبال'' سے مستفید ہوتے۔ ''روحِ اقبال'' فی الواقعہ روح اقبال ہے، فاضل مصنف نے اقبال کو اس حقیقتِ کبریٰ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ:

''ادبیاتِ عالم کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ایسی مثال ملے گی کہ کسی شاعر نے اقبال کی طرح اپنے دل آویز نغموں سے اتنی بڑی جماعت پر جیسی کہ مسلمانانِ ہند کی جماعت ہے، اتنا گہرا اثر چھوڑا ہو۔''

(روح اقبال صفحہ ۱۳)

ڈاکٹر یوسف حسن نے دیباچے میں لکھا ہے کہ

''کسی مفکر شاعر کے تصورِ حیات کو سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔''

اقبال (شاعر نہیں جس کا سلسلہ نسب عابد نے شاعری کے روایتی خانوادے سے ملایا ہے۔ اقبال نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا سفر ضرور شروع کیا لیکن شاعری محض سے جلد ہی ہاتھ اٹھالیا، البتہ اپنی فکر کو منطق کے بجائے شعر کی زبان میں پیش کیا کہ تب مسلمانوں کی ذہنی استعداد کو اس فکر میں ڈھالنے کے لیے اور کوئی لہجہ موزوں نہ تھا۔ عابد علی نے اقبال کی صنعت گری پر جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس شاعری کا حصہ ہیں جس کے متعلق اقبال محسوس کرتے تھے کہ اردو شاعری ہندوستان کے دور انحطاط کی پیداوار ہے اس لیے کمزور، غیر فطری اور حد درجہ مصنوعی ہے۔ (انوار اقبال صفحہ ۲۵)

فرمایا:

''اردو شعراء بھی اپنی قوم کے لیے فرحت مہیا کرتے ہیں۔ پرانے عربی شعراء بھی یہی کرتے تھے لیکن عربی شاعری اور اردو شاعری میں یہی فرق ہے جو ایک سرفروش جنگجو قوم اور ایک عشرت زدہ قوم میں ہوتا ہے۔''

(انوار اقبال صفحہ ۳۵)

اقبال صرف اردو شعراء ہی کے متعلق یہ رائے نہیں رکھتے تھے، ان کے نزدیک عجمی شعراء کے تخیلاتی رگ و ریشہ میں زہر تک تھا۔ (خط بنام مولوی انشاء اللہ خاں)

چنانچہ مولوی سراج الدین پال کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔''

ادھر عابد علی نے جس بات کو اقبال کے سر منڈھنا چاہا وہ ان کے نزدیک ''ایک مقدس جھوٹ ہے۔''

(افکار پریشاں، ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء)

فرمایا:

''اسلوب بیان کو شاعری کا حقیقی (view) تصور کرنا کسی طرح درست نہیں۔'' (خط بنام آل احمد سرور)

عابد نے جس زوال پذیر رجحان کو اقبال کی اولیت قرار دیا اور ان کے شاعرانہ ارتقاء میں اس سے تسلسل پیدا کیا، وہ اقبال کے نزدیک چنگیز خاں کی لشکر کشی سے زیادہ تباہ کن ہے۔ عابد اس حقیقت کا احساس ہی نہیں کرسکے کہ:

''جب شاعر کا تخیل پختہ ہو جاتا ہے تو اس میں تراوشِ فکر فطری طور پر شروع ہو جاتی ہے۔'' (روح اقبال صفحہ ۲۳)

یہ ایک ایسا مبحث ہے جس کی گفتگو کے بہت سے پہلو ہیں۔ عابد نے انہیں محسوس ہی نہیں کیا۔ وہ خود

ایک شاعر تھے اور ان کی شاعری میں انسانوں کے اجسام کا لمس تھا وہ اس سے مختلف سوچ ہی نہ سکتے تھے اور نہ ان کی پرواز کے لیے دوسرا افق تھا۔ اقبال نے عطیہ کے نام شروع کے ایک خط لکھا تھا کہ:

''میں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزومند نہیں ہوں۔''

شوکت حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''میری ہرگز خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعراء میں میرا شمار ہو۔'' (اقبال نامہ)

صالح محمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آنے والی نسل کے قلب اس واردات سے یکسر خالی ہیں جن پر میرے افکار کی اساس ہے۔''

آل احمد سرور کو ایک خط میں لکھا کہ:

''میر[illegible] اشعار پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔''

[illegible]س عابدی کے نزدیک اقبال کو:

(۱) عطیہ بیگم اور ویسے ہی ذہین وہم خیال لوگوں کی صحیح رفاقت نصیب نہ ہوتی تو غالباً ان کی تخلیقی کاوشوں کی رفتار سست پڑ جاتی۔'' (صفحہ ۲۳۱)

(۲) اقبال کے کلام میں تنہائی کے احساس کا جو شدید اور خوبصورت اظہار ملتا ہے، اس کا تجزیہ کرنے کے لیے اور اس کی اہمیت و نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ عطیہ بیگم کے روزنامچے اور اقبال کے ان کے نام خطوط کا تفصیلی اور انتقادی جائزہ لیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مستقل عنوان کے تحت اقبال کی زندگی کے اس حصے سے بحث کی جائے جو عطیہ بیگم فیضی سے مربوط ہے کہ اس ذہین وطرار خاتون کی رفاقت نے نہ صرف اقبالؒ کی تخلیقی کاوشوں کو متاثر کیا بلکہ اس کی روش کچھ نظموں کی تخلیق کا باعث بنی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اقبال کے کلام میں جذبے کے اظہار میں جو توازن ہے، وہ جو کھنچے کھنچے رہنے کی خو ہے، وہ جو بات کھل کر نہ کرنے کی روش ہے (وہ جو دبی دبی آہوں اور گھٹی گھٹی سانسوں کا سا عالم ہے) اس کا مصدر اور منبع بہ خطِ مستقیم اقبال کی زندگی کا وہی حصہ ہے جو عطیہ بیگم فیضی سے متعلق ہے۔ اگر اقبال کی ادبی اور تخلیقی کاوشیں عطیہ بیگم فیضی کی رفاقت سے غیر متاثر رہتیں تو راقم السطور اقبال کی نجی زندگی کے اس پہلو سے قطع نظر کر سکتا تھا، لیکن یہ انتہا درجہ کی بددیانتی ہوگی اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ اقبال کی ''روشِ تخلیق'' عطیہ بیگم فیضی کی شخصیت اور رفاقت سے متاثر ہوئی ہے، اس تاثیر کی اہمیت و نوعیت کا سراغ نہ لگایا جائے۔''

(صفحہ ۲۳۱۔۲۳۲)

عابد صاحب نے عطیہ کی رفاقت کے تحتانی حاشیہ میں دو شعر دیے ہیں۔ ایک فارسی دوسرا اردو۔۔۔اردو شعر ہے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

یہ بالِ جبرائیل سے ماخوذ ہے اور بالِ جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ عطیہ بیگم طالبہ تھیں۔ اقبال طالب علم، ان کا ''ساتھ'' انگلینڈ اور جرمنی میں یکم اپریل ۱۹۰۷ء سے ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء تک رہا۔ کل پانچ ماہ، پھر اسی سال عطیہ بیگم واپس ہندوستان آ گئیں۔ جون ۱۹۰۸ء میں اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ دوبارہ یورپ گئیں تو اقبال سے ملاقات ہوئی۔ عطیہ بیگم نے اپنی ڈائری (ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی ناشر اقبال اکیڈمی کراچی) میں لکھا ہے کہ ''میں ہندوستان واپس آ گئی تو اس کے بعد اقبال سے ملنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔''

عطیہ بیگم کے نام کل دس خط ہیں اور وہ بھی ۱۹۱۱ء تک! محولہ شعر ۱۹۳۵ء کا ہے اور بالِ جبریل میں ہے، لیکن عابد علی نے چوبیس برس پیچھے لوٹ[illegible]۔ عطیہ بیگم [illegible] [illegible]اقت کے [illegible] ۱۹۱۱ [illegible] عطیہ [illegible] [illegible]
میں [illegible] از ہیں کہ:

''اقبال کا تخیل دنیا بھر کے دوسرے [illegible]ین کے مقابلے میں بالکل اچھوتا تھا اور میں صرف یہ کہہ [illegible] ہوں کہ اس امتیاز کی بنیادی وجہ اس علم میں مضمر [illegible] نے قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے بہت سے خیالات کی بنیاد اس مقدس اور الہامی کتاب پر رکھی اور اسی علم کی بدولت ان میں زیادہ شان پیدا ہوگئی۔''

لیکن عابد علی کے نزدیک کلامِ اقبال کا مصدر و منبع بہ خطِ مستقیم عطیہ بیگم فیضی کا مرہون ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عابد علی کے نزدیک ''یہ امر بددیانتی کے مترادف تھا کہ اقبال کی نجی زندگی کے اس پہلو سے قطع نظر کرتے'' گویا ''شعرِ اقبال'' نامکمل رہ جاتی وہ اگر اس راز کا انکشاف نہ کرتے کہ اقبال کی روشِ تخلیق عطیہ بیگم فیضی کی شخصیت و رفاقت سے متاثر ہوئی۔ اقبال نے اپنے ذہن کی نشوونما کو جن ہستیوں سے بالواسطہ و بلاواسطہ منسوب کیا، وہ گویا ان کا جھوٹ تھا، اصل حقیقت کی نشاندہی عابد علی نے کی ہے، جو فی نفسہ شاعرانہ لغزشوں کی یادگار شخصیت تھے۔

علامہ کو داغ سے شرفِ تلمذ تھا، گو انہوں نے داغ سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا لیکن داغ بہر حال ان

کے استاد تھے۔ اقبال نے بھرپور مرثیے صرف تین ہی لکھے ہیں۔ ایک والدہ مرحومہ کی یاد میں جو انتہائی دل گداز مرثیہ ہے۔ اس سے پہلے اردو میں اس انداز کا کوئی مرثیہ نہیں۔ دوسرا مرثیہ داغ کا ہے جو ان کی عظمت کو خراج ہے۔ یہ دونوں مرثیے بانگ درا میں شامل ہیں۔ تیسرا مرثیہ سید راس مسعود کا ہے جو ارمغان حجاز میں درج ہے۔ ان مرثیوں کے علاوہ مولانا گرامی کا مرثیہ "انقلاب" لاہور میں ان کی وفات پر شائع ہوا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر انگلستان میں وفات پا گئے تو ان کی وفات پر فارسی میں پانچ اشعار لکھے جو برعظیم کے بہت سے اخباروں نے صفحہ اول پر شائع کیے۔ لیکن گرامی و جوہر کے مرثیے ان کی کسی کتاب میں نہیں۔ علامہ اقبال کے ابتدائی دوست سر شیخ عبدالقادر تھے۔ بانگ درا کا دیباچہ انہی کے قلم سے ہے۔ اقبال پہلے پہل ان کے جریدہ "مخزن" ہی کی معرفت سامنے آئے تھے۔ انہوں نے دیباچے میں علامہ کے داغ سے تلمذ کا ذکر چند سطروں میں ختم کیا اور لکھا ہے کہ:

"داغ کے سینکڑوں شاگرد، ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے۔ شیخ صاحب نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لیے ان سے نسبت پیدا ہوئی، مگر اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی، داغ نے جلد کہہ دیا کہ اشعار میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ یہ سلسلہ تلمذ بہت دیر قائم نہیں رہا، لیکن اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔"

پروفیسر محمد طاہر فاروقی آگرہ کالج آگرہ میں شعبہ فارسی و اردو کے صدر تھے۔ انہوں نے بھی ایک عمدہ سیرتِ اقبال لکھی ہے اس میں "ابتدائی مشق" کے تحت لکھا ہے کہ:

"علامہ شروع میں خط و کتابت کے ذریعے داغ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن کچھ غزلوں پر اصلاح کرنے کے بعد داغ نے ان کو صاف صاف لکھ دیا کہ آپ کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔"

مولانا عبدالسلام ندوی نے "اقبال کامل" میں لکھا ہے کہ

"اقبال ۱۹۰۱ء سے پہلے زیادہ تر غزلیں لکھتے رہے، مرزا داغ سے اصلاح لی، لیکن ان کے مطبوعہ کلام میں داغ کے رنگ کی ایک آدھ غزل ہے۔"

پروفیسر عبدالقادر سروری کا خیال تھا کہ

"اقبال نے انتخاب کے وقت ایسی غزلیں خود چھانٹ دیں۔"

مولانا سالک نے ذکر اقبال میں لکھا ہے کہ:

"اقبال نے سیالکوٹ کے زمانہ طالب علمی میں غزل لکھنی شروع کی اور خط و کتابت کے ذریعے فصیح الملک مرزا داغ سے چند غزلوں میں اصلاح لی۔ اس طرح اردو زباندانی کے لیے انہیں داغ سے نسبت پیدا ہوئی۔"

باقی عبدالقادر کی رائے نقل کی ہے لیکن عابد علی عابد نے "شعر اقبال" میں داغ کو شاید اس جرم میں رگیدا ہے کہ اقبال کے استاد تھے، اصل بحث شعر اقبال کے نشو و بلوغ اور اس کے تخیل کی رفعت و عظمت کا ہے، لیکن عابد علی لکھتے ہیں:

(۱) داغ نے جس خاندان میں پرورش پائی وہ کسبیوں اور طوائفوں کا ہے۔ انہیں اس پیشہ ورانہ دلبری کے انداز دیکھنے کا شروع ہی سے موقع ملا ہوگا جو بکتی اور خریدی جاتی ہے۔

(۲) داغ جن اداؤں کو پسند کرتے ہیں ان میں لگاوٹ، تصنع اور تکلف زیادہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گھر میں گھر کی عورتوں کو بھی لگاوٹ، تصنع اور تکلف کا دلدادہ دیکھا۔

(۳) انہوں نے مرتے دم تک طوائفیں رکھ چھوڑی تھیں کہ شعر کہنے کی تحریک ہوتی رہے۔

(۴) داغ کی محبوبہ (اگر ایسی عورت کو محبوبہ کہہ سکتے ہیں) قطعاً اور صریحاً طوائف ہے۔

(۵) اقبال نے یورپ جانے سے پہلے داغ سے اردو کی شعری روایت کے سارے رموز سیکھ لیے تھے۔

(۶) داغ ادنیٰ واردات کو بعینہ پڑھنے والوں تک منتقل کرتے تھے، ان کی کیفیات ادنیٰ درجے کی تھیں۔

(۷) اقبال نے داغ کے کلام کا مطالعہ اس نظریے سے کیا کہ شعری روایت کی تمام میراث ان کے قبضے میں آجائے۔

(۸) داغ کے نانا یوسف سادہ کار دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے گھر کی تمام عورتیں اسی نسبت سے یوسف والیاں مشہور تھیں۔ داغ کی والدہ کا نام بہ تحقیق معلوم نہیں ہو سکا۔ اکثر تذکروں میں "چھوٹی بیگم" لکھا ہے۔ جب ان کی شادی سرال سے شمس الدین احمد والی لوہارو سے ہوئی تو ممکن ہے یہ خطاب انہیں سسرال سے ملا ہو، کیونکہ نواب کی پہلی بیوی موجود تھی، چھوٹی بیگم کی بہن عمدہ خانم کا تعلق رام پور سے رہا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر ۱۸۵۷ء کے بعد داغ رام پور پہنچے۔ یہ تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا شمس الدین کے عقد میں آنے سے پہلے چھوٹی بیگم کا کسی اور سے تعلق رہا کہ نہیں؟ لیکن یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ خود نواب شمس الدین کے خاندان کے افراد نے

داغ سے وہ سلوک نہیں کیا جو جائز اولاد سے کیا جاتا ہے۔ چھوٹی بیگم نے اس سلسلے میں کوئی قانونی چارہ جوئی بھی نہیں کی۔ نواب شمس الدین، ولیم فریزر کے الزامِ قتل میں پھانسی پا گئے تو چھوٹی بیگم کچھ عرصے کے لیے خانہ نشین ہو گئی۔ پھر آغا تراب علی سے نکاح کیا جس سے مرزا شاغل پیدا ہوئے۔ قیاس چاہتا ہے کہ چھوٹی بیگم ۱۸۴۱ء کے لگ بھگ مرزا فخرو (ولی عہد بہادر شاہ ظفر) کے نکاح میں آئیں، ان سے مرزا خورشید عالم پیدا ہوئے۔ فخرو کی رحلت کے بعد چھوٹی بیگم کا تعلق ایک انگریز مسٹر بلاک نامی سے ہو گیا، جس سے ایک لڑکی بادشاہ بیگم پیدا ہوئی۔

(۹) داغ کی زندگی بہت سے اللے تللوں میں بسر ہوئی، ان کی ماں نہایت حسین، خوش وضع اور کافرادا نازنین تھی۔

(تلخیصات شعرِ اقبال صفحہ ۸۷ تا ۱۱۵)

عابد علی کی ایک دوسری کتاب ''تلمیحات اقبال'' ہے۔ ناشر وہی بزمِ اقبال، سالِ اشاعت ۱۹۵۹ء۔ اس کے صفحہ ۲۷ پر داغ کے خاندان سے متعلق عابد اپنے فرمودات کا اعادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''داغ کی ماں خانگی یا طوائف تھی، داغ شمس الدین سے تعلق خاطر کا ثمر ہے۔''

عابد علی زندہ تھے تو راقم نے اسی زمانے میں داغ سے متعلق ان کی اس ژاژ خائی پر ''چٹان'' میں ایک تبصراتی مقالہ لکھ کر احتجاج کیا اور ان سے سوال کیا تھا کہ وہ اپنے متعلق اس انداز کی یاوہ گوئی سننے کے لیے تیار ہیں؟ راقم کا خیال ہے کہ اس طرز کی عیب بینی، عیب گوئی یا عیب نگاری وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے بارے میں اس طرز کے خلاؤں کا شکار ہوتے ہیں اور ان کے حسب و نسب کو دیمک لگ چکی ہوتی ہے۔ عابد رحلت فرما چکے ہیں اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو درگذر فرمائے اور انہیں بخش دے۔ ''شعرِ اقبال'' ان کے زمانہ ''لہو و لعب'' کی یادگار ہے۔

عابد بہمہ وجوہ کئی حادثوں کا شکار تھے، ان کا وجود سانحاتی تھا۔ ان کے حالاتِ زندگی ''صحیفہ'' کے عابد نمبر (۱۹۷۱ء، جولائی) میں مشہور قادیانی اسمٰعیل پانی پتی نے لکھے تھے۔ گو حالات اس بھی فروتر تھے لیکن رکھ رکھاؤ کے باوجود حقیقت ابھر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''عابد کے پردادا سید رجب علی شاہ قدیم دہلی کالج میں پروفیسر تھے، انگریزی حکام سے تعلقات پیدا کیے اور ۱۸۵۷ء میں محاصرہ دہلی کے وقت انگریزوں کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اس صلے میں انہیں دس ہزار نقد کے علاوہ جاگیر عطا کی گئی۔ خان بہادر اور ارسطو جاہ کے خطابات دیے گئے اور لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے میر منشی مقرر ہوئے۔''

رجب علی قلعہ معلی کے ان غداروں میں سے تھا جنہیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہادر شاہ ظفر کے خلاف خرید رکھا تھا اور وہ ان کی مخبری کرتے تھے۔ نواب شمس الدین والئی لوہارو انہی کی مخبری سے پھانسی پر لٹکائے گئے، ان کی بدولت اس زمانے میں پنجاب و سرحد کے جہادی مسلمانوں پر جو بیتی، وہ الگ داستان ہے۔ ممکن ہے عابد علی کے دل میں ایسی کوئی خلش ہو کہ داغ دہلوی نے ان کے پردادا کی غداریوں کا پردہ چاک کیا اور انہیں نواب شمس الدین کا بالواسطہ قاتل قرار دیا تھا، عابد ایک عجوبہ روزگار انسان تھے۔ فرض کیجیے داغ طوائف کا بیٹا تھا لیکن غیرت مند تھا، عابد خود اسی ٹہنی کا پتا تھے۔ ان کا رنگ ڈھنگ یہ رہا کہ بہت سی شرفاء زادیوں کو شاعری کے جال میں پھانسا اور معلّمی کے دام سے شکار کیا۔ پھر ان پر ایک مدت طبع آزمائی کی، آخر کار انہیں طوائف بنا دیا۔ قلم کو غلیظ کرنا مناسب نہیں کہ عظیم گناہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عابد اپنے لیے ایک آئینہ تھا اور ہر چہرے میں اپنا ہی چہرہ دیکھتا تھا۔

وہ ایک مدرس تھے اور انہیں مدرس ہی رہنا چاہیے تھا، لیکن نظم و نثر کی مختلف وادیوں میں قدم رکھا تو پاکستان بن جانے کے بعد ان کا لہو و لعب کا راہوار بگٹٹ ہو گیا، اپنی اولاد سے دغا کی، ان کے آبگینوں کو توڑا، پیمانوں میں ڈوب گئے، حتیٰ کہ ان کا خون شراب ہو گیا۔ ان اللے تللوں کے لیے انہیں روپیہ کی اشد ضرورت نے محسور کر رکھا تھا۔ پرنسپل شپ سے محروم ہو گئے تو معاش کا ذریعہ صرف قلم رہ گیا۔ ''شعرِ اقبال'' و ''تلمیحات اقبال'' لکھیں، اجرت پر تراجم کیے۔ غرض یہی چیزیں تھیں جن پر عمر کا آخری زمانہ بتاتے رہے۔ ان کی مدہوشی و بدمستی کا یہ حال تھا کہ بعض کتابیں خود نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنے خام کار شاگردوں سے لکھواتے اور کئی ایک تراجم انہی سے کراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طرز انشا میں یکسانی نہیں، اور نہ کوئی مستقل اسلوب نگارش ہے۔ بعض ترجمے سرقہ ہیں۔ مثلاً ''داستانِ فلسفہ'' عثمانیہ یونیورسٹی کے ترجمہ کی چوری ہے۔ چند الفاظ میں الٹ پھیر کیا ہے۔

''شعرِ اقبال'' شروع سے آخر تک مربوط کتاب نہیں۔ ہر باب کا طرز نگارش جداگانہ ہے۔

اقبال نے شاید ان سے متعلق ہی کہا تھا

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودتر
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

اقبال کے آخری دو سال

یہ دو چار روز پہلے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی (مقیم لندن) کی ایک تازہ کتاب ''اقبال کے آخری دو سال'' اقبال اکادمی کے زیر اہتمام چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔ کتاب میں بعض اختلافی پہلو بھی ہیں۔ ضروری نہیں کہ فاضل مرتب کے تمام مندرجات سے اتفاق ہو اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے حرف بحرف درست ہی ہو۔ سرسری نظر میں بعض چیزیں ہمیں خود کھٹکی ہیں لیکن بیشتر حصے ایسے ہیں جن سے عجیب وغریب حقائق سامنے آئے ہیں۔ مثلاً فاضل مئولف لکھتے ہیں۔

(۱) سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ قائد اعظم کے بعض بے حد اہم خطوط جو انہوں نے ملک برکت علی کو لکھے تھے، دستیاب نہ ہو سکے۔ ملک صاحب کا قاعدہ تھا کہ وہ ضروری کاغذات کا ایک ایک پرزہ بڑی احتیاط سے محفوظ رکھتے تھے۔ قائد اعظم کے ان خطوط کو بھی انہوں نے ایک بہت بڑے لفافے میں بند کر کے اپنی کتابوں کی الماری میں مقفل کر رکھا تھا۔ میں نے یہ خطوط ملک صاحب کی زندگی میں کئی بار دیکھے تھے۔ اب اس کتاب کے لکھنے کی نوبت آئی تو ان کے خطوط کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ متاع گراں مایہ کے تلف ہو جانے کی جو مختلف روائتیں پیش کی گئی ہیں۔ ''خدا شاہد ہے مجھے ان میں سے ایک روائت بھی قابل اعتماد معلوم نہیں ہوئی''۔

یہ ایک بڑا خطرناک انکشاف ہے۔ فاضل مئولف نے جب خدا کو شاہد بنا کر لکھا ہے کہ ان خطوط کے گم ہونے کی روائتیں قابل اعتبار نہیں تو لازماً وہ گمشدگی کی پوری داستان سے آگاہ ہیں۔ مگر انہوں نے بوجوہ خامہ فرمائی سے گریز کیا ہے۔ اور وجوہات نظر بہ ظاہر یہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) مئولف ان خطوط کے چور سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں یا (۲) اس کا نام لیتے ہوئے حجاب محسوس کرتے ہیں یا (۳) اپنے اخلاق کی شرافت کے پیش نظر سارق سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتے۔

مگر حیرت ہے کہ جب مرحومین کے بارے میں مئولف نے تحقیق وبغیر تحقیق ہر بات کہہ دی ہے تو ایک واضح سرقہ سے متعلق وہ اخفا کی مصلحتوں کا شکار کیوں ہوتے ہیں؟ ایک محقق کو یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ مداہنت یا مصلحت کا شکار ہو؟

ایک طرف فاضل مئولف کی فیاضی تحریر کا یہ عالم ہے۔ کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کا ذکر

کرتے وقت برطانوی عہد کے سرکاری افسروں کی اس سطح پر اتر آیا ہے۔ جس سطح کو انگریزی عہد کا نوشتہ کمال سمجھا جاتا تھا اور آزادی خواہ خاندانوں سے متعلق سی۔ آئی۔ ڈی۔ کی خفیہ سراغ رسانیوں کا منتہائے کمال تھا۔ مگر اتنے اہم خطوط کے سارق کا پتہ دیتے ہوئے مئولف کا قلم کانپتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تو ایک تحقیقی سانحہ ہے۔

ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے۔ کہیں ایسا تو نہیں، یہ خطوط سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے ہاتھ میں بک گئے۔ یعنی ایک مخبر نے چوری کئے اور اس سے سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ پہنچ گئے۔ اور منزل بمنزل اوپر تک پہنچا دیئے گئے اور ترقی حاصل کی۔

ملک برکت علی مرحوم ومغفور کے نام قائد اعظم علیہ الرحمۃ کے ان خطوط کی گمشدگی بلکہ چوری کا واقعہ ایک روزنامے کے فاضل ایڈیٹر کی زبان بہت عرصہ سے معلوم ہے۔ ملک صاحب مرحوم کے فرزند بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ بلکہ ایک فرزند نے اس کتاب کی اشاعت کا سن کر خود ہم سے اس کی توثیق کی۔ اور یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب یقیناً ہمارے دوست ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے ذمے ہے۔

(ہفت روزہ چٹان)

علامہ اقبال سے متعلق بعض قلمکاروں کے فہم وشکم کا افسانہ

علامہ اقبال کے فرضی دوستوں نے حقیقی دوستوں کو نظر انداز کر دیا ہے

﴿اوراقِ گم گشتہ پر تبصرہ﴾

ابھی چند دن پہلے جناب رحیم بخش شاہین ایم۔اے نے علامہ اقبال سے متعلق بعض غیر مدون تحریریں اوراق گم گشتہ کے نام سے شائع کی ہیں۔اس کتاب کے چار سواڑسٹھ صفحات ہیں۔اس میں ایک سو انیس ۱۱۹ تحریریں ہیں۔جو علامہ اقبال سے متعلق یکجا کی گئی ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ تمام مواد مختلف جرائد ورسائل سے فاضل مرتب نے جمع کیا ہے۔ابتداء میں ڈاکٹر اسلم قریشی ایم۔اے، پی ایچ ڈی کا تعارف نامہ ہے جس کی سوا چودہ سطریں ہیں۔اس سے آگے تاثرات کے زیر عنوان مشہور افسانہ نویس ایم اسلم کے قلم سے سو صفحے کے تاثرات ہیں۔فاضل مولف نے اپنی عقیدت واختصاص کے تحت علامہ اقبال سے متعلق مختلف افراد کے جذبات اور ان سے منسوب کلمات محفوظ کیے ہیں۔مثلاً بعض رسالوں کے متعلق علامہ کی رائے یا پھر کسی نہ کسی شخصیت کے متعلق ان کا خیال یا اسی طرح علامہ کی موت پر بعض شخصیتوں کے تعزیتی بیان! اس کے علاوہ ابتدائی دور میں کلام اقبال پر مولانا حسرت موہانی کی تنقید یا ۱۹۱۹ء میں ''زمانہ'' کانپور میں لیفٹیننٹ کرنل بھولا ناتھ کا ایک استفساری مراسلہ اور اس کے جواب میں خواجہ عبدالواجد ندوی کا مراسلہ شریک مجموعہ کیا گیا ہے۔ممکن ہے اس مجموعے سے شائقین اقبال کی تسکین ہو یا اقبال کے سوانح نگار کسی گمشدہ راستے کا پتہ لگا سکیں۔ لیکن ہماری ناچیز رائے میں علامہ اقبالؒ سے متعلق اس قسم کی تحریریں جمع کرنے کا شوق جس تیزی سے پاکستان کی علمی یا ادبی فضا میں پھیل رہا ہے اس سے کچھ عمدہ نتائج پیدا نہیں ہوئے۔بعض دوستوں نے کلام اقبالؒ کا وہ حصہ مرتب کیا ہے جو علامہ اقبالؒ نے اپنے ذہنی شعور کی پختگی کے ساتھ سوچ کے نئے دائرے میں حذف کر دیا تھا یا جن سے بہتر مصرعہ یا شعر سوجھنے پر پہلے مصرعہ یا شعر کو محذوف کر ڈالا تھا۔اس قسم کی کتابیں صرف اس لیے مرتب کی گئیں کہ بعض ناشروں نے مرتبین کو آمادہ کیا بعض بزرگوں نے علامہ اقبالؒ کے

دوستوں میں داخل ہونا چاہا اور بعض نے ان سے منسوب ہو کر اپنا نام قائم کرنا چاہا۔بلاشبہ اس قسم کے لوگ خود غرض نہ تھے اور نہ ان کی دیانت پر انگشت نمائی کی جا سکتی ہے۔شخصیتوں کے متعلق اس قسم کے مواد کی فراہمی ادبی بدعت ہے جس کا چسکا ہمارے منہ کو لگ چکا ہے۔ہمارے خیال میں علامہ کے متعلق سب سے بڑا ستم ان اداروں نے کیا جو سرکاری روپے سے قائم کیے گئے۔اور جس میں ہر قسم کے سرکاری افسر شامل ہو گئے۔ہم نے اس خیال کا بارہا تذکرہ کیا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے متعلق پاکستان میں جس طرز سے لٹریچر تیار کیا گیا ہے اس میں ادب بہت کم ہے حقیقت یہ ہے کہ مصنفین ومولفین نے فکر اقبال کی اہانت کی۔بعض نے اس کے لیے ایندھن فراہم کیا۔بعض کی سرکار کی چاکری کی اور کچھ لوگوں نے حقیقی اقبال لکھنا چاہا ہے۔اس سلسلے میں ایڈیٹر چٹان نے کتاب اقبالی مجرم میں حقائق سربستہ کی نشاندہی کی ہم نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ عرض کیا۔عبدالحکیم مرحوم نے اقبال اور خلیفہ نے لکھ کر علامہ کی روح کے لئے اذیت کا سروسامان کیا۔اسی طرح ''فکر اقبال'' ایک لغو کتاب ہے'' جب کوئی اقبالی اس قسم کی بے سروپا کتاب کے متعلق زبان نہیں کھولتا۔اقبالؒ سے متعلق پاکستان لکھا گیا تھا کہ یار لوگوں نے اقبال اور حیدر آباد مرتب کی۔''اقبال اور بھوپال'' کو شائع کیا۔شخصیات کے ضمن میں اقبال اور بابائے اردو حوالہ قلم کیں۔اقبال اور بھوپال محض اس لیے اشاعت پذیر ہوئی کہ ادبی انعامات تقسیم کرنے والے اس کے نصف کو حلقہ یاراں کی روایت کے تحت نوازنا چاہتے تھے۔اقبال اور بابائے اردو اگر ممتاز حسن کے قلم سے نہ ہوتی تو اس کی اشاعت کا سوال ہی نہ تھا۔ممتاز صاحب اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔بلاشبہ ان کے پہلو میں اقبالی دل تھا لیکن اقبال ... بابائے اردو کو ترتیب دے کر انہوں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔اس کتاب سے کوئی علمی اور ادبی روایت یا حکایت آشکار نہیں ہوتی۔بابائے اردو کا اپنا مقام تھا۔علامہ اقبالؒ اپنے مقام پر تھے۔دونوں میں روابط وتعلقات اس درجہ نہ تھے۔کہ اس پر کتاب لکھی جاتی لیکن شخصیت کے متعلق دو ایک مکاتیب سے کتاب لکھنا قلم کی آوارہ خرامی ہے۔اس سلسلے میں سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ علامہ اقبال سے متعلق جن لوگوں نے اپنی ملاقاتوں کے مفروضے پر قلم اٹھایا ہے۔ان میں سے اکثر نے افسانہ سرائی کی ہے یا سیاسی کتھا بگھاری یا پھر ان کے ذکر سے خود کو نمایاں کرنا چاہا ہے۔جو لوگ اقبالؒ پر لکھ سکتے تھے ان کی بڑی تعداد واصل بحق ہو گئی۔کچھ سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو کر بیٹھے ہیں کئی نہ جانے کیوں

اپنے قلم کو جنبش نہیں دیتے۔ اس وقت بھی سید نذیر نیازی علامہ اقبالؒ کے متعلق بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ حالات کی بے رحمیوں کا شکار ہیں۔ ان کا دماغ برسوں سے سکون کی تلاش میں ہے۔

اس سلسلے میں لیگ کے بزرگ راہنما میاں امیر الدین بہت کچھ جانتے ہیں۔ ان کی علامہ سے عزیز داری بھی ہے، لیکن وہ قلم کے آدمی نہیں اور سن رسیدگی کے باعث اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی سیاسی دور کی تو بہت سی باتیں نجی محفلوں میں سناتے ہیں لیکن قلمبند نہیں کر سکتے کہ ان میں ذہنی تعصبات سے لڑنے کا حوصلہ نہیں یا پھر پاکستان کی سیاسی فضا ان واقعات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال سے متعلق روایت و حکایت کا بہت بڑا سرمایہ صرف اس لیے غارت ہو رہا ہے کہ ہمارے سیاسی حالات اس کے موافق نہیں۔ چودھری محمد حسین ایم اے علامہ اقبالؒ کے دستِ راست تھے۔ ان کے پاس علامہ اقبال سے متعلق بہت کچھ تھا۔ اور وہ اکثر و بیشتر اس داستان کے مختلف اوراق سنایا کرتے تھے لیکن ان کی موت کے ساتھ وہ تمام سرمایہ پیوندِ خاک ہو گیا۔ ان کے ایک فرزند سول جج ہیں اور وہی بتا سکتے ہیں کہ چودھری صاحب نے اس سلسلے میں کوئی تحریری مواد چھوڑا ہے یا نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر، علم و قلم کے اعتبار سے یگانہ عصر شخصیت تھے۔ راقم نے ان کے پاس اپنی آنکھوں سے اس روزنامچے کی دو چار کاپیاں دیکھی ہیں جو علامہ اقبالؒ سے ملاقات کے بعد قلم بند کرتے تھے لیکن نہ جانے اب وہ روزنامچہ کہاں ہے۔ اگر مولانا مہر اس کو مرتب کر کے شائع کر دیتے تو ہمارے لیے بہت بڑا علمی سرمایہ ہوتا۔ اقبال سے متعلق ان چیزوں کو دیکھ کر کئی سلسلے ذہن میں آتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز جو ذہن میں بار بار ابھرتی ہے وہ تاریخ کا سوء استعمال ہے، تاریخ یہ نہیں کہ ہم یکطرفہ چلیں۔ تاریخ میں اختلاف و اتفاق۔ کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خانؒ، علامہ اقبالؒ سے ایک گونہ تعلق رکھتے تھے اور یہ تعلق اس زمانے سے تھا جب مولانا نے حیدر آباد سے واپس آ کر والد کی وفات کے بعد یکم جنوری ۱۹۱۰ء کو زمیندار نکالا۔ اس زمانے کے "زمیندار" اور "ستارہ صبح" میں علامہ اقبال سے مذاکرات۔ کی بہت سی حکایتیں ہیں۔ "زمیندار" کے فائل موجود ہیں انہیں پڑھ کر مسرت و حیرت ہوتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاںؒ کا یہ تعلق علامہ سے ان کی موت تک قائم رہا۔ خود راقم تین چار دفعہ مولانا کے ہمراہ حضرت علامہ کے بنگلے پر گیا اور دونوں کی بے تکلفی کا اندازہ کیا۔ مولانا

کا اس لئے ذکر نہ کرنا کہ وہ علامہ اقبال کے عقیدت مند نہ تھے بلکہ معاصر تھے ایک تاریخی بد دیانتی اور علمی بے بصری ہے۔ راقم کے شعور کا اس زمانے میں سن آغاز تھا۔ ان مذاکراتی گہرائیوں میں اترنا یا ان کے فہم سے مالا مال ہونا مشکل تھا جو ان دو شخصیتوں کے مذاکرات کا لب لباب ہوتیں۔ لیکن ایک چیز راقم کو ابھی تک یاد ہے کہ حضرت علامہ نے ایک دفعہ مولانا سے زبان کے سلسلے میں مشورہ کیا اور مولانا نے بتایا کہ فلاں محاورہ یوں نہیں یوں ہے اور فلاں لفظ کا محلِ استعمال اساتذہ کے نزدیک اس طرح ہے۔

راقم کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور چودھری افضل حق مرحوم کے علامہ اقبال سے روابط کا بھی علم ہے ان کے ساتھ دو تین دفعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ان ملاقاتوں کے تاثرات بھی قلم بند کیے جا سکتے ہیں۔ راقم اس بارے میں بعض پوچ کتابوں کی اشاعت کے بعد سوچ رہا ہے کہ اس عنوان سے بحوالہ اسناد کوئی کتاب تالیف کی جائے تو وہ کئی اعتبارات سے ایک مفید کتاب ہو سکتی ہے۔

ادبی صنمکدوں کے بت ہو گئے پرانے

بعض ممتاز افراد سے تعلقات کے ایک خاص تقاضے یا شاید علم و ادب پرستی کے خیال سے مرحوم وزارتوں نے کچھ اہل قلم کی ملی بھگت پر اپنا دست شفقت رکھا تھا۔ اللہ مغفرت کرے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بڑے زندہ دل بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے روابط کو کام میں لا کر ادھر اُدھر سے سرو سامان جمع کیا۔ ملک غلام محمد مرحوم اوران کے بعض نانیبین خلیفہ صاحب کے جگری دوست تھے۔ نتیجتہ انہیں ہر سال مرکزی اور صوبائی خزانے سے گرانقدر رقمیں ملتی رہیں۔ جس سے تالیف و تصنیف کے تین مختلف ادارے فیضیاب ہوتے چلے گئے۔

(۱) مجلس ترقی ادب لاہور (۲) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (۳) بزم اقبال، لاہور

تینوں اداروں کا انتظام عملاً خلیفہ صاحب اوران کی معرفت بعض دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ خلیفہ صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کی کہانی طویل اور دلچسپ ہے۔ صحت کا ذکر بے محل ہوگا۔ تاہم خلاصہ یہ ہے کہ

(الف) بعض صحیح اور غلط قسم کے اہل قلم کا میکدہ آباد ہو گیا۔ جس میں کچھ پیر مغاں تھے، کچھ قدیم بادہ خوار۔ بعض تلچھٹ کے شوقین۔ بعض تازہ وارد اور دو چار اس وضع کے رند یا زاہد، جنہیں ساقی کی گردش نگاہ مے کشی کی راہ پر لے آتی ہے۔

اہل قلم کو ان کی صلاحیت اور اہلیت سے بڑھ کر معاوضہ ملنے لگا۔ چونکہ روپیہ اپنا نہیں تھا اور نہ کسی ادارے یا فرد کو روپیہ پیدا کرنے کی خاطر تگ و دو کرنی پڑی۔ لہذا سرکاری خزانہ سے جتنی رقم ہاتھ لگی یاران میکدہ میں تقسیم ہوتی رہی۔ نتیجہ معلوم، کہ بعض اچھی کتابوں کے ساتھ بعض ناکارہ کتابیں بھی ردی کی صورت میں چھپی پڑی ہیں۔

(۳) ادھر لوگوں میں بوجوہ یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی مطبوعات سرکاری ضرورتوں

کا اسلام اور سرکاری مصالح کی شریعت پیدا کر رہی ہے۔ اپنے اندازے کے مطابق معاملہ بالکل ہی یہ نہ تھا کسی گوشے کا کوئی پہلو مخفی رہا ہو، لیکن ہم شک میں نہیں پڑنا چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ دو چار بزرگ ہستیوں کو چھوڑ کر ایسے لوگ جمع کر لیے گئے جو اہل قلم میں ممتاز و ثقہ نہ تھے اور ان سے جن موضوعات پر کتابیں لکھوائی گئیں ان کے بارے میں ان کا علم مستعار اور سماعی تھا۔ روپیہ خرچ کرتے وقت کسی نے دریغ محسوس نہیں کیا۔ مصنف، مؤلف اور کتاب کی تیاری تک ہر مرحلہ میں فیاضی برتی گئی۔ مثلاً پیشتر کتابوں پر کتابت کے اسراف کی بدولت دوگنا کاغذ خرچ ہوا۔ اگر قلم کو نسبتاً باریک رکھا جاتا یا اور بعض دوسری کتابی رعایتیں پیش نظر رہتیں تو ایک کتاب پر جو رقم اٹھی ہے اس میں دو کتابیں تیار ہوتیں۔ اکثر کتابیں ایسی ہیں کہ اسراف کی حد ہو گئی ہے۔ مثلاً ایک کتاب 20x30/16 سائز کے تین سو صفحوں میں ختم ہو سکتی تھی اس کو دگنے سائز کے چھ سو صفحوں پر ختم کیا گیا۔ مقصود روپیہ بانٹنا تھا اور وہی بٹتا رہا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی !!! کہ مصنفوں اور مؤلفوں کو کتابت اور سائز کے اعتبار سے کتابوں کی اجرت دی جاتی ہو، اور وہ ضخامت بڑھانے ہی میں اپنا نفع دیکھتے ہوں۔ یعنی علم کے اعتبار سے اضافہ ان کے بس سے باہر ہو اور ضخامت کے لحاظ سے اضافہ زراندوزی کی سہل صورت، اور یہ طریق انہوں نے اختیار کیا۔ لیکن اس سے جو نقصان ہوتا ہے وہ غور طلب ہے۔

(ب) کاغذ کا خرچ، کتابت کا خرچ اور طباعت کا خرچ، تینوں بڑھ گئے۔

گویا اس ادبی، علمی اور مذہبی خسران کا سارا ماتم یہ ہے کہ تمام کڑیاں قریب قریب ریاستی ہو کر رہ گئی ہیں۔ مرحوم ہندوستان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ مہاراج یا اعلحضرت کسی پر خوش ہوئے تو اسے داروغہ صفائی سے اٹھا کر ڈائریکٹر تعلیمات بنا دیا گیا اور تھانیدار کو سول سرجن وغیرہ۔

زیر بحث تینوں اداروں کی انتظامیہ وحدت کے واجب الاحترام ارکان کا اہل قلم کے چناؤ میں بھی غالباً یہی طرز عمل رہا ہے۔ اس سے بڑی بڑی نافع اور مستند کتابیں، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کے اہتمام میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کا قلم اور سائز ملاحظہ کیجئے۔ معلوم ہوگا کہ ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھکی ہوئی ہے، رہا علم تو وہ ان اداروں کے شہ دماغوں کا ورثہ ہے۔

اس کے برعکس ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ زیر بحث اداروں میں (الا ماشاء اللہ) علم کی

سنجیدگی اور تفکر کا سکون بالکل مفقود ہے اور "مار دھاڑ زیادہ ہے۔"

بزم اقبال نے اقبالیات پر کچھ کتابچوں کے علاوہ ذکر اقبال مولفہ (عبدالمجید سالک) فکر اقبال (مولفہ خلیفہ عبدالحکیم) اور شعر اقبال (عابد علی عابد) شائع کی ہیں۔ کتابچوں میں "ملا اور اقبال" کا پوسٹ مارٹم ہم نے کئی سال ہوئے ہیں اس قطعیت کے ساتھ کیا تھا کہ صدائے بازگشت عدالت عالیہ تک جا پہنچی تھی۔ اس وقت کی سرکاری ضرورتوں نے اس کتابچہ کو لکھوایا تھا۔ اور اقبال کے نام پر ایک ایسی دھاندلی کی گئی تھی کہ ادبی دیانت سے متعہ کی نظیر آج تک پوری تاریخ ادبیات میں ناپید ہے۔ فکر اقبال کا تجزیہ بھی ہم شرح و بسط کے ساتھ کر چکے ہیں۔

آج کی صحبت میں تلمیحات اقبال کے نوادرات ملاحظہ فرمایئے۔ ضخامت کے اسراف سے قطع نظر ہم یقین و علم کے دعویٰ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ

۱۔ پوری کتاب اغلاط کا ایک ایسا دفتر ہے کہ اس کے ڈھیر کو چوراہہ میں رکھ کر آگ لگا دی جائے تو زیاں کا کسی کو ملال نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے خاکستر ہو جانے سے بعض اہل قلم کو خوشی ہوگی کہ ایک معروف اہل قلم کی لاج رہ گئی۔ یعنی اس کے علم کا ہلتا ہوا مینار زمین پر نہیں آ رہا ہے؟

۲۔ علامہ اقبال کے اشعار آبدار کے اشارات و کنایات کی توضیحوں اور تشریحوں کے لئے تلمیحات مرتب کی گئی ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ جن اشارات و کنایات اور افراد و احوال کا ذکر اشد ضروری تھا۔ انہیں یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ (اور اب یہی بات کہی جا سکتی ہے) مولف تحقیق و مطالعہ کی زحمت سے بچنا چاہتے تھے، یا وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتے، اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے انہوں نے خصوصیات سے صرف نظر کیا۔ اور عمومیات پر تلمیحات کا پورا محل بنا دیا ہے۔ ان نوادرات میں سے فی الحال شخصیات کے ذکر کو لے لیجئے۔

بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، ارمغان حجاز کی اردو نظموں میں حکیم الامت نے جن شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ اس کا نوے فی صد حصہ تلمیحات میں ادھورا، ناقص، بے ڈھنگ، شاعری کی غایت سے دور، گستاخانہ اور جاہلانہ ہے۔ پھر اس حصہ میں سے بھی ان شخصیتوں کو لیجئے، جو کل تک ہمارے درمیان تھیں اور جن کے بارے میں تحقیق و مطالعہ چنداں دشوار نہیں ۔۔۔ مثلاً سر فضل حسین، خود مولف کا پہلا فقرہ ہے کہ برِ اعظم

ہند و پاکستان کے مشہور سیاستدان تھے لیکن ان کی اپنی واقفیت کا یہ حال ہے کہ

"لاہور کی میاں فیملی کے مقتدر رکن تھے اور یہاں کی سیاسی اور شہری زندگی کے محور۔ سر کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔"

یہ نوازے گئے پر تھوڑا سا مسکرا لیجئے اور پھر عابد کی اس غلط فہمی کو دور کر دیجئے کہ سر فضل حسین لاہور کے نہیں بٹالہ کے راجپوت تھے۔ لاہور کی میاں فیملی سے مراد سر میاں محمد شفیع کا الرائیں خاندان ہے۔ میاں فضل حسین اس خاندان کے مقتدر رکن نہیں تھے اور نہ وہ لاہور کی سیاسی یا معاشرتی زندگی کا محور تھے۔

(۲) علامہ اقبال داغ مرحوم کا ماتم دل سوزی سے کرتے اور وقت کے ساتھ اشک کے دانے زمین شعر میں بوتے ہیں۔ غلام رسول مہر کے الفاظ میں یہ اردو شاعری میں پہلا مرثیہ ہے جس میں مرنے والے کا ماتم بھی بڑے پر تاثیر انداز میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کی خصوصیتیں بھی ٹھیک ٹھیک بیان ہوئیں اور انداز بالکل نیا ہے، لیکن عابد نے تلمیحات کے تحت داغ کو جو خراج ادا کیا ہے وہ ملاحظہ فرمایئے۔

"ان کے متعصب مخالف بھی اس بات سے انکار کر چکے ہیں (۱) کہ وہ نواب شمس الدین خاں خلف نواب احمد بخش خاں کا بیٹا تھا (۲)۔ البتہ یہ بات کہ آیا ان کی والدہ شمس الدین کے عقد نکاح میں تھیں یا نہیں؟ محل نظر ہے۔"

(۱) اور (۲) کو غور سے پڑھیئے، کوئی مفہوم نکلتا ہے؟ عقد نکاح کی ویسے داد دے لیجئے۔ لیکن آگے چلئے عابد کا ارشاد ہے۔

"بہ قطع و یقین دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ داغ کی ماں خانگی یا طوائف تھی اس کی لڑکیاں یا لڑکی بھی اسی زمرے میں شامل تھیں اور یوسف والیاں کہلاتی تھیں۔"

انا للہ و انا الیہ راجعون

اور سن لیجئے! داغ کی والدہ چھوٹی بیگم یوسف سادہ کار کی لڑکی تھی، اور ذات کی کشمیری تھی۔ (ممکن ہے عابد صاحب کے ذہن میں اقبال کے مرثیہ یا ان کی تلمیح کا یہی ایک رخ ہو) چھوٹی بیگم نے چار شادیاں

کیں۔ پہلی نواب شمس الدین خاں سے (بیان کیا جا چکا ہے کہ اس شادی کی حیثیت مشتبہ ہے) داغ اس تعلق خاطر کا ثمر ہے، دوسری شادی آغا تراب سے ہوئی جن سے ان کا ایک لڑکا مرزا شاغل کے نام سے ہوا۔ (بلحاظ انشا غلط ہے راقم)۔ تیسری شادی مرزا فخرو، ولی عہد بہادر شاہ ظفر سے ہوئی۔ مرزا خورشید عالم انہی مرزا فخرو کے صاحبزادے تھے۔ چوتھی شادی ایک انگریز بلاک نامی سے ہوئی جس سے بادشاہ بیگم مخفی پیدا ہوئی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے بھائی داغ سے اصلاح لیتی تھی۔۔۔۔۔۔!

''داغ نے عشق حقیقی کو عشق مجازی سے علیحدہ کر دیا۔ اور اس کے جنسی پہلوں پر زیادہ زور دیا۔ یہی داغ کی کمزوری ہے اور یہی اس کی شاعری کا طغرائے امتیاز''

(تلمیحات اقبال صفحہ 29.28.27)

ہماری طرف سے ان لولوے لالا پر تبصرہ کی کوئی سی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اقبال کا مرثیہ پڑھیے، عابد کی تشریح دیکھ لیجیے۔ اور اخلاق کا ماتم کیجیے، ع

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

اقبال اس لئے رویا تھا کہ جہاں آباد کا آخری شاعر خاموش ہو گیا۔ صبا سے سکوت گل کا راز پوچھنے والا نہ رہا۔ نالہ بلبل کا ہمراز جاتا رہا۔ مضمون کی باریکیاں اور فکر نکتہ آرا، کی فلک پیمائیاں ختم ہو گئیں۔ تلخیِ دوراں کا نقشہ کون کھینچے گا۔ اور تخیل کی نئی دنیا میں ہمیں کون لے جائے گا۔ المختصر

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اور عابد کے ترکش کا تیر کہاں ترازو ہوتا ہے؟ کہ داغ خانگی کا بیٹا تھا۔۔۔

عابد صاحب جھنجھلا کر شاید یہ فرمائیں کہ صاحب تاریخ سے بدکتے کیوں ہو۔۔۔؟ بہت اچھا! فرمائیے آپ میں سے کوئی شخص یا آپ خود اپنے بارے میں اس قسم کی لغویات سننے کے لئے تیار ہیں؟

(۳) ٹیپو سلطان کی تاریخ ولادت کے متعلق اختلاف ہے یہ مسلم ہے کہ اس کے آبا و اجداد پنجابی تھے اور ہجرت کر کے گلبرگہ میں آباد ہو گئے تھے۔۔۔ (تلمیحات اقبال صفحہ ۱۵۳)

ہجرت کے لفظ پر غور فرما لیجیے۔ معلوم ہوتا ہے عابد صاحب ہجرت کے معنی قطعاً نہیں جانتے۔ یہ واقعہ اتنا ہے کہ ٹیپو کے والد حیدر علی کے پردادا ایک صوفی منش پنجابی درویش تھے۔ جنوبی ہندوستان میں اسلام کے لئے آب و ہوا کو موافق پایا تو وہاں چلے گئے۔ مزید برآں ٹیپو پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اتنا بے محل اور سطحی ہے کہ واقعات کے پوسٹ مارٹم پر اٹھا رکھتے ہیں۔

(۴) (شیخ مجدد کے بارے میں) عابد صاحب نے نام و نسب کچھ نہیں لکھا۔ شیخ مجدد عنوان کے تحت تیرہ چودہ سطریں لکھ دی ہیں۔ جو بالکل ہی اوپری ہیں۔ ان اوپری معلومات کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو۔

اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر نے معلوم نہیں کس مصلحت کی بنا پر اپنے دربار میں طلب کیا۔ تلمیح نگار کی تحقیق پر صاد کیجیے۔ اسے کہتے ہیں۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

ایک اور فقرہ پڑھ لیجیے۔ آپ کی قلعہ گوالیار میں قید کا ذکر اس طرح ختم ہوتا ہے:۔

''ایک سال بعد جہانگیر کو جانے کیا خیال آیا رہائی کے احکام صادر کر دیے۔ اس کے بعد جہانگیر کے دل میں ان کی عقیدت پیدا ہو گئی''

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

عابد صاحب قلم تشریح و توضیح اور تحقیق و تدقیق کے لئے اٹھاتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ مٹھی کو ہوا میں تھامنے کی کوشش میں اس طرح کے موتی پرو کر قارئین کو تذبذب کی راہ پر چھوڑ جاتے ہیں۔

(۵) فاطمہ بنت عبداللہ:۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ ترک اس وقت بہت کمزور تھے۔ لیکن اس کے باوصف (باوجود ہونا چاہیے تھا۔ راقم) جان پر کھیل گئے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ اسی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی۔ اس کی عمر چودہ سال تھی۔ (تلمیحات۔ صفحہ ۵۹)

فرمائیے اس سے کچھ معلوم ہوا؟

فاطمہ بنت عبداللہ۔۔۔۔ قبیلہ ابراھمہ کے سردار کی صاحبزادی تھی، شہادت کے وقت اس کی عمر گیارہ سال تھی، چودہ سال غلط لکھا ہے۔ جون ۱۹۱۲ء میں بارہ ہزار اطالویوں نے زوارہ کے مقام پر حملہ کیا۔

مقابلے میں عرب اور ترک صرف تین ہزار تھے۔ لڑائی عصر تک جاری رہی۔ آخر اطالوی بارہ سو لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس معرکہ میں فاطمہ کے والد شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان کی عورتیں بھی شریک تھیں۔

احمد نوری بھی ایک ترک افسر اپنے تیس سپاہیوں کا دستہ لے کر عرب مجاہدوں کی اعانت کو جا رہا تھا کہ راستہ میں اس کی مڈھ بھیڑ ایک اطالوی جیش سے ہوگئی۔ فاطمہ اس دستہ کے ساتھ تھی۔ پہلی جھڑپ میں چار ترک سپاہی زخم کھا کر گر گئے۔ فاطمہ اپنا مشکیزہ اٹھا کر کراہتے ہوئے زخمیوں کو پانی پلانے کے لئے بڑھی تو ایک اطالوی نے اس کا گریبان پکڑا۔ اس نے پھرتی سے زخمی ترک کی تلوار اٹھائی اور اس زنانے کا وار کیا کہ اس کا پہنچا کٹ کر لٹک گیا۔ فاطمہ وار کر کے نکل گئی مگر اطالوی نے عقب سے بندوق کا فائر کیا جس سے وہ ڈھیر ہو کر شہید ہوگئی۔

افسوس! عابد صاحب نے الہلال سے اخذ کا حوالہ دے کر بھی صحیح نقل نہیں کی۔

اس سے اندازہ کر لیجیے کہ علمی تاریخ اور فقہی افکار و احوال میں انہوں نے کس قسم کی محنت و کاوش برتی ہوگی۔

(۶) ملکہ الزبتھ موجودہ فرمانروائے برطانیہ کے تایا ڈیوک آف ونڈسر کی تخت سے دستبرداری کا قصہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ عام محاورے کے مطابق یہ کہیے کہ کل کا واقعہ ہے۔ خود ڈیوک اور اس کی اہلیہ نے اپنے حالات لکھے ہیں۔

عابد صاحب کی اچھوتی بانگی ملاحظہ ہو۔

''امریکہ کے اخباروں میں مسلسل و متواتر یہ خبریں چھپ رہی تھیں کہ یہ بادشاہ مسز ہمپسن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

یہ خاتون امریکی نژاد تھی اور طلاق یافتہ بھی تھی۔ برطانیہ کے عوام نے یہ پسند نہ کیا کہ مسند نشین بادشاہ (گویا غیر مسند نشین بادشاہ بھی ہوتے ہیں۔ راقم) ایک ایسی عورت کو ملکہ کا رتبہ بخشے جس سے کچھ دوسرے مرد انتہائی بے تکلفی سے گفتگو کرنے کے حق دار ہوں۔ کچھ عرصہ یہ چلتا رہا۔ ان دنوں بالڈون انگلستان کے وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے رائے عامہ کی تائید کی اور ایڈورڈ ہشتم کو سمجھانے کی کوشش کی

لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔الخ

یہ کتاب فاضل رجل جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان کے نام انتساب کی گئی ہے۔ عابد صاحب ام کی بارگاہ ادب میں حاضر ہو کر دریافت فرمالیں کہ ایڈورڈ ہشتم کے تخت سے دستبردار ہونے کا باعث کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عابد صاحب نے کبھی معلوم کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ برطانیہ کا شاہی خاندان ہے کیا؟ اور کس قسم کی پابندیوں کے قصر میں اسے رہنا پڑتا ہے۔

''برطانوی عوام کو یہ پسند نہ تھا کہ ایک ایسی عورت ملکہ ہو جائے جس سے دوسرے مرد انتہائی بے تکلفی سے گفتگو کرنے کے حق دار ہوں''۔

لہذا ایڈورڈ ہشتم رخصت ہوگئے۔ یہ صحیح ہے کہ ایڈورڈ ہشتم کو مسز ہمپسن کے لئے تخت چھوڑنا پڑا اور برطانوی پارلیمنٹ اس کے لئے تیار نہ تھی۔ کہ ان کا بادشاہ کسی ایسی عورت سے شادی کرے جو شاہی خاندان سے نہ ہو۔ اور مطلقہ بھی ہو مگر ''دوسرے مردوں سے بے تکلفی'' کی شرح و تفسیر فاضل مؤلف ہی کے ذہن نکتہ پیما کی ایجاد ہے اور ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جہالت کی حد ہوگئی۔

تلمیحات اقبال

''تلمیحات اقبال'' کے بارے میں ہم نے گزشتہ اشاعت میں جو کچھ عرض کیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ سید عابد علی عابد اپنے اشغال شبینہ کی رعایت سے اس ''دفتر بے معنی'' کو ''غرق مے ناب'' کردیں، یا ''بزم اقبال'' تمام جلدوں کو یکجا کر کے 'آگ کے الاؤ' کی بھینٹ چڑھادے، کوئی شخص نہ ہوگا، جسے اس کے خاکستر ہو جانے پر افسوس ہو۔

معلوم ہوتا ہے مولف کو تلمیح کے معنی ہی معلوم نہیں۔ اگر مولف کو مفہوم سے آگاہی ہوتی، تو وہ کم سے کم اس کے تحت افراد و شخصیات کا تذکرہ نہ کرتے۔

پہلے قیاس تھا کہ مولف خود محنت نہیں کرتے۔ اپنے کسی شاگرد یا دوست کو کام تفویض کر دیتے ہیں۔ وہ چند معروف و معلوم کتابوں کی مدد سے نقل و اقتباس کر لیتے اور اس طرح ایک تالیف یا تصنیف تیار ہو جاتی ہے۔ اب ان کی بعض دوسری کتابوں کے دیکھنے اور پڑھنے سے اندازہ ہوا ہے کہ عابد صاحب ایک قلیل البضاعت محرر ہیں۔ انہیں چند سو الفاظ، سو، سوا سو فقرے، بیشتر ترکیبیں اور کچھ محاورے نوک زباں ہیں۔ جن کے ارد گرد اپنے قلم کا تارو پود بنتے رہتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عابد صاحب نے اقبال کی آڑ میں ان احکام و مسائل پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے گریز نہیں کیا، جو قرآن و اسلام کے نزدیک مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں۔

علامہ اقبال نے ملا و صوفی پر (خصوصیت سے) اس لیے بھی طعن و طنز کیا ہے، کہ وہ جہاد کی حسب منشا تاویلوں سے اصل اسلام کو ضعف پہنچاتے، اور جس اساس پر دعوت اسلام کا انحصار ہے اسے اپنائے سلطنت کی خوشنودی کے لئے ڈھاتے ہیں۔ ضرب کلیم میں اس سے متعلق واشگاف اشارے موجود ہیں۔ میرزا غلام احمد کی نبوت ظلی پر حضرت علامہ کے اعتراض کی بنیادی وجہ ہی یہ تھی، کہ وہ روح جہاد سے خالی ہے۔ تلمیح یا کنایہ ملاحظہ ہو۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

عابد صاحب کی زبان سے جہاد کے اس کنایہ یا بقول ان کے تلمیح کا مفہوم سن لیجئے۔ (صفحہ ۱۱۳)

جہاد کا مسئلہ فقہ اسلامی کے متنازعہ فیہ مسائل میں شامل ہے۔ اسی ارشاد کے بعد عابد صاحب تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ''مجھے تو یقیناً یہ حق حاصل نہیں کہ اس مسئلہ پر تحقیق سے گفتگو کر سکوں''

ان سے پوچھئے کہ جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کو تحقیق کا حق حاصل نہیں، تو وہ بات جو حضرت علامہ نے تحقیق سے کہی ہے، اس تلمیح پر تشریح کی عمارت اٹھانے کا مشورہ آپ کو کس نے دیا ہے؟ ادھوری بات کہنے اور لکھنے سے فائدہ؟

شوستری نے اسلامی ثقافت کے خاکہ میں جن آیات قرآنی کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ بہ تفصیل ذیل ہے ۴۰۔۳۹/۲۲، ۱۹۰/۱۱، ۱۹۱/۱۱، ۱۹۲۔۱۹۳/۱۱، ۷۳/۹، ۲۵/۱۵، ۹۰/۶، ان ایات کے مطالعہ سے مستفاد ہوتا ہے کہ!

(۱) اگر کسی ملک میں مسلمانوں پر ظلم کیا جا رہا ہو، تو دوسرے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ جہاد پر آمادہ ہو کر اپنے ہم مذہبوں کی مدد کریں۔

(۲) علاوہ ازیں جب لڑائی کی ابتداء، کافروں، اور مشرکوں سے ہوئی ہو، تب بھی جہاد لازم ہے۔

(۳) اس کے علاوہ جتنی صورتیں ہیں، وہ شکوک سے خالی نہیں۔''

علامہ اقبال زندہ ہوتے، تو دور حاضر کے اس مساطی کی اس ''مینا کاری'' پر خودکشی کر لیتے۔ اور شوخی ملاحظہ ہو، عابد صاحب رقمطراز ہیں۔

جو لوگ اس سلسلہ میں تحقیق کرنا چاہیں، وہ نیچے دیے ہوئے ماخذوں سے رجوع فرمائیں۔

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد کے مختلف مضمون جہاد کے متعلق جو، ان کے مضمونوں کے مجموعہ میں ہیں۔

(راقم۔ مختلف مضمون جو ان کے مضمونوں کے مجموعہ میں ہیں۔ اس فقرے کی داد دیجئے، یہ ایک محقق اور ادیب کے قلم سے ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔)

(۲) الجہاد فی الاسلام۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید صاحب ہی کے دوسرے مقالات جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔

اورخود عابد صاحب نے شوستری کے علاوہ کس سے استدراک کیا ہے، فرماتے ہیں۔

(دیکھئے غیاث اللغات، منتخب اندراج ہفت قلزم) یعنی خود عابد صاحب نے اندراج وغیرہ سے استدراک کیا، اور قاریوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے رجوع کریں۔

کاش عابد صاحب نے خود ہی رجوع کیا ہوتا، تاکہ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا، کہ جہاد نہ تو متنازعہ فیہ مسئلہ ہے، اور نہ اس کی کوئی صورت مشکوک ہے۔ داغ کے بارے میں گوہر افشانی فرماتے ہوئے آپ یہاں تک نکل گئے کہ اقبال کے ادب واحترام کو بھی ملحوظ نہ رکھا، اور تین صفحے سیاہ کر دیئے، کہ وہ طوائف کا بیٹا تھا۔ لیکن یہ عجب صراحت تلمیح ہے کہ جہاد ایسے اہم مسئلہ پر، کہ اقبال کی تعلیمات کا مرکز ومحور ہے، آپ تحقیقی کتاب لکھتے ہوئے بھی تحقیق کے میدان میں اپنے عجز کا صحیح اعتراف کر کے چھٹکارا چاہتے ہیں۔

اب ایک لمحہ کے لئے ہم تسلیم کر لیں، کہ جہاد کی وہی صورتیں حق ہیں، جو آپ نے لکھی ہیں اور باقی سب مشکوک ومشتبہ ہیں۔ تو فرمائیے، سیدنا امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سانحہ شہادت کی بابت آپ کیا کہیں گے، جو ان دونوں صورتوں کے برعکس ایک تیسری معصیت کے خلاف افضل الجہاد تھا۔

سرداد، نہ داد دست، دردست یزید

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں تمہیں پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں۔

جماعت، سمع، اطاعت، ہجرت اور جہاد

ان میں سے کوئی سی بات بھی اختلافی نہیں، ظاہر ہے کہ جہاد، جہد سے ہے۔ مفردات راغب کے حوالہ سے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے، کہ دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم وباقی رکھنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی اور جان سے بھی۔ غرض جس قسم کی ضرورت ہو جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ اگر لغوی معنی ہی مقصود تھے تو اس سے بہتر اور کیا معنی ہو سکتے تھے۔ قرآن پاک کے لئے فرمودات کی صحیح تفسیر خود سرور کائنات ﷺ کے فرمودات میں مضمر ہے۔ حضور فرماتے ہیں۔ ''سب سے بہتر اس آدمی کی موت ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے۔'' حضور ﷺ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد وقرار لیتے تو ایک اقرار

یہ ہوتا کہ میں ہمیشہ حق کا اعلان کروں گا۔ خواہ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں۔

حضور ﷺ نے فرمایا نیکی کا اعلان کرو۔ برائی کو روکو۔ اگر یہ نہ کرو گے تو ایسا ہو گا کہ نہایت برے لوگ تم پر حاکم ہو جائیں گے اور خدا کا عذاب تمہیں گھیر لے گا۔ تم دعائیں مانگو گے کہ یہ حاکم ٹل جائیں۔ مگر قبول نہ ہوں گی۔

سید عابد علی عابد ممکن ہے اب بھی کچھ نہ سمجھیں۔ انہیں کے لئے عرض ہے لاہور سے ایک مشہور روزنامہ ''نوائے وقت'' نکلتا ہے۔ اس کے اداریہ کی پیشانی پر ہر روز مرقوم ہوتا ہے۔

بہترین جہاد سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔

اب کچھ سمجھے؟ (باقی دارد)

نوٹ: اس تنقیدی جائزہ کی آخری سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب مزید کچھ لکھنا چاہتے تھے لیکن نہ لکھ سکے۔ یہ تنقیدی جائزہ نامکمل ہے۔ بہر حال جو ہمیں دستیاب ہوا قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مؤلف

اقبال کے نام پر ادبی اللّے تللّے

عطیہ فیضی کے خطوط، اقبال اور بھوپال اور اقبال اور حیدر آباد کا تنقیدی جائزہ

ہم اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ سے متعلق جو کتابیں اس وقت تک چھپ چکی ہیں ان میں سے کئی ایک کتابیں ہمارے عاجزانہ فہم سے بلند ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے علامہ اقبال کے افکار پر ایک ضخیم کتاب فکر اقبال لکھی۔ اس پر کئی ایک معیاری جرائد نے نہایت وقیع الفاظ میں ریویو کیا۔ حتی کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رسالہ ''معارف'' نے بھی خلیفہ صاحب مرحوم کو افکار اقبال کا مفسر اعظم قرار دیا۔ تب ہمیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ معارف جیسا عظیم ماہنامہ بھی بسا اوقات شخصیات کی رعایت سے تبصرہ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فکر اقبال ایک انتہائی لچر کتاب ہے۔ اس میں خلیفہ صاحب مرحوم نے اپنی فلسفیانہ قابلیت کے جوہر ضرور دکھائے ہیں اور یورپ سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کو ایک مرعوب ذہن کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے لیکن فکر اقبال کا علامہ کے نظریات و افکار سے وہی تعلق ہے جو قبل از تقسیم روزنامہ ''پرتاپ'' لاہور کے ایڈیٹر مہاشہ نانک چند ناز کا ادبیات اردو سے تھا۔ خلیفہ صاحب نے ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ''ملا اور اقبال'' کے عنوان سے سرکاری خواہش پر ایک مختصر سا کتابچہ لکھ کر اقبال سے شدید ناانصافی کی ہے۔ اسی طرح پروفیسر عابد علی عابدؔ نے شعر اقبال لکھ کر تصورات اقبال کو مجروح کیا۔ لیکن ان سب کتابوں سے بڑھ کر جو کتابیں ہمارے فہم و نظر سے ماورئی ہیں اور ہم ہزار کوشش کے باوجود اب تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ ان سے فکر اقبال کا تعلق کیا ہے یا سیرت اقبال سے کیا رابطہ ہے۔ وہ تین کتابیں ہیں ان میں پہلی تو عطیہ فیضی کے خطوط ہیں۔ جسے اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کیا ہے۔ ہم کسی شخص کی توہین کرنا نہیں چاہتے اقبالؒ تو پاکستان سے پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جس پاکستان کا انہوں نے خواب دیکھا تھا وہ دس سال بعد قائم ہوا لیکن عطیہ فیضی نے پاکستان میں اپنی دلفریب صحبتیں اور جان نواز راتیں گزار کر رخت سفر باندھا۔ اس نے وہ تمام خطوط آغوش اشاعت کی نذر کیے جو اقبال نے اپنے اقبال ہونے سے پہلے نوجوانی کی ترنگ میں لکھے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان سے شریرانہ فائدہ اٹھانا چاہا اور بعض ادھورے مصنفوں نے بے سروپا قسم کے مقالات لکھے۔ حقیقت یہ ہے

کہ جو لوگ اس قسم کی رنگینیاں تلاش کرتے ہیں وہ خام جوانی کے آوارہ لمحوں کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ ہم اقبال سے اسلئے محبت و عقیدت رکھتے ہیں کہ ان کی فکر ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ اقبال کی فکر نے ہمیں ایک زندگی عطا کی جس سے ہمارا وجود استوار ہے۔ اور ہم ذہنی طور پر اپنی نشاۃ ثانیہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ ہمارے لیے صرف ایک ہی سیرت قابل تقلید ہے جس کا ہر قدم ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے اور جس کی ہر سانس ہماری روح کی پرواز ہے۔ اور وہ سیرت ہمارے آقا و مولیٰ سرور کائنات محمد ﷺ کی ہے۔ ان کے بعد ہم جس انسان کے افکار و نظریات سے مستفید ہوتے ہیں ان کی زندگی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہمارے لیے اسوہ نہیں اور نہ ان کی کمزوریاں ہمیں ان کی فکری عظمت سے منحرف کر سکتی ہیں۔ جن لوگوں نے تذکرہ اقبال کے لیے عطیہ کے نام خطوط لازمہ سیرت سمجھے وہ شاید اپنے کسی خلا کی تسلی چاہتے تھے۔ بہر حال عطیہ کے نام خطوط کا تعلق اقبال کے افکار سے بالکل نہیں۔ جو لوگ ان کے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے ان خطوط کے ڈانڈے فکر اقبال کی تدریجی رفتار سے ملاتے ہیں۔ وہ مادی یورپ کی سوانح نگاری کے خلاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ یورپ کی سوانح نگاری کے اصول و مبادی کی پانچویں یا چھٹی کاربن کاپی ہے۔ ایک دفعہ عدالت عالیہ کے ایک مایہ ناز جج نے جو اقبالیات سے خصوصی شغف رکھتے تھے۔ ہم سے کہا کہ آپ اقبالؒ کے مسئلے میں شدت اختیار نہ کریں۔ اس کے سوانح حیات کا ہر پہلو سامنے آنے دیں۔ ہم نے عرض کیا۔ کیا سوانح نگاری کیلئے عیب بینی، عیب چینی اور عیب گوئی بنیادی ہیں۔ آخر یہ اصول کس نے وضع کیا اور اس سے کونسی اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ جب آپ اپنے متعلق الفاظ کے عدم توازن پر توہین عدالت کا گمان کرتے اور ذرا سی لسانی چوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تو ایک شخص جس کی فکر قومی تعمیر کیلئے آئیڈیل ہو۔ اس کی فکر کے مقابلے میں اس کی زندگی کے ابتدائی دور کو جذباتی انداز میں اچھال کر آپ کس عنوان سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

دوسری دو کتابیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آ سکیں ان میں ایک تو ''اقبال اور حیدر آباد'' ہے۔ دوسری ''اقبال اور بھوپال'' ہے۔ ہمیں کوئی دوست یہ سمجھا سکیں کہ ان کتابوں سے تحریک اقبالؒ کا ناطہ کیا ہے اور فکر اقبال کا تعلق کیا ہے۔ تو ہم اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے اس دوست کے ممنون ہوں گے۔ کیا ان دونو کتابوں سے اقبالؒ کی شخصیت ابھرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے مرتبین نے اپنی کسی خفی خواہش کا احترام کیا ہے۔ یہ صحیح

ہے کہ نواب بھوپال نے دو سال اور دو تین مہینے علامہ اقبال کو پانچسو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جو ان کی آخری بیماری میں کام آیا۔ ہمارا ذاتی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ نواب بھوپال کا وظیفہ پاکستانی علاقے کی مسلمان ریاستوں کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ تھا۔ اور پنجاب کے ان بڑے بڑے زمینداروں کے ارتحال غیرت کا سنگِ کتبہ تھا۔ جن کا واحد مشغلہ ہزار ہا روپیہ ماہانہ پر طوائفوں سے آشنائی رہا ہے۔ اگر پنجاب کے زمیندار حمیت اسلامی سے بہرہ مند ہوتے تو اقبال اس طرح بھوکا نہ مرتا اور نہ اس کے شب و روز اس طرح پریشان ہوتے۔ لیکن پانچ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس پر ''اقبال اور بھوپال'' جیسی کتاب لکھی جائے۔ افسوس کسی نے یہ ضرورت محسوس نہ کی کہ ''اقبال اور کشمیر'' بھی لکھے۔ اور شاید اس لیے ضرورت محسوس نہ کی کہ اقبال کشمیر کی مجبور و مظلوم آبادی کا ترجمان تھا۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۱ اگست ۱۹۷۵ء)

تیسرا باب: اقبال کے متعلق مضامین

اقبال ایک عہد ایک تحریک

اقبال پہلے ایک عہد تھے، اب ایک تحریک ہیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ میرا کلام باقی رہے گا۔
(اقبال کے چند جواہر پارے صفحہ ۴۴)

چنانچہ عطیہ بیگم کو اپنے ایک خط (۱۹۰۹) میں لکھتے ہیں۔
''وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کئے ہوئے ہیں عوام پر ظاہر ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔''

فرمایا، آئندہ نسلیں میری مٹھی میں ہیں (عبدالرشید طارق، ملفوظات)۔

شوکت حسین کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

میرا ادبی نصب العین عام نقادوں کے نصب العین سے مختلف ہے۔۔۔۔۔۔(اقبال نامہ)

پروفیسر آل احمد سرور کو لکھتے ہیں

''میرے کلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔''

آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد کا خطبہ صدارت، جس سے نظریہ پاکستان ایک قومی نصب العین ہو گیا انہی افکار کی اساس پر تھا، فرماتے ہیں۔

''مجھے اس جماعت (ملت اسلامیہ) سے دلی محبت ہے، جس نے اپنے دین، اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا ہے جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی ہے، یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔'' (تلخیص)

راجہ حسن اختر کی روایات کے مطابق مقامی کالج کے ہندو طلبہ نے سوال کیا،

''آپ مسلمانوں ہی کے لئے لکھتے ہیں ہمارے لئے بھی لکھا کریں۔''

فرمایا، میری قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے، میں اسے ایسی حالت میں چھوڑ دوں تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غداری کے مترادف نہ ہوگا۔ (ذکر اقبال صفحہ ۲۶۰)

فرمایا، میں دوسروں کی باتوں پر زندگی بسر کرنے کا عادی نہیں۔ انہیں احساس تھا اور صدمہ بھی کہ ''مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے'' (سید سلیمان ندوی کے نام)

نیاز احمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں،

''تعلیم کا تمام تر غیر دینی ہو جانا مسلمانوں کے لئے مصیبت کا باعث ہو گیا ہے۔''

میاں بشیر احمد کے الفاظ میں ان کا خیال تھا کہ

''ایشیا کے دل پر ایک پپڑی جمی ہوئی ہے میں اس کو صاف کر دینا چاہتا ہوں،''

(ملفوظات بتذکرہ پیام مشرق وغیرہ)

پہلی جنگِ عظیم کے بعد خلافت کا رہا سہا ڈھانچہ بھی ختم ہو گیا، مصطفےٰ کمال نے بعض تلخ تجربوں سے برگشتہ ہو کر آئندہ کی بنیاد، پرست قومیت پر رکھی، سید مسعود عالم ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''ترک اسلام کو چھوڑ کر کبھی سر سبز نہیں ہو سکتے'' (اقبال نامہ)

ان کے اس خیال کا اطلاق ترکوں پر ہی نہیں ہوتا بلکہ جہاں مسلمان ہیں اسلام کے بغیر ان کا سرسبز ہونا ناممکن ہے۔ انہیں رنج تھا کہ

''عہد حاضر کے عام مسلمان تاریخ اسلام سے بالکل بے بہرہ ہیں۔'' (تقریظ حریت اسلام مصنفہ فوق)

الہ آباد کے خطبہ میں ان کے سامنے یہی سوال تھا،

''آپ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟''

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں،

''اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے، سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوام اسلامیہ کو ایسی کوئی مدد نہیں دے سکتے البتہ دماغی اعتبار سے ان کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔''

(اقبال نامہ)

اکبر منیر کے نام ۱۹۲۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں،

''دنیا کے دل میں انقلاب ہے اس واسطے قلوب انسانی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔''

الہ آباد کے خطبہ میں اسی تاثیر پر تنقید کی ہے، فرماتے ہیں،

''مغرب کے سیاسی افکار نے دنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر رکھا ہے، مسلمان نوجوانوں کی خواہش ہے کہ ان افکار کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنالیں۔ انہوں نے اس امر پر مطلقاً غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے زیر اثر ان افکار نے مغرب میں نشوونما پائی ہے۔''

مسلم کانفرنس لاہور کے خطبہ میں فرمایا۔

''سیاسیات کی جڑیں انسان کی روحانی زندگی کے اندر جاگزین ہوتی ہیں، میرا عقیدہ ہے کہ اسلام نجی رائے کا نام نہیں بلکہ ایک سوسائٹی اور ایک جماعت ہے''۔۔۔۔۔(۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء)

الہ آباد کے خطبہ میں فرماتے ہیں،

''اسلام کے پیش نظر ایک عالمگیر نظام سیاست ہے۔'' اسی خطبہ میں فرمایا،

''ہم قومیت کے پودے کو اسلام کے آبحیات سے نہیں سینچ رہے اور نہ اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ کر رہے ہیں، بلکہ ایک نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو انتشاری اور اتحادی مرکز کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی دن اپنی شخصیت کھو بیٹھے گا۔'' (خطبہ مسلم کانفرنس لاہور، ۱۹۳۱ء)

وہ اس خیال پر سختی سے قائم تھے کہ

''ہمارے نوجوان اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہیں، انہیں مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استحسان اور استشہاد و رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ عقلی اور ادراکی لحاظ سے مغرب کے غلام ہیں، نتیجۃً ان کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے، جو اپنی قومی تاریخ اور قومی ادب سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف آج ہم سے تجربہ کرا رہا ہے، نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا رفیق بنائے رکھنا، گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے اور یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔''

(تلخیص خطبہ صدارت مسلم کانفرنس لاہور، ۱۹۳۱ء)

نیاز احمد کے نام ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں،

''اسلامی و مذہبی مسائل کے فہم کے لئے ایک خاص تربیت کی ضرورت ہے، افسوس کہ مسلمانوں کی نئی پود اس سے بالکل کوری ہے۔''

انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی عزائم کیا ہونے چاہئیں؟ اس عنوان سے ایک مقالہ میں لکھا ہے،

''مسلمان نوجوانوں کی تعلیمی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو ان میں سیر چشمی، بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصاف حسنہ پیدا ہی نہیں ہو سکتے جو اسلامی سیرت کے لئے مایہ امتیاز ہیں۔''

(مقالات صفحہ ۲۱۲)

یہی احساس ان کے خیالات میں موجزن رہا، فرماتے ہیں،

''لازم ہے کہ ہم اپنے محاسن کو جانچیں، پرکھیں اور ضرورت پڑے تو نئے محاسن پیدا کریں، بہ قول نطشے کسی قوم کی بقاء کا دارومدار محاسن کی مسلسل اور غیر مختتم تولید پر ہے۔''

(خطبہ صدارت لاہور مسلم کانفرنس، ۱۹۳۱ء)

ان کا نقطہ نگاہ تھا کہ اجتہاد اور جہاد کے بغیر زندگی میں تسلسل نہیں رہتا اور جو لوگ ماضی میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے مستقبل کوئی شے نہیں لیکن ان کا یہ خیال بھی تھا کہ ''زمانہ انحطاط میں تقلید، اجتہاد سے بہتر ہے۔''

ان کا عقیدہ تھا کہ

''مذہب قوم میں متوازن سیرت پیدا کرتا ہے لیکن بغیر قوت کے مذہب محض ایک فلسفہ ہے۔''

(اکبر الہ آبادی کے نام)

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں،

''اسلام اس وقت زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں اس سے پہلے ایسا وقت کبھی نہیں آیا۔''

فرماتے ہیں۔

''میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اس کی شریعت، اس کی سیاست، اس کے تمدن، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے، اس روح اسلامی کے ساتھ وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کی ہے جس سے میں اس عظیم الشان حقیقت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو اسلام کو ایک عالمگیر حقیقت ثابتہ کے طور پر حاصل ہے۔'' (خطبہ الہ آباد)

مسلم کانفرنس لاہور (۱۹۳۱ء) کے خطبے میں فرمایا۔

''ہماری جماعت کا شیرازہ اسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے جب تک مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو نہ ہو۔''

سید سلیمان ندوی کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

''مغربی تہذیب پر تنقید کی ضرورت ہے، تقلید کی نہیں۔''

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے چھٹے خطبہ میں لکھا ہے،

''یورپ سے بڑھ کر انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ آج اور کوئی نہیں ہے۔'' (صفحہ ۲۷۶)

فرمایا!

''ہمیں ان محرکات کا صحیح اندازہ ہونا چاہیے جو مستقبل کو خاموشی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔''

(تلخیص خطبہ آل انڈیا مسلم کانفرنس، ۱۹۳۱ء)

ان کا خیال تھا،

''قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔'' (خطبہ الہ آباد)

ساتواں خطبے میں کہتے ہیں

''فکر کو حق کی آرزو ہے، علم کو یقین کی، اور عمل کو محکم اساس کی، عقل اور ایمان، علم ہی کے دو پہلو ہیں۔ مضبوط عقائد کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔''

فرمایا!

۱۔ تہذیب مغربی کے خاتمہ پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار ہے۔ (خواجہ عبدالوحید 'ملفوظات')

۲۔ مسلمانوں کی حقیقی اساس توحید اور ختم نبوت کے عقیدہ پر ہے! (بجواب مولانا مدنیؒ)

۳۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن، نسلی اور وطنی قومیت کے نظریے ہیں۔ (تلخیص خطبات)

۴۔ اسلام کا دشمن سائنس نہیں، جغرافیائی جذبہ قومیت ہے۔ (اکبر الہ آبادی کے نام)

۵۔ وحدت ایک ہی معتبر ہے اور وہ ہے نوع انسانی کی وحدت اور اس وحدت کی اساس الخلق عیال اللہ کے اصول پر ہے۔ (خطبہ تلخیص)

۶۔ آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ (منشی صالح محمد کے نام)

یہ تھا اقبال کا عہد اور اس کے مضمرات، اقبال کی ذہنی سرگذشت کو اس عہد سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ان کا شعور اس معراج پر تھا کہ انہوں نے زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ چاہتے تو آسانی کے ساتھ افکار کے اس سیلاب میں بہہ سکتے تھے، جس نے خود یورپ کو ہلا دیا تھا اور جس کی موجیں اچھل اچھل کر ایشیا کے عصری مزاج میں داخل ہو چکی تھیں۔ یورپ کا ''صنعتی انقلاب'' اور مغرب کا ''جمہوری اعجاز'' ایشیا کی غلامی کا سر آغاز تھا۔ مسلمان ممالک جمود و انحطاط کے تھپیڑے سہہ رہے تھے اور بتدریج یورپی استعمار کے اختیار و انتداب میں جا رہے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا اقتدار ۱۸۵۷ء میں آخری ہچکی لے چکا اور وہ تقریباً ایک صدی کی مختلف گردشوں کے بعد سپر انداز ہو گئے تھے، اب ان پر خود سپردگی کا ایک خاص عالم تھا جس کے آثار و نتائج انتہائی

افکار و اعمال میں مرعوب کر رہے تھے اور وہ مرعوب ہو چکے تھے،

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کی مختلف وطنیتیں پیدا ہو چکی اور ہندوستان میں قومی تحریک کے نام سے ایک سیاسی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، اقبال ان کی نظری دلفریبی سے الگ نہیں رہے لیکن پہلی جنگ عظیم نے مسلمان ملکوں کی اسلامی ریاست کو جس انداز میں تہس نہس کیا وہ ایک حادثہ تھا۔ اقبال کا دل ان واردات کے تاثر سے خالی نہ تھا، خلافت کا نظام مسلمانوں کی ریاستی تصور کا سیاسی آئیڈیل تھا لیکن اپنی ہزیمت سے بہت پہلے وہ ایک مثالی نظام نہ رہا تھا۔ اس کی حیثیت ایک غیر ترقی یافتہ ملوکیت کی ہو چکی تھی جس میں استبداد اور انجماد، دونوں موجود تھے۔ نتیجۃً پہلی جنگ عظیم میں وہ ساری عمارت ہی ڈھے گئی اور یہ ایک ایسا سانحہ تھا کہ خود اسلام اس کی زد میں آ گیا۔

اس سے پہلے مسلمانوں کو اس سے بڑا سانحہ اور اسلام کو اس سے بڑا حادثہ شاید ہی پیش آیا ہو، مغربی تعلیم یافتہ راہنماؤں کی ایک ایسی جماعت مسلمانوں میں پیدا ہو گئی، جس کے افراد یورپی افکار سے مرعوب ہی نہیں، مصلوب بھی تھے۔ اقبال ہی تھا جس نے ان حوادث و وقائع کا احتساب کیا جو مسلمانوں کے ذہن کو فکری لحاظ سے پیش آ رہے تھے۔ ٹھیک یہی زمانہ تھا جب قومیت اور وطنیت کی تحریکیں یورپ کی تقلید میں ایشیائی ملکوں میں رائج ہو رہی تھیں اور مسلمان اقوام ان کا شکار ہو گئی تھیں، حتیٰ کہ "راہنما سیاسی دماغ" بھی اسی سانچہ میں ڈھل گئے تھے، اور آئندہ نسلوں کا خمیر بھی اس مٹی ہی سے تیار ہو رہا تھا۔ اقبال نے اس صورتِ حال کے مضمرات پر زبردست تنقید کی اور ان نظریات کے محاسب ہو گئے جن کی بدولت ایک نیا سیاسی مزاج پیدا ہو رہا تھا۔ سیاستدانوں کی طرح کھلم کھلا جنگ ان کی طبیعت کے خلاف تھی، قدرت نے انہیں ایک حکیم کا مزاج اور ظرف عطا کیا تھا، وہ ان حکماء کی نظیر تھے جنہیں قدرت اپنے زمانہ سے بہت آگے لیکن اس زمانہ کی فکری گمراہیوں کے خلاف احتساب کی طاقت دے کر پیدا کرتی ہے۔

یہ زمانہ مسلمانوں کے سیاسی زوال اور فکری انحطاط کا تھا، اقبال نے محسوس کیا کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی، چنانچہ قدرت کا جو منشا ان کی روح میں کارفرما تھا ان کے افکار میں کھنچ کے آ گیا۔ وہ ان تمام تاریخی نظریات اور عصری تصورات سے الجھ گئے جن کا زہر مسلمانوں کے خون میں داخل ہو رہا تھا اور وہ اس سے غافل تھے۔ اقبال کو احساس تھا کہ مسلمان اقوام نے سیاسی طور پر منتشر ہو کر جغرافیائی وطنیت کے جن قلعوں میں پناہ لی ہے وہ ان کی محافظت کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کی نگاہیں مسلمانوں کے حال سے زیادہ ان کے مستقبل پر تھیں، تجربوں اور نتیجوں نے ان کے اندیشوں کی تصدیق کی، کہ جو باتیں نصف صدی پہلے در خور

اعتنا نہ تھیں حقیقتِ ثابتہ کی طرح نمایاں ہو گئیں۔

ان نتائج و آثار کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ ہم اقبال کے دور میں سے گزر رہے ہیں، دنیا آج اپنے افکار کی گزرگاہ سے وہاں پہنچ چکی ہے جہاں سے اقبال نے نصف صدی پہلے اس کا مشاہدہ کیا تھا۔

اقبال کی ذہنی سرگذشت مرتب نہیں ہوئی، کوئی رجل رشید کسی مرحلے میں متوجہ ہوا اور اس نے افکار اقبال سے اقبال کی سرگذشت مرتب کی تو معلوم ہو گا، کہ اس عہد کی علامتیں متعین کرنے، اس زمانے کے اسرار کا پردہ اٹھانے اور تاریخ کی چال سے عہدہ برآ ہونے میں اقبال کی نگاہ کتنی دور رس تھی؟

اقبال نے دو طرح سوچا، اولاً سیاسی طور پر جس کے مقاصد فوری ہوتے ہیں، ثانیاً عالمی مفکر کی حیثیت سے جس کا وجود مزاجِ عالم کی راہنمائی کرتا ہے۔ ایک تو وہی کہ ہندوستانی مسلمان یورپ کی نظریاتی تحریکوں سے متاثر اور ملک کی سیاسی تحریکوں کے نرغہ میں تھے، ان کے نزدیک اس کا حل یہی تھا کہ مسلمانوں کے لئے الگ ریاست کا مطالبہ کریں جہاں اسلام اپنی اصلی روح کے ساتھ بار آور ہو۔ ان کی نگاہ میں ہندوستان کا اسلام عجمی تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں عربی اسلام ہو، پاکستان کا مطالبہ اسی نہاد پر تھا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ متحدہ ہندوستان کی وطنی تحریک اور اس کے ثمرات مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہو سکتے، اس سے نقصان ہو گا، کیونکہ مسلمانوں کے ملی وجود کا انحصار وطن پر نہیں مذہب پر ہے۔ وطن ان کے نزدیک ایک معمل تھا جہاں افرادِ قوم تہذیبی تجربے کرتے ہیں۔

دوسرا، ان کے دماغ میں مشرق کے احیاء کا مسئلہ تھا اور وہ ایشیا کی نشاۃ ثانیہ کے فکری موسس تھے۔ ان کی یہی حیثیت ہے جو انہیں فلسفی اسلام اور شاعر فردا کی حیثیت سے ممتاز کرتی ہے۔

اپنے علمی غلبہ سے یورپ کے حکماء کا دستبردار ہونا ناممکن ہے۔ کوئی ایشیائی حکیم جس کے افکار کی بنیاد یورپی افکار کی تغلیط پر ہو، یورپی حکماء کے ذہنوں میں اس کی جگہ ہی نہیں۔ ان کے ہاں اپنی فکر کے سچا ہونے کی ایک ہی دلیل ہے کہ علم کے اس دور کی تشکیل ان کے ہاتھوں ہوئی ہے، اور تمام کرہ ارضی ان کی مادی فتوحات کے تابع ہے۔ اقبال کے افکار انسانی صداقتوں کے لحاظ سے خواہ حرفِ آخر ہوں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے، ابھی مسلمانوں کے دماغی سفر کی منزل میں ہیں۔ وہ معاشرہ قائم نہیں ہوا جس کا نقشہ اقبال کے ذہن میں تھا۔ ریاست قائم ہو چکی ہے، معاشرہ باقی ہے اور طلوع و غروب کی کشمکش میں ہے۔ اس کشمکش کے وجوہ ہیں۔ حکمرانوں کو سیاسی اندیشوں سے فرصت نہیں وہ اقبال کے نام پر قومی خزانہ سے روپیہ دے سکتے اور دے رہے ہیں، لیکن اس روپیہ سے آثار و نتائج پیدا کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔ ان میں اہلیت ہی نہیں۔ ان کا

نداق تحریک کا نہیں، تاثر کا ہے۔ بعض اوقات حالات کی برہمیاں انہیں غلط راستے پر ڈال دیتیں ہیں اور وہ اپنی قومی عظمتوں کے افکار و سوانح ہی سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں، اقبال کو آج تک کوئی جانشین نہیں ملا، جوان کے سوانح مرتب کرتا، کوئی سلیمان ندوی ملا، جو اس شبلی کا ذہنی جانشین ہوتا؟ جہاں تک ان کے نام پر قائم شدہ اکادمیوں کا تعلق ہے اقبال کو ان کی معرفت قلم برداشتہ سوانح نگار اور خود کاشتہ قلمکار ملے ہیں، جن کا علم اور شعور دونوں ادھورے ہیں۔ لیکن یہ ایسی بات نہیں کہ اس سے مایوسی ہو، جن لوگوں کے افکار قوموں میں انقلاب برپا کرتے ہیں۔ انہیں اپنی رحلت کے بعد بھی تاریخ کی شدید کروٹوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اقبال اب عہد سے زیادہ ایک تحریک بن چکا ہے۔ پاکستان انہی کے خواب کی تعبیر ہے۔ بعض سیاسی نقب زنوں کی وجہ سے پاکستان اس فکر میں نہ ڈھل سکا جوان کا مطمح نظر تھا، اوجس کا اضطراب عمر کے آخری لمحوں تک ان کے سینہ میں رہا، لیکن اقبال کا ولولہ تازہ پاکستان کے اجتماعی خمیر میں رواں دواں ہے۔ ان کا کلام، کل ایک پیغام تھا آج ایک تحریک ہے۔ یہ تحریک پاکستان سے باہر تک چلی گئی ہے۔ اس کا اثر جکارتہ سے مراکش تک، دماغوں میں اتر چکا اور دلوں میں سلگ رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ مسلمان اقوام اس کی زبان سے آشنا ہوں۔ جس بصیرت نے اقبال کے تفکر کو پروان چڑھایا ہے وہ ایک مطمح نظر کے طور پر مسلمانوں کے جہد و عمل کا محور ہو چکی ہے، نتیجۃً اسلام ایک عالمی طاقت کے طور پر اپنے احیاء کا منتظر ہے اور یہی اقبال کا سب سے بڑا تحریکی کارنامہ ہے۔

مرکزیہ مجلس اقبال نے اس سارے عرصہ میں (۱۹۶۸ء۔۱۹۳۸ء) ایک ہی خدمت انجام دی ہے کہ مسلمانوں کے ذہنی افکار کو اقبال کے عصری افکار سے ہم آہنگ رکھا ہے، اور جو لوگ اقبال کے مطالب پر اپنے مقاصد کا خول چڑھانے کی تگ و دو میں تھے، انہیں اسی مینا کاری سے روکا ہے، مجلس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جن لوگوں نے اس کی بنا ڈالی وہ اکثر و بیشتر علامہ اقبال ہی کے صحبت یافتہ تھے۔ علامہ اقبال کی زندگی میں پہلا یوم اقبال (۹ جنوری ۱۹۳۸ء) انہی لوگوں نے منایا۔ اسی سال ۲۱ اپریل کو علامہ انتقال کر گئے اور مرکزیہ مجلس اقبال اگلے سال کے شروع میں باقاعدہ قائم ہو گئی۔ چودھری محمد حسین کو حضرت علامہؒ سے عمر بھر کا دوستانہ علاقہ تھا۔ وہ ان کے فکر و نظر سے بھی آگاہ تھے۔ انہی کو پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ غرض اس طرح ارادتمندوں کی ایک جماعت بن گئی۔ ارکان کی تعداد میں حک و اضافہ ہوتا رہا لیکن ہم مذاق دوستوں کا ایک ایسا مجمع قائم ہو گیا جس نے تیس سال کی مدت میں اتنا ضرور کیا ہے کہ اقبال کے سوانح و افکار کو پاکستان میں ایک ذہنی تنظیم اور عوامی تحریک بنا دیا ہے۔

چودھری صاحب جولائی ۱۹۵۰ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے، ان کی جگہ راجہ حسن اختر صدر منتخب ہوئے۔ وہ بھی اکتوبر ۱۹۶۴ء میں داغ مفارقت دے گئے۔ خواجہ عبدالرحیم اور راقم الحروف ۱۹۵۰ء سے مجلس کے سیکرٹری تھے۔۔ راجہ صاحب کی وفات کے بعد خواجہ صاحب کو صدر منتخب کیا گیا، راقم بدستور سیکرٹری رہا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال یورپ سے واپس آئے تو انہیں نائب صدر چن لیا گیا۔ ہر سال یوم اقبال کی عظیم الشان تقریب میں ان کا خطبہ اس غزل کا مطلع ہوتا ہے یا مقطع!

غرض مرکزیہ مجلس اقبال۔۔۔۔ ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں فکرِ اقبال نے اپنے سانچہ میں ڈھالا ہے۔ لوگوں کو ان کے بارے میں شک ہو رہا ہو تو یہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ لیکن اپنے مقصد اور اپنے موقف کی سچائی کے بارے میں انہیں کبھی شک نہیں گزرا۔ وہ ہر محفل اور ہر رات کے چراغ نہیں، ایک ہی چراغ کی لو ہیں اور وہ چراغ ہے اقبال۔

(پیش لفظ۔ ''اقبال پیمبرِ انقلاب''، مطبوعہ فیروز سنز، لاہور)

علامہ اقبالؒ سے ایک ملاقات

ابھی ستاروں نے رات کے ماتھے پر افشاں چنی ہی تھی کہ علامہ اقبال اپنی تربت سے نکلے۔ قلعہ کی شمالی دیواروں اور مسجد کے سفید گنبدوں پر نظر دوڑائی تو ایک منظر سامنے تھا ادھر حضوری باغ کی کچھ کھِلتی اور کچھ نہ کھِلتی ہوئی روشوں کو چاند کے نورانی چہرے نے جگمگا رکھا تھا ادھر ہوا کا لہجہ مغنیوں کی آواز سے بھی نرم تھا غرض ایک ریشمی سکوت در و دیوار کو محیط تھا محسوس ہو رہا تھا جیسے قلعہ کی فصیل کے کھنڈر ابھی کوئی دیپک راگ چھیڑ کر خاموش ہو گئے ہیں اور شاہی مسجد کے پرشکوہ میناروں کی پلکوں سے کئی سنگین راز ابھرنے کے لیے بے چین ہیں۔

اقبالؒ نے مزار کا طغریٰ دیکھا، اپنی تربت پر خود ہی فاتحہ پڑھی اور قلعہ کی طرف بڑھا۔ اس طرف کا دروازہ کھل کر کسی اور سیاسی نمائش کے لیے بند ہو چکا تھا تاہم صدر دروازے کے چوبی پھاٹکوں پر سنتری پہرہ دے رہے تھے۔

اقبال چپ چاپ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے نشیب سے فراز کو جاتے ہوئے راستہ کی اکھڑی اکھڑی روشوں پر ایک چھچھلتی نظر ڈالی گویا بیمار دیواروں میں کوئی رکی رکی آرزو ٹوٹتی نبضوں کی طرح تھرا رہی اور کہہ رہی تھی:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

اقبال دیوان عام میں پہنچا تو سلوں کی سیاہ رنگت کے سفید داغوں پر نظر اٹھائی گویا کسی بوڑھے تاج دار کے عارض پر برص کے داغ ہیں یا کسی مورخ کے مسودے کی عبارت کٹ پھٹ گئی اور مربوط فقروں کی جگہ شکستہ پا الفاظ رہ گئے ہیں۔ اقبال نے دیوان عام سے پوچھا:

کہو کیوں کر کٹ رہی ہے؟

معاً ایک ستون کو جنبش ہوئی وہ چاہتا تھا کچھ کہے لیکن اتنا کہا اور چپ ہو رہا۔

کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

اتنے میں دیوان عام کے چبوترہ کی ایک چھوٹی سی برجی نے ایک سرد آہ کھینچی اور سرگوشی کے انداز میں اس قدر کہا۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال نے سوال کیا؟

مسلمانوں کی سلطنت کے لوٹ آنے پر بھی تمہارا غم باقی ہے؟

تب بے شمار ستونوں میں کپکپاہٹ سی پیدا ہوئی اور بے نگاہ جھروکوں سے ہوا کے ایک جھونکے نے گزرتے ہوئے کہا۔

مسافر! جو لوگ سریر آرائے سلطنت ہیں وہ ہمارے ورثاء کے جانشین نہیں ایک خاص دور کے پس انداز لوگوں کی لاش ہیں

وجود ان کا سراپا تجلی افرنگ
کہ یہ وہاں کے عمارت گروں کی ہیں تعمیر
اور ان کا پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہیں یہ زر نگار و بے شمشیر

اقبال دیوان عام سے ہٹ کر دیوان خاص کو نکل گیا اور مہر بلب عقبی محلوں پر نظر اٹھائی جہاں کبھی شاہی حرم آباد تھا۔ کچھ آگے بڑھا تو سفید سنگ مرمر کی مسجد کا چہرہ زیبا، چاندنی کے سونے سے اس طرح نکھرا پڑا تھا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن سولہ سنگار کیے بیٹھی ہو مگر اسے اچانک خبر مل جائے کہ اس کا دلہا اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہو، بظاہر سفید سنگ مرمر بڑا دل آرام تھا لیکن اقبال نے محسوس کیا کہ

کعبہ کی بیٹی بوڑھی ہو گئی ہے اور سر کے بال سفید ہو چکے ہیں

اقبال دیوان خاص کی طرف مڑ آیا اور وہاں سے شہ نشین کی سمت نکل گیا جو شیش محل کی پشت پر غور سے دیکھا تو حرم کی بوڑھی جھریاں نور جہاں کے انداز میں مسکرا رہی تھیں ناگہاں ورق پر ورق الٹتے چلے گئے۔

جلال الدین اکبر کا عہد۔۔۔ قلعہ تعمیر ہو رہا ہے پہلا مینا بازار جب مغلئی اور آریائی حسن ہم آغوش ہو کر فضا کے جمالیاتی رنگ کو نکھارا کرتا تھا

شہنشاہ جہانگیر اطال اللہ مقامہ ملکہ ہندوستان نور جہاں اطالی اللہ مقامہا کی معیت میں تشریف لاتے ہیں۔

نور جہاں۔۔۔ جالی دار جھروکوں سے بہتے راوی کی تمکنت سے دیکھ رہی ہیں اور راوی ادب سے خرام بلکہ مخرام ہے کنیزان حرم کے قہقہے سمیٹتا ہو حدی خوانوں کے لہجے کے طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے ایک

گڈریے کی نگاہ، ملکہ کے جمال تک پہنچی اور فوراً ہی جھلس جاتی ہے نور جہاں طمنچہ لہراتی ہے اور گولی گڈریے کے سینہ کو چیر جاتی ہے۔

شہنشاہ جہانگیر ایک ایرانی شہزادے سے لونڈیوں کے داؤں پر شطرنج کھیل رہے ہیں عالم پناہ مات کھا جاتے ہیں کنیزوں کو یکجا کیا گیا ہے سوچ رہے ہیں کہ کونسی کنیز نذر کروں؟ آخر بڑی پس وپیش کے بعد ایک کنیز جس کا نام جہاں تھا چن لی جاتی ہے اور وہ جلاوطنی یا ''جلا بدنی'' کے تصور سے کانپ کانپ جاتی اور عرض کرتی ہے۔

تو بادشاہ جہانے جہاں زدست مدہ

کہ بادشاہ جہان را جہاں بکار آید

جہانگیر ایک دوسری کنیز حیات کو انتخاب کرتے ہیں لیکن وہ بھی سراپا نیاز ہو کر عرض کرتی ہے۔

جہاں خوش است و لیکن حیات می باید

اگر حیات نہ باشد جہان چہ کار آید

شہنشاہ اس سے بھی ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔۔۔ اور ایک تیسری کنیز دلآرام کو تجویز کرتے ہیں وہ خود ماہر شطرنج تھی۔ بساط دیکھنے کی اجازت چاہی۔۔۔ دلآرام نے غور کیا اور شہنشاہ سے کہا۔

شاہا دو رخ بدہ و دلآرام رامدہ

پیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشت و مات

اقبال نے ''متاع کردار'' کے اس زیاں پر آہ بھری اور سنگ وخشت کے الفاظ سے آنکھیں ملاتا ہوا باہر آنے والی راہ پر آ گیا۔ ادھر بائیں رخ پر کچھ بارکیں نظر آئی جہاں ایک دراز قامت سنتری بندوق تانے چپ راست کر رہا تھا اقبال نے چاہا اس سے کچھ پوچھے لیکن جب اسے پتا چلا کہ:

ان نورکوں کے زیریں حصے میں کبھی سیاسی قیدیوں کی کھالیں کھچوائی جاتی تھیں اور اب بھی گاہے گاہے کچھ ''خستگاں وفا'' مزاج پرسی کے لیے لائے جاتے ہیں۔

تو وہ ٹھٹھر سا گیا، غالباً Cells سے سلگتی ہوئی لے ابھر رہی تھی۔۔۔

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے

خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی

مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں

خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر

میں جانتا ہوں مآل سکندری کیا ہے

اقبال قلعہ سے باہر آ گیا۔ ادھر صدر دروازے کے ساتھ رنجیت سنگھ کی سمادھی نظر پڑی۔۔۔ چاہا اس سے کچھ گفتگو کرے لیکن ڈگ ڈگ قدم اٹھاتے حضوری باغ کو نکل گیا، جہاں ایک صدا نے دھیر سے دھیرے اس کا احاطہ کر لیا۔

''ٹھہریئے! اس عمارت میں بھی کچھ ''نشتر پنہاں'' ہیں یہ محض رنجیت سنگھ کا سمادھ نہیں ایک عہد کی کہانی ہے ایک تاریخ ہے جب افراتفری نے پنجاب کی باگ کو سنبھالا ان دنوں شاہی مسجد کا سہاگ لٹ گیا اور اس کے صحن میں گھوڑے بندھتے تھے، اذانوں پر احتساب تھا۔۔۔ آج پالنتھی کی طرف اس عہد کی راکھ سو رہی ہے، غرض سمادھی کا خوفناک سناٹا، چاندنی کے اس عظیم صحرا میں رہزنوں کے پاؤں کی چاپ ہے ایک افسانہ عبرت ایک گم شدہ آواز کی تلخیص ہے ایک بیتی ہوئی کہانی کا متن ہے ایک اعتراف ہے کہ قلعہ کی سمائیں سے آواز آ رہی تھی۔

صاحب نظر ان نشہ قوت ہے خطرناک

اور سمادھ کا خموش گنبد کراہ رہا تھا

میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

اقبال نے دیکھا عالمگیری مسجد کی سیڑھیوں کے دائیں رخ، ایک مٹی کا ڈھیر ہے، پنجاب کے ایک باجبروت وزیر اعظم کی قبر جس کا رنگ سفیدی سے اجلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اقبال رک گیا فقیر نے چاہا فاتحہ پڑھ لے، اتنے میں ایک سہاگن نے بڑھ کر تھام لیا اور کہا:

اے درویش، اورنگ زیب کی مسجد کے پہلو میں یہ قبر تاریخ کا ایک بڑا دردناک صفحہ ہے میں نے اس قبر پر کبھی کسی کو ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا مجھے جب بھی اس قبر کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوا میری ان آنکھوں میں بدلیاں آ گئیں اور آنسو بہ نکلے ہیں میں نے ہمیشہ اس قبر سے اپنا سہاگ مانگا ہے میرا سہاگ 19

مارچ کے حادثہ میں لٹ گیا تھا میں نے اس قبر پر اکثر گریہ کیا ہے کئی دفعہ بعض دوسرے ملکوں کی ''سہاگنیں'' بھی میرے ساتھ شریک ماتم ہوگئی ہیں۔ میں نے ترک قوم کی دوشیزاؤں کے بین ''اس کے قرب وجوار میں منڈلاتے دیکھے ہیں اکثر ماؤں نے اپنے گم شدہ بیٹوں کا اس کے سرہانے کھڑے ہوکر پتا مانگا ہے اور کئی بہنوں نے بھائیوں کی یاد میں آنسوؤں کے چراغ جلائے ہیں۔''

مسافر! زندگی اور موت دونوں امیروں کی لونڈیاں ہیں ہم زندگی میں، اس انسان ذیجاہ کے دروازے تک پہنچنے سے قاصر تھے ہم میں دستک دینے کا یارا نہ تھا اس کی زندگی کے نگہبان بے شمار تھے لیکن موت کے دروازہ پر تنہا ہے اب ہم اس کو جگا کر بھی اپنی گم شدہ متاع کا سراغ نہیں پا سکتے۔ اے درویش! تو نے کبھی میرے سہاگ کی تربت پر بھی ہاتھ اٹھائے ہیں؟ کچھ پتا ہے کہ وہ تربت کہاں ہے؟ کیا اس کو بھی مسجد کا پہلو نصیب ہوا۔۔۔ بول ایشیائی مسیحا؟

فقیر نے محسوس کیا کہ شبیر جبریل اسے کچھ کہہ رہی ہیں مڑ کر دیکھا تو سہاگن کا چہرہ غائب تھا البتہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں کوئی کہہ رہا تھا!

الحذر محکوم کی میت سے سو بار، الحذر!
اے سرافیل! اے خدائے کائنات ،اے جان پاک

پھر اقبال نے حضوری باغ کی درمیانی بارہ دری سے سوال کیا!

تمہیں رنجیت سنگھ نے جہانگیر کے مقبرہ سے اٹھوا کر یہاں نصب کیا تھا؟ بارہ دری مسکرائی اور کہا۔۔۔!

عظیم درویش! آپ ٹھیک کہتے ہیں جب کوئی قوم اپنے خصائص کھو دیتی ہے تو تھڑدلے اس کی عمارتوں کے انتقال ہی میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔

میرا معاملہ محض سنگ وخشت کا حادثہ تھا۔۔۔ مجھے اٹھانے والے خود اٹھ چکے۔ امتداد زمانہ کے باوصف میرا چہرہ کنول کے پھول کی طرح کھلا ہے لیکن ان کے ''مدفن'' کی سیاہی ''کو'' دیکھو جیسے کوئی اداس رات ستاروں کی جستجو میں بھٹک کر ہمیشہ کے لئے سیاہ ہوگئی ہے۔ اقبال نے دماغ کے فوکس میں حضوری باغ کی ایک تصویر کھینچی اور قلعہ کے دروازہ سے مسجد کے دروازہ پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔۔۔ دونوں کے ہونٹ ہل رہے تھے قلعہ کہہ رہا تھا!

''میرا بڑھاپا۔۔۔ ایک تاریخی پروانہ ہے تاریخ کی شاہراہ پر بڑ کا ایک ایسا درخت ہوں جس کی

ٹھنڈی چھاؤں، مسافروں کی دوپہر کو آرام مہیا کرتی ہے۔ مجھے لوگ ماضی کے آئینہ میں دیکھتے، اور گزر جاتے ہیں۔ عوام مجھے عقیدت سے جھانکتے اور خواص مجھے خوف سے گھورتے ہیں اور کبھی میری گود میں شہزادیاں ہرنیوں کی طرح چوکڑی بھرتی تھیں اب آغوش خالی اور دامن کوتاہ ہے۔ کبھی میرا وجود سرتاپا قہقہہ تھا اب نوحہ ہے اور میں ''یادرفتگاں'' کی ایک غمگین تصویر ہوں۔

میری جوانی تلواروں کے سائے اور بادشاہوں کے جلو میں گزری ہے لیکن میرا بڑھاپا، راہگیروں کے قہقہے اور تاریخ کے نوحوں کی زد میں ہے۔

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

مسجد نے کہا!

بھائی! میری رونق جوں کی توں ہے۔ شریعت مجھے کعبہ کی بیٹی اور عبادت مجھے خدا کے گھر کہتی ہے میں نے صدیوں کے بستر پر کروٹ لی ہے۔ میں نے انقلاب عالم کا نظارہ کیا ہے میری سلوں نے بھی شہنشاہوں سے لے کر گداؤں تک کی پیشانیوں سے خراج وصول کیے ہیں۔۔۔ اب میرا دل مر چکا۔ میں اس رونشیں فقیر کی طرح ہوں جس کی گدڑی میں رہگیر کھوٹے سکے پھینک جاتے ہیں۔ میری شہزادگی کا زمانہ لد چکا ہے۔ میری محرابوں کا دل ڈولتا ہے۔ میرے منبر کی روح پارہ پارہ ہے۔ میری دیواروں تک بانگ صلوٰۃ پہنچتے پہنچتے مشیت ایزدی کے حضور میں، فقیہ شہر کی چاک دامانی کے خلاف صدائے احتجاج ہوتی ہے۔ میرے میناروں کی بلندی ضمیر داروں کی پستی سے جھک کر ہمکلام ہوتی ہے۔

چساں احوال اورا بر لب آرم
تو می بینی نہان و آشکارم
ز روداد دو صد سالہ ہمیں بس
کہ دل چوں کندۂ قصاب دارم

میرے پہلو میں ایک شہر معصیت ہے جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔

اقبال نے چاہا کہ قلعہ مسجد کی گفتگو میں دلچسپی لیے بغیر بڑھ جائے مگر ایک آواز نے روک لیا۔ کوئی گا رہا تھا۔

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی!
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

اقبال نے مسجد میں داخل ہونا چاہا لیکن دور کی ایک نسوانی آواز زنجیر پا ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ حضوری دروازہ سے باہر کی طرف کوئی آواز اسے بلا رہی تھی ایک لحظہ رک کر مسجد کے سفید گنبد پر نگاہ ڈالی چاند نے اس کو اور بھی اجلا کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے مسجد کے سر پر سنہری تاج جگمگا رہا ہو یا کعبہ کی بیٹی کے ماتھے پر کسی نے افشاں چن دی ہے یا پھر یہ گنبد نہیں رہا۔۔۔ کسی سفید ریش ملا کا عمامہ ہوسکتا ہے کسی شب زندہ دار عابد کا روپہلی تصور مجسّد ہو کر مسجد کے افق پر مسکرا رہا ہے۔

چاروں مینار متمرد خادموں کی طرح کھڑے تھے۔ ان پر یہ قیاس بھی ہوتا تھا کہ کسی ان دیکھے تماشے سے خوف زدہ ہیں پھر اس خوف نے انہیں ہمیشہ کے لیے زمین پر گاڑ دیا ہے ادھر بوڑھے دریا کی طرف کے کشادہ حجروں میں در آتی ہوئی چاندنی نے ان تمام عبارتوں کو اجال رکھا تھا جو ان سنگی دیواروں پر کندہ تھیں ۔۔۔ عجیب و غریب عبارتیں!!

☆ صوفیہ اور زبیر۔۔۔ ہم خدا کے گھر میں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جانے کا عہد کرتے ہیں۔
☆ شہباز اور مسعود۔۔۔ ہم ماضی سے مستقبل کے لیے ایک دوسرے کے ہیں۔
☆ محمودہ۔۔۔ رات جا رہی ہے ستارے جھلملانے لگے ہیں چاند ڈوب رہا ہے کیا تم نہ آؤ گی۔
☆ میں تمہاری راہ تکتے تکتے تھک گیا ہوں صبح سات بجے سے ایک بجے دوپہر تک کیا میرے حصہ میں انتظار تھا۔۔۔ لو میں دستخط کر کے جا رہا ہوں۔۔۔ عزت۔
☆ بہشت اک نام ہے شاید اسی پاکیزہ گوشے کا۔ جہاں ہم تم ملا کرتے تھے چھپ کر چشم عالم سے۔
☆ آ بھی جاؤ کہ وقت نازک ہے زندگی لوٹ کر نہیں آتی۔ (تمہاری مسرت)
☆ بیوفا دوست یاد آتے ہیں۔ (توصیف)

اقبال نے تیز تیز قدم اٹھاتے اور حضوری باغ کے دروازے سے باہر نکل گیا اب وہ مملکت خداداد کے ایک بارونق بازار میں تھا۔

☆☆☆☆

اس وقت اور یہ بازار۔۔۔؟ آدھی رات میں بالا خانوں کے بند کمروں سے گھنگروؤں کے چھناکے اور موسیقی کے دھماکے پھوٹ پھوٹ کر آ رہے تھے۔۔۔ ایک آ رہا۔ ایک جا رہا تھا۔۔۔ ایک خدا رسیدہ بزرگ

کی قبر کے سپاٹ میدان میں کچھ تانگے والے اونگھ رہے تھے، بوڑھا تانگے والا۔۔۔ خانزادوں کے انتظار میں بوڑھی ہڈیوں کو "یا اللہ" کی ضرب سے بار بار کھجلا رہا تھا۔۔۔ اقبال سوچتا سوچتا بڑھتا گیا۔

یہ مہر و مہ یا ستارے یہ آسمان کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود
خیال جادۂ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیل بے مقصود

اقبال نے ایک نوجوان سے پوچھا:
عزیز من!۔۔۔ اس بازار کا نام؟
نوجوان نے جو آغوش مستعار خالی کر آیا تھا قدرے طنزیہ انداز میں کہا:
"بڑے میاں، تم کہاں گھوم رہے ہو؟"
"بھائی! راستہ بھول گیا ہوں۔"
"بڑے میاں۔ یہاں وہی لوگ آتے ہیں جو راستہ بھول جاتے ہیں۔"
تو کیا یہ کنچنیوں کا بازار ہے؟
جی ہاں! کنچنیوں کا بازار ہے یہاں عورت کی آواز سے لے کر عورت کے جسم تک کی منڈی لگتی ہے۔
"خریدار کون ہیں؟"
"ہم اور آپ؟"
"جی ہاں! فرزندان توحید۔۔۔ یہ دیکھئے نا، ذرا اس کوچہ میں نکل جائیے۔ اقبال کے شاہین بچے ۔۔۔ رنگا رنگ فاختاؤں کا شکار کھیل رہے ہیں۔"
"فاختاؤں کا شکار؟"
"جی ہاں، حوا کی بیٹیوں کے شکاری، جو عورت کو کھلونا سمجھ کر آتے ہیں اور ان سے کھیل کر جاتے ہیں یہاں عورت عورت نہیں، آواز یا جسم، جسم کیا بستر۔۔۔ گھڑی دو گھڑی آرام کیا اور چل نکلے۔"
نوجوان نے دیکھا۔ درویش کی پیشانی پر شکنیں بنتی اور بگڑتی جا رہی ہیں نوجوان ٹھہر سا گیا۔۔۔
"کیا سوچ رہے ہو بابا"

"کچھ نہیں بیٹا اور اگر سمجھتے ہو تو ان آنسوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"ہاں بابا! نوجوان غور سے دیکھتا رہا گویا سوال پا کر جواب دے رہا ہے۔ اس بازار میں عورت تاش کے پتوں کی طرح ہے جس سے ہر کھلاڑی کھیل لیتا ہے۔ یہاں محبت سکوں سے شروع ہوتی ہے اور سکوں پر ختم ہو جاتی ہے اس بازار کا تعلق مملکت خداداد کے ایک بڑے شہر سے ضرور ہے لیکن قانون خداداد سے نہیں۔ یہ بازار عقد مسنونہ کی رسم سے باغی ہے۔ یہاں عقد ملا نہیں نائکہ پڑھاتی ہے۔ یہاں پیا کی شہنائیاں نہیں بجتیں، جیبیں کھڑکتی ہیں۔ آپ براتی لائے بغیر شادی رچا سکتے ہیں۔ یہاں ہر عورت معقول یا غیر معقول معاوضہ پر رات بھر کے لئے آپ کی بیوی بن سکتی ہے۔ اس کا جسم بازار کا مال ہے۔ کسی عورت کے پیراہن میں انگور کی بیل ہے جس سے شراب کشید ہوتی ہے۔ جہاں بارہ مسالا کی چاٹ بکتی ہے۔ اس بازار میں آمد و رفت کے لئے کسی روٹ پرمٹ کی ضرورت نہیں۔ ایک وزنی جیب، ہر امتیازی خط کو مٹا کر بیٹی سے ماں تک کی عمر کے جسم پر قابو پا سکتی ہے۔

یہاں 'دل کی آواز' مدھم اور نفس کی آواز تیز ہوتی ہے اور۔۔۔ ایک ہی جسم سے باپ، بھائی، بیٹا اور پوتا۔۔۔ لذت یاب ہو سکتے ہیں۔۔۔ سیاسی منتی کہتے ہیں۔ اس بازار کی ضرورت ہر ملک میں تسلیم کی گئی ہے۔

اقبال اس نوجوان کے ہمراہ۔۔۔ بازار کی گہما گہمی میں چلا گیا۔

رقاصہ زاویے بنتی ہوئی ناچ رہی تھی اور اس کے برابر "خداوندان مکتب" فروکش تھے۔

رقاصہ کا سراپا ایک تاج محل تھا۔ جس میں ان گنت محبتیں دفن ہو چکی ہیں۔ اس کی تعمیر میں یقیناً کسی بہت بڑے انجینئیر کا ہاتھ تھا۔ اس کا وجود سیاسی راہنماؤں کی سیرت سے کہیں اجلا تھا۔ اس کا ہنر اس کے پاؤں میں تھا۔ وہ ادا تھی، نغمہ تھی، پھول تھی، خوشۂ انگور تھی، نغمہ پراں تھی، ایک ایسی تلوار تھی جس کی کاٹ ظالم ہوتی ہے

اس نے ہاتھ کی قوس کو پھیلاتے ہوئے بول اٹھایا۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

"اس چاک نہیں ہے" پر سلطنت خداداد کے نوٹوں کی ایک تھئی "خداوندان مکتب" نے اس کے پاؤں میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

کیا صوفی و ملا کو خبر تیرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

اقبال کی بوڑھی ہڈیاں مرجھا گئیں۔ اس نے ایک میانہ قامت کی شوخ و شنگ لڑکی سے کہا۔

"عورت تو بازار کی چیز نہیں۔"

اس لڑکی نے گستاخانہ نظروں سے اجنبی بڈھے کو گھورا۔۔۔ پھر ذرا شوخ ہو کر۔۔۔ غالباً یہ سمجھ کر کہ کسی "محراب" کی مٹی سے تیار ہوا ہے۔۔۔ کہا:

"تو کیا حجروں کی چیز ہے؟"

اقبال بولا:

"خدا کی مخلوق پر اس کا مہر ہے؟ عورت انسان کی ماں ہے" لڑکی کانپ گئی۔۔۔ اور کہا

"وہ عورت اس بازار میں نہیں ملتی۔ اس بازار کی عورت سازکی دھن اور طبلہ کی تھاپ کی مٹی سے اٹھتی اور بستر تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔"

اقبال نے چاہا کچھ اور کہہ سن لے۔ مگر تماشائی کی حیثیت میں ایک دوسرے دریچے سے اٹھتی ہوئی آواز نے اس کا دامن سماعت کھینچا۔

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

اقبال نے دیوانہ وار قدم بڑھایا۔ لیکن عقبی دروازہ سے ایک اور آواز پکار اٹھی، جیسا جنوں سمیت۔

عروج آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

نوجوان نے کہا:

"بابا۔۔۔ ان آوازوں کا سحر صرف بوڑھی ہڈیوں کے لئے ہے۔ جب عیاش جوانی تھک جاتی ہے تو طامع بڑھاپا رامش و رنگ کے آئینہ خانہ میں عمر رفتہ کو آواز دیتا ہے۔ لیکن جوانی آواز نہیں، جسم چاہتی ہے۔

تمہارا نام۔۔۔؟ اقبال نے ایک نوعمر رقاصہ سے سوال کیا۔

"تمہارا مطلب؟" اس نے جواباً پوچھا "صرف نام سے آشنا ہونا چاہتا ہوں۔"

"گاہک، دوکاندار کا نام نہیں پوچھا کرتے۔ اپنے مطلب کی اشیا خرید کر لوٹ جاتے ہیں۔"

اس دو ٹوک جواب پر اقبال نے نظریں پھیلا دیں۔ ہر طرف عورتیں ہی عورتیں تھیں۔۔۔ جسم ہی جسم تھے۔ ڈربے ہی ڈربے تھے۔ شراب کی کھلی بوتلیں، جن سے ہر مذاق کا شرابی جرعہ، دو جرعہ پی رہا تھا۔ ان

کانگ سنگ کی تصویروں سے مشابہ تھا۔ کچھ کھلونے تھے جن کی شریانوں میں بہت سے خون تھے۔

تاجر کا خون، ادیب کا خون، ملا کا خون، مرشد کا خون، نواب کا خون، مزدور کا خون، صناع کا خون، لیڈر کا خون، باپ کا خون۔ بھائی کا خون، بیٹے کا خون، غرض کہ خون ہی خون۔

اقبال نے ہمراہی نوجوان سے کہا آؤ لوٹ چلیں۔ مجھے مملکت خداداد کی اس بستی میں لے چلو اقبال جس کا نقاش ہے۔

''اقبال۔۔۔؟'' نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

''میں آپ کو اس کے مزار پر لے جا سکتا ہوں آیئے''۔۔۔۔ چاندنی لحظہ بہ لحظہ ڈھل رہی تھی۔۔۔ بوڑھا اور نوجوان دونوں تیز روی سے قدم بڑھاتے جا رہے تھے۔ کئی آوازیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ خان زادوں کے موٹروں کی آوازیں، سپاہیوں کے ڈنڈوں کی آوازیں، کتوں کے غرانے کی بھیانک آوازیں۔۔۔ یکساں رفتار سے پنچم کی لے تک پہنچ کر کھرج میں منتقل ہو جاتی تھیں۔

دونوں مزار کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ نوجوان نے کہا۔ ''بابا یہ ہے اقبال کی تربت۔''

اور جب اس نے پیچھے مڑ کر بابا کو دیکھا تو بابا غائب تھا، نوجوان خوف زدہ ہو گیا۔۔۔ اس نے محسوس کیا کہ بوڑھے کے لہجہ میں قبر بول رہی ہے۔

''مجھے یہاں سے لے چلو۔ مملکت خداداد میں لے چلو وہاں لے چلو جہاں۔۔۔۔ شاہینوں کا بسیرا ہے۔ جہاں ضرب الا سے کون و مکاں کا دل ہلتا ہے۔ جہاں جمہور کی فرمانروائی ہے جہاں عورت بالاخانہ نہیں تاج محل ہے۔ جہاں پسینا خشک ہونے سے پہلے مزدور کی محنت چکا دی جاتی ہے۔ جہاں امرا کا وجود گالی ہے جہاں محلوں کی جھگی جھونپڑوں کی چھتی نہیں ہنستی۔ جہاں گناہ نہیں بکتا۔۔۔۔ جہاں انسان کی غیرت حوادث کی جونوں سے مجروح نہیں ہوتی اور جہاں۔۔۔۔ عروج آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۱ اپریل ۱۹۵۸ء)

1936ء ایک تمثیل

اقبال پر بغاوت کا الزام

ایڈووکیٹ جنرل نے چیف جسٹس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

عالی جاہ! خفیہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ (بی) مرزا ہمایوں جنگ آپ کے سامنے شیخ محمد اقبال عرف علامہ اقبال ولد شیخ نور محمد قوم کشمیری پیشہ شاعری کا ہسٹری شیٹ پیش کرنا چاہتے ہیں ان کے خلاف ملک معظم کی وفادار رعایا میں پھوٹ ڈالنے اور لوگوں کو باغیانہ جذبات پر ابھارنے کا الزام لگایا گیا ہے اور اس وقت بحیثیت ملزم عدالت میں موجود ہیں اس خفیہ دستاویز سے عدالت کو معلوم ہو جائے گا کہ ملزم کا سٹیٹس (status) کیا ہے؟ اور وہ اب تک کیا کرتا رہا ہے؟

(دستاویز پڑھنے کے بعد عدالت سپرنٹنڈنٹ پولیس سے سوال کرتی ہے)

عدالت: لیکن یہ دستاویز تو ان کے ذاتی حالات پر مشتمل ہے اس کا مقدمہ زیر سماعت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: جناب والا! مقصود یہ ہے کہ عدالت کو معلوم ہو جائے کہ ملزم کس مذاق، مرتبے اور درجے کا انسان ہے؟

عدالت: لیکن اس قسم کی تحقیقات تو چوروں، رہزنوں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور جیب تراشوں کی بابت کی جاتی ہیں؟

سپرنٹنڈنٹ: جی نہیں، جو لوگ بھی قانون شکنی کرتے ہیں ان کا نام پولیس کی ہسٹری شیٹ میں ضرور رکھا جاتا ہے۔

عدالت: لیکن یہ معلومات کہاں سے آتی ہیں؟

سپرنٹنڈنٹ: عالی جاہ! پولیس فراہم کرتی ہے اور اس کے پاس اس قسم کے لوگوں کا ریکارڈ ہوتا ہے کچھ چیزیں زبان زد عام ہوتی ہیں کچھ مخبروں (Informers) سے حاصل کی جاتی ہیں۔

عدالت: یہ مخبر کون ہوتے ہیں؟

سپرنٹنڈنٹ: جناب میں استحقاق کا مطالبہ کرتا ہوں مخبروں کے نام یا نشان نہیں بتایا جاتا تا ہم یہ کہہ دینے میں کوئی ہرج نہیں کہ دوستوں، ہمنشینوں، ملازموں، حواریوں اور ہمسفروں ہی سے یہ حقائق حاصل کئے جاتے ہیں۔

عدالت: منفعت یا قیمتا۔ (قہقہہ)

سپرنٹنڈنٹ: کبھی مفت کبھی قیمتاً۔

عدالت: تو ان کی سچائی کیسے پرکھی جاتی ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: اس کا انحصار اطلاعات کی نوعیت پر ہے کہ جو چیزیں بتائی گئی ہیں وہ کیسی ہیں اور واقعات وشواہد کس حد تک اس کی مطابقت کرتے ہیں۔

عدالت: یہ کوئی دلیل نہیں اور پھر اس قسم کا ہسٹری شیٹ تو ہر شخص کے بارے میں تیار کیا جا سکتا ہے خواہ وہ مامور من اللہ ہی کیوں نہ ہو؟

سپرنٹنڈنٹ: جی نہیں یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو بڑی چھان پھٹک کے بعد تیار کی جاتی ہے۔

عدالت: لیکن اس شخص کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا جس کے بارے میں یہ تیار کی جاتی ہے۔ ہم اسے مقدمہ کا حصہ نہیں سمجھتے، یہ آپ کی اپنی چیز ہے، اور اس کے ساتھ آپ جو سلوک چاہیں کریں۔

(اس اثنا میں علامہ اقبال اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے تبسم فرماتے رہے، اور یہ رویہ رکھا، جیسے مقدمہ کوئی قابل توجہ چیز نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے یہ ڈرامہ رچایا ہے ان کے کل پرزے وقت کے راستہ کا گرد و غبار ہے البتہ اس اثنا میں پیر تاج الدین نے اٹھ کر اپنے مخصوص انداز میں کہا)

پیر تاج الدین: جناب والا! آخر یہ صحیفہ کاملہ ہے کیا، کون سے فرشتوں نے تیار کیا ہے، کس معلم الملکوت کو یہ شرف حاصل ہوا ہے، کہ اس دستاویز کو مدون کرے؟

سپرنٹنڈنٹ: یہ خفیہ دستاویز ہے۔

پیر تاج الدین: تو پھر خفیہ رکھیے عدالت میں کیوں لائے ہیں آپ؟ عدالت میں تو کھلی کاروائی ہوگی۔ ایسا چیزیں تو غرق مئے ناب کی جاتی ہیں۔

عدالت نے اس دستاویز کو بے محل قرار دیا، اور ایڈووکیٹ جنرل سے مخاطب ہو کر کہا آپ اصل مقدمہ پیش کریں۔

ایڈووکیٹ جنرل: جناب والا! اب سے پہلے میں ملزم کے خلاف الزامات کی فہرست پیش کروں گا، پھر اس پر شہادتیں ہوں گی، استغاثہ کے سات گواہ ہیں، جن میں ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس اور چھ معزز شہری ہیں ان کے نام یہ ہیں:

1 حضرت سید پیر معروف شاہ زنجانی سجادہ نشین فتور پورہ شریف
2 خواجہ جلال الدین مالک امرتسر لیدر ورکس، لاہور

3 حافظ محمد ادریس، خطیب جامع مسجد اورنگ پورہ، لاہور
4 چودھری شرف دین آڑھتی میوہ منڈی، لاہور
5 لالہ لچھے شاہ بینکر، لاہور
6 حاجی جھرو شاہی محلہ، لاہور

سب سے پہلے الزامات کی فہرست پیش کی جاتی ہے عالی جاہ ملزم محمد اقبال عرف علامہ اقبال عرف ڈاکٹر اقبال کے خلاف الزام یہ ہے کہ

(1) اس نے اپنے کلام میں ملکہ معظم کی ہندوستانی رعایا کو بالعموم اور مسلمانوں جیسی وفادار قوم کو بالخصوص بغاوت ومنافرت کا سبق دیا ہے، جس سے۔

1 ملکہ معظم کی سلطنت خداداد کے خلاف باغیانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔
2 لوگوں میں انگریز قوم کے خلاف جذبہ نفرت ابھرتا ہے۔
3 جو لوگ سلطنت کے پشتینی وفادار ہیں ان کی ہتک ہوتی، اور عوام میں ان کی عزت گھٹتی ہے۔
4 گمراہ نوجوان سیاسی تحریکوں میں انقلابی ذہن لے کر فساد پیدا کرتے ہیں۔
5 حکومت سے تعاون واشتراک گھٹتا ہے۔
6 یورپی تہذیب وتمدن اور فلسفہ ودانش کے خلاف اظہار غیظ کو نشوونما حاصل ہوتا ہے۔
7 لوگ عام احتجاجی جلسوں میں ان کی نظمیں پڑھتے اور نئی نسل میں ان کے خیالات، ذہنی فساد کی تخم پاشی کرتے ہیں۔
8 ملکہ معظم کی حکومت نے قومی وملکی مفاد کے تحت جس سیاسی فراست سے امن عامہ کے لئے نمی پیدا کئے، علماء کی جماعت اور مدرسے قائم کیے صوفیوں کو جنم دیا، اور پیروں کی گدیوں کو وجود بخشا ملزم نہ صرف ان کے خلاف تابڑ توڑ حملے کر رہا ہے بلکہ اس نے ان کے وقار کو بے حد صدمہ پہنچایا ہے۔ جس سے وفادار رعایا کا لوگوں میں اعتماد اٹھ گیا ہے۔
9 حکومت نے ملک بھر میں جو یونیورسٹیاں کالج یا مدرسے قائم کیے ہیں ان کی تعلیم کے خلاف ملزم نے ایک زبردست ذہنی فضا پیدا کی ہے جس سے طلبہ میں تراج کی لہر چل نکلی ہے۔
10 ملزم اس دور کو واپس لانے کے لئے مسلمانوں کو بطور خاص ابھار رہا ہے جو ملکہ معظم کی باقی حکومت نے اپنی وفادار فوج کی معرفت ختم کر دیا تھا۔

11 ملزم دنیائے اسلام کے دماغوں کو ملکہ معظم کی سلطنت عظمیٰ کے خلاف بھڑکاتا اور رسوائی اسلام کا موجب برطانیہ کو قرار دیتا ہے۔

12 ملزم کے پیرو ہندوستان سے باہر کے وہ لوگ ہیں جو ملکہ معظم کی حکومت سے مختلف ملکوں میں نبرد آزما رہے ہیں اور جنہوں نے برطانوی سلطنت کی عظمت کو نقصان پہنچانے کے لئے خطرناک منصوبے وضع کیے تھے۔

عالی جاہ! ان الزامات کے ثبوت میں سب سے پہلے ملزم ہی کے مجموعہ ہائے کلام پیش کیے جاتے ہیں جن میں بار بار انہی نظریات و خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ان مجموعہ ہائے کلام کی (مع سن طباعت) فہرست حسب ذیل ہے:

فارسی کے مجموعہ ہائے کلام

(1) "اسرار خودی" (1915ء): اس میں ملفوف انداز کے ساتھ مسلمانوں کو ایک ایسے فلسفہ کا سبق دیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ حفظ خودی کے لیے ان تمام روایات و اساطیر کو ترک کر دیں، جو انہیں ملکہ معظم کی رعایا کا ایک پرامن شہری بناتی ہیں اس کتاب کی مجموعی سپرٹ مسلمانوں میں اس جذبہ جہاد اور ہنگامہ رستاخیز کو پیدا کرنا ہے جس کو ختم کرنے کے لیے 1799ء سے لے کر 1872ء تک مادر انگلستان کے فرزندوں نے بے شمار معرکے سر کیے۔ اپنے ہمنواؤں کے فقدان کا اظہار ملزم نے اس مثنوی کے خاتمہ پر اس طرح کیا ہے)

من مثال لالہ صحرا ستم
درمیان محفلے تنہا ستم

واضح رہے کہ اس کی اشاعت پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں ہوئی جب ملکہ معظم کی سلطنت عظمیٰ کے جگر گوشے حق و باطل کی لڑائی میں جتے ہوئے تھے اور ترکی کا مرد بیمار تہذیب عالم کو کھا جانے کے لیے دشمنوں کا ساتھی تھا۔

(2) رموز بے خودی (1918ء): یہ بھی اسی انداز کی ایک مثنوی ہے لیکن اس میں مسلمانوں کو ذرا اور کھل کر مخاطب کیا گیا ہے کہ قرآن کے بغیر جینا ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے میں زندگی بسر کرنا، جس کا مطلب ہے کہ مسلمان جہاد و غزا کی وہی زندگی اختیار کریں جس کو ملکہ معظم کی وفادار فوج نے شرارتوں کی گردنیں چھڑا کر ختم کیا تھا اس نظم میں اقبال اپنے لیے دعا کرتے ہیں:

گر دلم آئینہ بے جوہراست
ور بحرفم غیر قرآن مضمراست
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

یہ ایک ایسا انداز ہے جس سے مسلمانوں کو اجتماعاً جھنجھوڑا جاتا ہے اور وہ دعوت جہاد پر میدان میں کود پڑتے ہیں۔

(3) پیام مشرق (1923) یہ مغرب کے خلاف مشرق کی آڑ میں کھلم کھلا جارحانہ حملہ ہے جس میں امن عالم کو محافظ جمعیت الاقوام (لیگ آف نیشنز) کو اس حقارت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے۔

من از بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اور رعایا کو غلامی کے عنوان سے اس طرح ابھارا گیا ہے۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یعنی ملزم لوگوں سے کہتا ہے کہ تم کتوں سے بدتر ہو کہ غلام ہو، اور جھکتے ہو حالانکہ کتا بھی کتے کے سامنے نہیں جھکتا ہے۔

(4) "زبور عجم" (1927ء): یہ بھی انقلاب ہی کی دعوت عام ہے جس میں بے روک ہو کر ہنگامے برپا کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایا کشت دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب۔۔۔انقلاب

اس کتاب نے لوگوں کے اذہان پر وہی اثر ڈالا ہے جو کارل مارکس کے سرمایہ نے روس کے بالشویکوں کی فکر پہ ڈالا تھا۔

(5) **جاوید نامہ (1932ء)**: یہ بھی انہی جذبات و خیالات سے مملو ہے جو اقبال کی فرنگ دشمنی اور یورپی قوموں سے عناد کا طغرائے امتیاز ہے اس میں نژادِ نو سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ
بستہ فتراک مردان ، فرنگ!

(6) **"ارمغان حجاز"** :۔۔۔ملزم کا یہ مجموعہ کلام اردو فارسی دونوں میں ہے ابھی چھپا نہیں لیکن خانہ تلاشی میں اس کا مسودہ قبضہ میں لیا گیا تمام مسودہ ملزم کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں سراسر فرنگ دشمنی اور انگریز آزاری پائی جاتی ہے۔ مثلاً اعلیٰ حضرت شاہ انگلستان کے بارے میں لکھا ہے کہ

شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت
اس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش

نژادِ نو سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ

اگر ایں آب و جا ہے از فرنگ است
جبین خود منہ جز بر در او
سریں راہم بہ چوبش دہ کہ آخر
حقے دارد بہ خر پالاں گر او

عالی جاہ! یہ قطعہ سخت توہین آمیز اور مبنی بر دشنام ہے اس میں ملکہ معظم کے وفاداروں کو گدھا کہا گیا اور تمسخر کے طور پر تلقین کی گئی کہ اپنے چوتڑوں میں فرنگ کا ڈنڈا لے لو کیونکہ کمہار کو گدھے پر یہی حق ہوتا ہے۔

(7) **پس چہ باید کرد (1936ء)**: یہ ایک ایسی کتاب ہے جو مملکت ملکہ معظم کے خلاف ایک ایسازہر رکھتی ہے کہ ملزم نے کابل میں بابر کی قبر پر حاضر ہو کر بھی اپنے اس زہر کو چھپایا نہیں ہے۔ کہتا ہے

خوشا نصیب کہ خاک تو آرمید ایں جا
کہ ایں زمیں ز طلسم فرنگ آزاد است

ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دلی است
کہ آں عجوزہ عروس ہزار داماد است

مجموعہ ہائے اردو:

(8) **بانگ درا (1924ء)**: اس میں سلطنت عظمیٰ پر جا بجا چوٹیں کی گئیں اور آخر میں اس نعمت عظمیٰ کی برکات حسنہ کا اس طرح مذاق اڑایا گیا ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اور مسلمانوں کو خونیں انقلاب کی تربیت بھی دی گئی ہے۔

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

(9) **بال جبریل (1935ء)**: اس کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے۔

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختہ شام و سحر تازہ کریں

اس میں تشدد کی تلقین واضح طور پر موجود ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

تمام کتاب اسی قسم کے خونیں پیامات کا مجموعہ ہے۔ نتیجتاً نوجوانوں میں ملکہ معظم کی حکومت کے خلاف انڈر گراؤنڈ سازشیں راہ پا رہی ہیں۔

(10) **ضرب کلیم (1936ء)**: ملزم کے اپنے الفاظ میں .. حاضر کے خلاف اعلان جنگ ہے یہ ساری کتاب اپنے اندر ایک باغی تحریک کا جوش و غضب رکھتی اور ان تمام عمارتوں کو ڈھاتی ہے جو ملکہ معظم کی حکومت نے امن عامہ اور قانون و ضابطہ کے نام پر فلاح عوام کی خاطر تعمیر کی ہیں اس کتاب نے مسلمانوں کو مستقبل طور پر برطانوی حکومت کا دشمن بنانا چاہا ہے جس سے ان میں انگریزوں سے متعلق سخت قسم کے خیالات اگ آئے ہیں اس کا ایک ایک صفحہ تعزیرات ہند کی زد میں آتا ہے۔

مثال کے طور پر چند شعر فاضل عدالت کو فیصلہ سے قریب تر لانے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

☆☆

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

☆☆

یا رب مجھے اس دیس میں کیوں پیدا کیا ہے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

☆☆

جو یہ سمجھتا ہے مسلماں ہے گداگر

☆☆

کھا گئی روح فرنگی کو ہوائے زر و سیم

☆☆

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

☆☆

کرے قبول اگر دین مصطفیٰ انگریز!
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

☆☆

فتنہ ملت بیضا ہے، امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

☆☆

ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد
اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

☆☆

ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار

☆☆

اے مرے فقر ہمنوا فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

(اس شعر میں خطاب یافتگان سرکار برطانیہ کا مذاق اڑایا گیا ہے)

عالی جاہ! یہ حوالے مشتے نمونہ از خروارے ہیں ایک شخص جو ملکہ معظم کی رعایا بھی ہو اور اس قسم کے خیالات کا اظہار کرے نہ صرف قانون و انصاف کی رو سے مجرم ہے، بلکہ سخت سے سخت سزا کا مستحق ہے ملزم کے خلاف حکومت نے 153 الف 124 الف اور 121 کے تحت مقدمہ چلانے کی اجازت دے کر لازماً قانون کے منشا کا پورا پورا احترام کیا ہے، ان الفاظ کے ساتھ سرکار اپنا استغاثہ پیش کرتی ہے۔

عدالت: استغاثہ اپنے گواہ پیش کرے کہ ان الزمات کے بارے میں وہ کیا کہنا چاہتے ہیں

پہلا گواہ پیر معروف شاہ زنجانی

عدالت: کہیے آپ جو کہیں گے خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہیں گے۔

گواہ: خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا۔

عدالت: آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

گواہ: حضور اہم نے اپنے لاکھوں مریدوں میں سرکار عالی کے لیے وفاداری کا جذبہ پیدا کیا اور قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت فراہم کیا حتی کہ پہلی جنگ عظیم میں اپنے مریدوں کو تعویذ دے کر خلافت عثمانیہ کے خلاف محاذ جنگ پر بھجوایا کہ ظالم ترکوں کی گولی ان پر اثر انداز نہ ہوگی۔ مگر شیخ محمد اقبال نے اپنے کلام کی معرفت ہمارا وقار مٹی میں ملا دیا ہے ہمارے مرید اب ہمارے سامنے گاتے پھرتے ہیں۔۔۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن، نتیجتاً رعایا کی وفاداری مشکوک ہوتی جا رہی ہے۔

دوسرا گواہ: خواجہ جلال الدین۔ حضور ان کا کلام پڑھ کر ہمارے کارخانے کے مزدور باغی ہو گئے ہیں کام کرتے نہیں معاوضہ مانگتے ہیں اور علی الاعلان پکارتے پھرتے ہیں:

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب

انقلاب۔۔۔۔انقلاب

تیسرا گواہ: حافظ محمد ادریس خطیب جامع مسجد لاہور حضورا میں جو کہوں گا خدا کو گواہ بنا کر سچ کہوں گا ملزم نے ہمارے مقتدیوں کو ہم سے برہم کر دیا ہے وہ لوگ میرے حجرہ کی پیشانی پر ان کا یہ مصرع لکھ گئے ہیں:

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

چوتھا گواہ: چودھری شرف دین: مائی باپ! انہوں نے الیکشن میں سرکار کے پشتینی وفادار۔۔۔کا مقابلہ کیا تو اس وقت مجھے ان کے اشعار سننے کا موقع ملا تھا نوجوان اچھل اچھل کر گایا کرتے تھے۔

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج

پانچواں گواہ: لالہ لچھے، شاہ! مہاراج ان کے کلام نے میری کنیا سوراج کماری کو بھی باغی کر دیا ہے وہ ان کی گجلیں کانگرس کے جلسے میں پڑھتی اور جوش دلاتی ہے ان کی وجہ سے وہ چھ ماہ قید بھی کاٹ آئی ہے اب بھی گاتی پھرتی ہے:

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

چھٹا گواہ: حاجی حجرو شاہی محلہ لاہور۔ سرکار! پہلے ہمارے ہاں عزت دار لوگ آتے تھے داغ کا کلام سنا اور چلے گئے اب سر پھرے نوجوان آ گھستے اور اقبال کا کلام سنانے پر زور دیتے ہیں ورنہ سنتے ہی نہیں ہمیں کیا معلوم کہ اس میں کیا ہے لیکن پہلی دفعہ ہمیں سٹی انسپکٹر نے بلا کر انتباہ کیا کہ بائیوں سے کہہ دو کہ وہ یہ کلام نہ پڑھا کریں، کیونکہ سرکار پسند نہیں کرتی۔ اب ہماری لڑکیاں بھی نہیں مانتیں، انہیں بھی اس کا چسکا پڑ گیا ہے لہک لہک کر پڑھتی ہیں اور کن رسیئے چہک چہک کر سنتے ہیں:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

شہادت استغاثہ ختم ہوتے ہی عدالت نے ملزم سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

علامہ اقبال: اپنے کلام میں کہہ چکا ہوں۔ اپنے ایک ایک حرف کا اقرار و اعتراف کرتا ہوں مجھے استغاثہ کے روایتی گواہوں کی شہادت سے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میرے ترکش کا ہر تیر اپنے نشانہ پر بیٹھ رہا ہے۔ میری قوم جاگ اٹھی ہے اگر عدالت میرے لیے زہر کا پیالہ تجویز کرے تو مجھے سقراط کے ساتھ کھڑا ہونے میں انتہائی مسرت ہوگی اور میں اسے اپنے لیے فخر و ناز کی پونجی سمجھوں گا۔

عدالت فیصلے کے لیے اگلے روز پر ملتوی ہو گئی۔

فیصلہ: (استغاثے کی حکایت اور گواہوں کی شہادت زیر بحث لانے کے بعد) ہم سمجھتے ہیں ملزم محمد اقبال نے واقعی دفعات متعلقہ کی خلاف ورزی کی ہے اور استغاثہ نے اس کے خلاف جرم ثابت کر دیا ہے اب صرف سوال سزا کا ہے ضروری نہیں کہ ہر حال میں سزا ہی دی جائے یعنی ملزم کو کسی معین مدت کے لیے جیل بھیج دیا جائے یا ایک خاص رقم جرمانے کے طور پر لگا دی جائے ایک فنکار کو جیل بھجوانے کا مطلب ہو گا کہ اس کے باغی خیالات میں اور سرکشی پیدا ہو جرمانے سے بھی اسی قسم کا نتیجہ نکلے گا ابتداً سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ملزم کے احوال ذاتی کی بابت جو خفیہ رپورٹ دیکھائی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم کی مالی حالت اچھی نہیں، لہذا جرمانے کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمارے خیال میں ملزم کیلئے یہی سزا کافی ہے کہ مسلمان قوم میں پیدا ہوا ہے۔ جو بگولے کی طرح اٹھتی، آندھی کی طرح چھا جاتی، لیکن بعجلت تمام گرد کی طرح بیٹھ جاتی۔۔۔۔ پھر اس قوم کی تاریخ یہ ہے کہ حسینؓ کا سر تو اتارا ہے، یزید کے سر پر کوئی ہاتھ نہیں ڈالا۔۔۔۔ مطلب ہے کہ حکومتوں سے الجھنا ان کا شیوہ نہیں رہا۔ یہ طاقت کے سومنات میں زندگی بسر کرنے والی قوم ہے جو دولت کو آقا سمجھتی، اور خود کو فروخت کر چکی ہے۔۔۔۔ لہذا میں اقبال کے لئے یہی سزا کافی سمجھتا ہوں، کہ وہ ایک ایسے قافلے کا حدی خواں بن رہا ہے، جس کا سفر کھوٹا، منزل دور، رات اندھیری، چراغ مردہ اور ہمتیں یخ ہیں۔۔۔۔ اندریں حالات ملزم کو روایتی سزا سے بری کیا جاتا ہے۔

اندرونِ خانہ

اقبال اتنے بڑے شاعر یا پیغامبر نہیں، جتنا ان کا شہرہ ہو گیا ہے برصغیر میں ان سے بڑے شاعر ہو گذرے ہیں اور اب بھی ان سے بڑے شاعر موجود ہیں۔ اقبال کی زندگی کا صحیح عکس ہمیں عطیہ فیضی کے نام ان کے خطوں میں ملتا ہے، فلاں نظم ۔۔۔ فلاں نسوانی محرک کے تحت لکھی گئی، لوگوں نے انہیں حکیم الامت اور رحمۃ اللہ علیہ بنا دیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی لہو ولعب سے وابستگیاں خصوصی شہرت رکھتی ہیں یورپ میں انہوں نے جوانی سے پورا پورا اٹھایا۔ جو شخص ہمیں خودی کا درس دیتا رہا، وہ خود تمام عمر لاہور ہائیکورٹ کی ججی کا سوالی رہا، اور بھوپال سے پانچ سو روپے وظیفہ پانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ اقبال کے فلسفہ میں کوئی روح یا عمق نہیں، وہ ایک گمشدہ ماضی کا وعظ ہے اور بس۔''

مندرجہ بالا فرمودات میں الفاظ ہم نے زیادہ صاف اور ستھرے رکھے ہیں۔ ورنہ جن صاحب کے یہ الفاظ ہیں، وہ عادتاً تمسخر کے لہجہ میں کھردرے الفاظ بولتے اور بھک کر چہچہاتے ہیں۔ یہ صاحب ہیں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے پروفیسر محی الدین۔ ایک پیریڈ اورینٹل کالج لاہور میں ''اقبال اور اس کی سوانح و افکار'' پر بھی لیکچر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ ایم اے اردو میں اقبال سے متعلق بھی ایک پرچہ ہے، آثر صاحب اسی کے استاد ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے انہیں گوہرِ نایاب سمجھ کر چن رکھا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اثر صاحب ان مواعظ حسنہ کے بعد قریب قریب دو ماہ سے اورینٹل کالج میں نہیں آ رہے ہیں۔ طلبہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ انہوں نے پرنسپل صاحب سے بھی گذارش کی ہے نگران کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ خیر یہ طلبہ پرنسپل اور پروفیسر کے آپس میں طے کرنے کی باتیں ہیں۔

ہمیں استعجاب بھی رہا اور توقف بھی۔ استعجاب اس پر کہ اگر اقبال پڑھانے کا مطلب وہی ہے جس کے نقش و نگار اوپر دیے گئے ہیں تو اس سے ''اقبال نہ پڑھانا'' بہتر ہے۔ اور توقف یہ تھا کہ ایک فہیم آدمی اس اندازکی بہکی بہکی باتیں کیونکر کر سکتا ہے۔ 'ا تا ی' درست ہے۔ آخر عقدہ کھلا کہ پروفیسر مذکور پرانے روگی ہیں۔ اس قسم کی باتیں نہ کہیں، تو خود ان کے نفس کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ اس آخری ادبی فقرے کے تلخ ہونے کا احساس ہے لیکن ہمارے پاس ان کی وقتی کہانیاں اور راتی داستانیں جمع پڑی ہیں کہ ہم محتاط سے محتاط الفاظ میں انہیں کہہ سکتے ہیں کہ ایک استاد کا مرتبہ ان سے بہت بلند ہے۔ ہمیں محکمہ تعلیم کے فضلائے نغفر سے دردمندانہ شکایت ہے کہ انہوں نے بوقلموں مذاق کے اس دانشور کو بارہا کی گرفت کے باوجود تعزیر کے قابل نہیں سمجھا۔ ہم

نہایت احترام کے ساتھ گورنمنٹ کالج کے موجودہ پرنسپل صاحب سے درخواست کریں گے کہ ان صاحب کو ایک کالج کی ڈرامیٹک کلب کا انچارج بنانا موزوں ہے۔۔۔؟؟

کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان بزرگوار کے خلاف ''چینی لنچ ہوم'' کے کارپردازوں کی طرف سے تحریری درخواست دی گئی۔ اس پر ایک دوسرے استاد کو مقرر کیا گیا۔ لیکن جب درخواست کی شہادت ثقہ ثابت ہوئی، تو معاملہ کو یہ کہہ کر ''رفع دفع'' یا غائب غلہ کر دیا گیا کہ ذاتی معاملہ ہے، اور ذاتی معاملات میں مداخلت درست نہ ہو گی۔

....

یہ صحیح ہے کہ ہر شخص کی ایک پرائیویٹ زندگی ہوتی ہے لیکن پرائیویٹ زندگی کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پبلک میں فائدہ اٹھایا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ فقرہ ہی مہمل ہے۔ حکمران، راہنما، استاد اور پیشوا پرائیویٹ زندگی پر وہ حق نہیں رکھتے، جس حق کے تحت مذکورہ فقرہ بولا جاتا ہے۔ اگر پرائیویٹ زندگی سے مراد یہ ہے کہ ایک انسان غٹاغٹ پی کر سڑکوں پر ناچتا پھرے، طلبہ میں اس کی نیو رکھے، طالبات میں بے باک ہو۔ اس بازار سے لے کر اس بازار تک جنسی تعاقب کرتا رہے۔ غرض پانچوں عیب شرعی ہو، اس کو ٹوکا نہ جائے، یا اس کا چرچا نہ ہو، تو یہ کسی بھی ضابطہ اخلاق اور قاعدہ شرافت کی رو سے جائز نہیں۔ پیشواؤں، حکمرانوں، استادوں اور راہنماؤں کی زندگیاں پبلک ہوتی ہیں اور انہیں اپنی ہر سانس کے لئے جوابدہ ہونا پڑتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی شخص اپنے زہد، اختیار، پیشے اور سیادت کی وجہ سے اخلاقی قدروں کے آئینہ خانے میں نقب لگاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بہمہ وجوہ ملامت کا مستحق ہے اس کی دستارِ فضیلت میں رسوائی کی دھول کا پڑنا لازم ہے۔

پھر ہم لوگوں کا معیارِ اخلاق ہے، تمام دنیا میں استادوں کا بڑا درجہ ہے۔ آئندہ نسل انہی کی گود میں پلتی ہے۔ جس قسم کا اخلاق وہ اپنے شاگردوں میں منتقل کریں گے، وہی قوم کی سیرت کا آئینہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان کالموں میں استادوں کی اخلاقی شریعت کا بارہا ذکر کیا ہے۔ اگر استاد شرابی اور شبابی ہو تو لازماً اس کا مرض متعدی ہو گا۔

ہمیں محی الدین صاحب آثر سے نہ تو ذاتی نیاز حاصل ہے اور نہ اب تک ہم نے ان کی صورت ہی دیکھی ہے اور نہ اس کا شوق ہی ہے کہ ان کے چہرہ پرنور کی زیارت ہو۔ لیکن اپنے طالب علم دوستوں، شناسا پروفیسروں اور خلوتیانِ راز سے جو کچھ سنا ہے، وہ اتنا افسوسناک ہے کہ ایک انسان کی حیثیت سے ان کے شخصی احترام کو ملحوظ رکھنے کے باوجود ہمیں ان سے قرطاس و قلم کی اس محفل میں گفتگو کرنی پڑی ہے۔

وہ اقبالؒ سے بغض رکھتے ہیں یا اقبالؒ کو فی نفسہ ایسا ہی سمجھتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے فرمایا، تو کوئی
بات نہیں، یہ علم کی بات ہے اور علم پر ہر شخص کی ایک خاص نظر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ زہر انہیں طلبہ اور طالبات کو نہیں
پلانا چاہیئے۔ کیونکہ تعلیم اور تنقیص میں خاصا فاصلہ ہے۔ اقبالؒ کے بارے میں کمیونسٹوں کا شیوہ یہی رہا ہے۔
اثر صاحب کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کمیونسٹ ہیں، کیونکہ کسی گوشے سے ایسا کوئی کلمہ کانوں میں
نہیں پڑا۔ تاہم طالبات اور طلبہ کی جماعت میں ان کی عمروں اور اپنے خفی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے
”عطیہ کے خطوں“ کا ذکر چھیڑنا اور طعن وطنز کے انداز میں اقبالؒ علیہ الرحمۃ اور حکیم الامت ہونے پر چھیچھانا
انہیں زیب نہیں دیتا۔ یہ معلمانہ اخلاق نہیں، تعلیمی فرومائیگی ہے۔

....

اگر ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہمارے نظریاتی سروسامان کی حفاظت نہیں ہو سکتی، اور
استاد صاحبان ان اجتماعی قدروں کے فہم سے عاجز ہیں، جن پر یہ ملک قائم ہے اور جن سے اس قوم کے
شب و روز مرتب ہوتے ہیں تو ہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے برخود غلط لوگوں کے محاسبے کا مطالبہ کریں۔

پرائی دنیا کا یہ حال ہے کہ ابھی حال ہی میں ڈاکٹر مارلک استاد فارسی و اردو، چارلس یونیورسٹی پراگ
نے دہلی یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ علامہ اقبالؒ کی کتاب ”پیام مشرق“ کا چیک زبان
میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور چیکوسلاویکیہ میں فروخت ہو رہی ہے۔ اپنی دنیا کا یہ حال ہے کہ اثر صاحب اقبالؒ کی
مافوق الذکر تصویر پیش کرتے ہیں۔ عموماً کوتاہ نفس لوگ بڑے لوگوں کی زندگیوں سے حسب دلخواہ واقعات چن
کر اپنے لئے جامہ تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ اثر صاحب اقبالؒ کے بارے میں یہی کچھ جانتے ہوں،
ضروری نہیں کہ ہر پروفیسر اقبالؒ کا فہم بھی رکھتا ہو۔ اثر صاحب کے بارے میں کہا یہی جاتا ہے کہ وہ فہم اقبالؒ
سے بالطبع معرّی ہیں۔ اگر انہیں اقبالؒ کی تعلیمات کا ذوق ہوتا تو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کیوں کرتے؟

بڑے دنوں سے یہ بات چل نکلی ہے کہ، صاحب، اقبالؒ پیغمبر نہیں انسان ہی تھا، اور اسے انسان ثابت کرنے
کے لئے عطیہ کے خطوط یا عشق کی وارداتوں کا ذکر بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ان کے فلسفہ خودی اور کمال شعر کا۔

بہت اچھا صاحب، لیکن جب اس اصول یا کلیہ کا اطلاق آپ کی زندگی پر ہوتا ہے، تو آپ
پرائیویٹ زندگی کی حفاظت کا حصار کیوں کھڑا کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کو یہ شکایت کس اصل پر پیدا ہوتی
ہے کہ یہ لکھنا اور لکھانا قلم و زبان کا سفلہ پن ہے۔ اپنی زندگیوں کو بھی سامنے لائیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اثر
صاحب سطور بالا میں اپنے آپ کو دیکھ کر خفا نہ ہوں گے۔

عطیہ فیضی

ہم نے پچھلے شمارہ میں ایک مقامی پروفیسر کے فرمودات پر اظہار خیال کرتے ہوئے عطیہ فیضی کے
خطوط کا ذکر کیا تھا ہماری یہ نپی تلی رائے ہے کہ اول تو وہ خط جو عطیہ اس کبرسنی میں علامہ شبلی اور علامہ اقبال سے
منسوب کرتی ہیں ان کے قلم سے نہیں بلکہ بعد کی تصنیف ہیں۔ کیونکہ بعض عورتوں کی پرانی کمزوری ہے کہ وہ
بڑے آدمیوں سے منسوب ہونے کی لذت میں اس قسم کی شاعری فرمانے کی عادی ہوتی ہیں۔ اگر یہ مکاتیب
درست بھی ہوں تو ان کے قلم سے کاغذ پر منتقل ہونے کا زمانہ بالکل ابتدائی ہے۔ جب اقبال صرف شعر کی راہ پر
چل رہے تھے اور وقت کے ساتھ مطالعہ نے ان کے پیام کی راہیں کشادہ نہ کی تھیں اور اگر یہ خطوط اتنے ہی اہم
ہیں تو ضروری نہیں کہ ان کا وہی مفہوم ہو جو بعض نفس خوردہ لوگ الفاظ کے مجازی مفہوم سے اخذ کرتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں قسمت فارسی کے رئیس استاد کبیر ڈاکٹر محمدؐ باقر نے اس سلسلہ میں ایک گرامی
نامہ ارسال فرمایا ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

۲ فروری ۱۹۶۰ء

شورش بھائی

یہ جو تم لکھا ہے کہ عطیہ کے خطوط کا شاخسانہ ہی غالباً فرضی ہے بہت بڑی بات کہی ہے میرا جی تم پر
ہزار جان سے نثار ہونے کو چاہا۔ میرے ایک کیڑے نکالنے والے شاگرد نے جناب شبلی کی زندگی کے متعلق ان
خطوط کی روشنی میں ایک کراہت آمیز مدانی محل تیار کیا۔ تو میں نے ان پر نفرین کا اظہار کیا اس نے مجھے اس
انتقاد پر آج تک نہیں بخشا بلکہ اس نے غالب، حالی اور کئی دوسرے لوگوں کی اس دستار فضیلت کو اچھالنے کی
کوشش کی ہے جو اب کسی کے ہاتھ کی رسائی سے بالاتر ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ جیسے عملی اور دلیر جریدہ نویسوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ ان بزرگوں کی
عصمت و ناموس کی مدافعت کے لئے مستقل جہاد کریں۔ ہوا کچھ ایسی چلی ہے کہ جو لوگ ذکاوت ملوث اور
جوہر کی وجہ سے بڑے نہیں بن سکے۔ وہ پتنگ لوٹنے والوں کی طرح سے ہر وقت ہاتھ میں تنقیص کا ایک
شاندار بانس رکھتے ہیں اور جب موقعہ ملے کسی کی شہرت کو کاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ تا کہ اس حیلے سے وہ
بڑے بن سکیں۔ یہ تسلیم کہ اقبال بھی انسان تھا۔ ابوالکلام آزاد، شبلی اور حالی بھی انسان تھے اور یہ بھی فرشتہ نہیں

لیکن کوئی بتائے کہ استاد یا معلم جب اپنے اور طالبات کے سامنے بزرگوں کی برہنگی کا ذکر کرتے ہیں یا نقاد بزعم خویش ان کے ادبی کارناموں پر بڑے بڑے پتھر لڑھکاتے ہیں اور اپنے کمال فن کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا طالب علم یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتا کہ ہمیں اپنے بزرگوں اور نامور آدمیوں سے ورثہ میں صرف بے مبحث اور معیوب چیزیں ہی ملی ہیں؟ کیا اس تاثر سے اس کا ذہن مایوسی کا شکار نہیں ہوتا؟ کیا وہ اس تاثر کے زیر اثر اپنے آپ بزرگی اور عظمت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کوئی نیا منصوبہ رکھ سکتا ہے؟ اگر آخری سوال کا جواب نفی میں ہے تو آپ ہی بتائیے کہ جدید نقاد، مبصر اور صاحب نظر لوگ خفیہ اور اعلانیہ طور پر کس قسم کی ملی خدمات سرانجام دے رہے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں یہ بزرگوں کی پگڑیاں اچھال کر ان کی عظمت کو داغدار کر رہے ہیں اور آئندہ نسلوں میں بددلی اور بے اعتقادی پیدا کر رہے ہیں۔ اب آپ ان کو سرعام برہنہ کر کے لوگوں کو گمراہی کے راستہ پر پڑنے سے بچائیں۔۔۔۔۔۔۔باقر

کہا یہ جاتا ہے کہ اقبال پیغمبر نہیں تھے جو لوگ ان کی بشری کمزوریوں کو پردہ اخفا میں رکھنا چاہتے ہیں وہ ان کے انسان ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ اس دلیل کا جواب ہم پچھلے شمارے میں دے چکے ہیں۔ کیا کسی بڑے آدمی کو انسان بنانے کے لئے لازم ہے کہ اس کی خلوتوں کو تلاش کریں اور اس کی کمزوریوں کو لپک لپک کر اچھالیں۔ پھر کیا کسی شخص کو انسان ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی زندگی کے معاشقوں کی ٹوہ لگائیں اور جب کوئی شخصی وجود نہ ملے تو دامن میں اس عہد کی کوئی لڑکی اور اس عہد کی بڑھیا اٹھا کر ڈال دیں۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ شراب نوشی فی الجملہ تہذیب حاضر کے نزدیک معیوب نہیں اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ کٹھ ملا ہیں۔ ہم ذاتی طور پر اس قسم کے بزرگوں اور دوستوں کو بھی جانتے ہیں جو اپنے خلوتخانہ اختیار میں بیٹھ کر بڑے شرعی اجتہاد اور دینی تفقہ کے ساتھ فرماتے رہے ہیں کہ قرآن نے شراب نوشی کو ابلیس کا فعل تو کہا ہے لیکن حرام قرار نہیں دیا لہذا اس دور میں جبکہ شراب نکھر چکی ہے اس کے پی لینے میں کوئی قباحت نہیں۔۔۔۔وغیرہ

عقل عیار کی یہ گنجائشیں اور دانش حاضر کی یہ آرائشیں اپنی جگہ کتنا ہی دلپذیر ہوں، صحیح چیز تو یہ ہے کہ ہمارے لئے کسی فرد کا کوئی فعل جواز نہیں اور نہ ہم اس قسم کی حجتوں کو صحیح و مسلم مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک صرف ایک وجود اقدس کا قول و عمل آویزۂ گوش ہے اور وہ حضور سرور کون و مکان ﷺ کی ذات اقدس ہے جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ شراب حرام ہے، زنا انسان کی جڑ کو کاٹتا ہے اور مسلمانوں کی کمزوریوں کو اچھالنا یا نکالنا خدا اور رسول کی منشا کے خلاف ہے۔ تو اس کے بعد کسی مجتہد، کسی فقیہہ کسی حکمران، کسی ادیب، کسی نقاد اور

کسی شاعر کا فرمودہ ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں۔

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

عطیہ فیضی سے ہم شناسا نہیں سنا ہے کہ کراچی میں گئے دنوں کی یادیں لے کر بوڑھی جھریوں میں، شبلی و اقبال کے گمشدہ خطوط کی مہریں تلاش کرتی ہیں۔ ایک عورت کی حیثیت سے ہمارے دل میں ان کا بیحد احترام ہے۔ حیرت ان لوگوں پر ہے جو اقبال کے بہانے ان سے ملاقاتیں کرتے اور پھر خطوط کے ایک بے اعتبار سرمائے سے نہ صرف خود متمتع ہوتے بلکہ لوگوں کو بھی اس گناہ بے لذت میں شریک کرتے ہیں۔

انسان پر مایوسی کے لمحے بھی آتے ہیں اور ذوق کے دن بھی گذرتے ہیں۔ بالفرض اس زمانہ میں عطیہ سے شبلی و اقبال کی رسم و راہ رہی۔ اول تو عقل نہیں مانتی کہ عطیہ کی عمر میں کونسا کمال تھا کہ شبلی و اقبال اپنی عمروں کے بُعد کے باوصف اس سے حسن جمال مانگتے تھے۔

عورت کا حسن بہت جلد ڈھل جانے کی چیز ہے۔ وہ جلد جوان ہو کر جلد بوڑھی ہو جاتی ہے۔ شبلی و اقبال کا محور ایک ہی رہا ہو، عقل نہیں مانتی۔ دونوں کی عمروں میں جو فاصلہ تھا وہ عطیہ کی عمر میں بھی ہوگا۔ عطیہ ابھی تک زندہ ہے اور ان بزرگوں کو اللہ کے ہاں گئے ہوئے زمانہ ہو چکا ہے۔ مولانا شبلی کی وفات پر ۴۶ برس گذر چکے ہیں۔ علامہ اقبال کو ۲۴ برس ہوئے ہیں۔ عطیہ ابھی تک جی رہی ہیں اور محفلیں آراستہ کرتی ہیں۔ ادھر نہ جانے شبلی نے کس عمر میں مصرع طرح اٹھایا اور اقبال نے کب گرہ لگائی۔

قصہ کوتاہ، یہ خطوط چھپ گئے۔ ناشروں نے فرض کر لیجئے اچھا کیا۔ مرتبین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے اور مقدمہ نگاروں کو بھی داد دینی چاہیے۔ لیکن ہمارا ذاتی خیال یہی ہے کہ ان کے خطوط کا ایک حصہ فرضی ہے یا بعد میں تصنیف کیا گیا یا کسی طرح نکل گیا۔ لیکن ہماری گذارش یہ ہے کہ جو چیز مرتبین یا ناشرین اپنے لئے پسند نہیں کرتے اور جن کہانیوں کو مصرین کی کھیپ، اپنے سفر زندگی سے خارج رکھنے کی متمنی ہوتی ہے وہ اقبال اور شبلی کی زندگی سے چسپاں کر کے کیوں ادب عالیہ کا حصہ ہو جاتی ہیں اور انہیں کس اصل کے تحت سوانح نگاری کے فن کا جزو غیر منفک سمجھا جاتا ہے۔

اقبالیات

ابھی ایسے خوش نصیب اشخاص نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں جن کی آنکھوں میں اقبال کے خدوخال کا نقشہ اور جن کے کانوں میں اس کے نغمے سمائے ہوئے ہیں۔ان میں سے اکثر و بیشتر افراد ایسے بھی ہیں جنہیں گزشتہ نصف صدی میں کبھی کبھی ترجمان حقیقت کی صحبتیں بھی نصیب رہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اقبال سے متعلق نئے نئے انکشافات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔جن کے سینوں میں جو امانتیں محفوظ تھیں، وہ آئے دن ملک وملت کی نذر ہو رہی ہیں۔حال ہی میں اقبال کا ایک مکتوب ہماری نظر سے گزرا۔اسکے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اقبال کو اپنے شجر علمی کے باوصف ہمہ دانی کا دعوی نہ تھا۔وہ کبھی کبھی اپنے معاصرین سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ایسے معاصرین میں، جن سے اقبال نے گاہے گاہے استفادہ کیا ہے اور جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، گلستان خانوادہ چشتیہ کے گل سرسبد شیخ المشائخ حضرت سید مہر علی شاہ گولڑوی بھی ہیں۔ان کا سلسلہ نسب ۲۴ویں پشت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے۔ان کی نانی حضرت مخدوم جہانیاں، جہاں گشت کی اولاد میں سے تھیں۔علوم ظاہری سے فراغت کے بعد آپ ایک عرصہ تک حجاز رہے۔حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی تاکید اکید اور پیہم اصرار سے ہندوستان واپس آئے۔حضرت حاجیؒ نے بر بنائے کشف یہ بھی ارشاد فرمایا تھا!

"ہندوستان عنقریب یک فتنہ ظہور کند، شما ضرور در ملک خود واپس بروید و اگر بالفرض شما در ہند خاموش نشستہ باشید تاہم آں فتنہ ترقی نہ کند و در ملک آرام ظاہر شود۔"

(ترجمہ) ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نمودار ہو گا تم ضرور اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔اگر بالفرض تم ہندوستان میں خاموش بیٹھے رہے، تو وہ فتنہ ترقی نہ کرے گا اور ملک میں سکون رہے گا۔

حضرت گولڑویؒ اس کشف کو فتنہ قادیانیت سے تعبیر فرمایا کرتے تھے۔اور کہا کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی خواب میں انہیں اس فتنہ کے انسداد کا حکم دیا تھا۔اس کشف اور اس خواب کا نتیجہ تھا کہ حضرت گولڑویؒ نے زبان وقلم دونو سے قادیانیوں کے عقائد باطلہ کی تردید کی۔حضرت گولڑویؒ اپنے دور

میں انفرادی خصوصیات کے حامل تھے۔شیخ اکبرؒ کے نظریہ وحدت وجود پر ان کو عبور حاصل تھا۔فصوص الحکم کا باقاعدہ درس دیا کرتے تھے اور اس کے اسرار ورموز سے بخوبی آشنا تھے۔اقبال کا مکتوب جو حضرت گولڑویؒ کے نام ہے وہ بھی حضرت شیخ اکبرؒ کی تعلیمات سے متعلق ہے۔مکتوب یہ ہے:۔

مخدوم ومکرم حضرت قبلہ السلام علیکم

اگرچہ زیارت اور استفادہ کا شوق ایک مدت سے ہے تاہم اس سے پہلے شرف نیاز حاصل نہیں ہوا اب اس محرومی کی تلافی اس عریضہ سے کرتا ہوں۔گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہو گی بہر حال جناب کی وسعت اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے۔

میں نے گزشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے روشناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔اب پھر ادھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔نظر بحال چند امور دریافت طلب ہیں۔جناب کے اخلاق کریمانہ سے بعید نہ ہو گا اگر ان سوالات کا جواب شافی مرحمت فرمایا جائے۔

۱)۔ اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے

۲)۔ یہ تعلیم شیخ اکبرؒ کی کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں؟ اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں۔

۳)۔ حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی حقیقت زماں پر بحث کی ہو تو ان بزرگ کے ارشادات کے نشان دہی مطلوب ہے۔مولوی سید انور شاہ مرحوم مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا اس کا نام تھا "درایۃ الزمان"۔جناب کو ضرور اس کا علم ہو گا میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس لیے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔میں نے سنا ہے کہ جناب نے درس وتدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے۔اس لیے مجھے عریضہ لکھنے میں تامل تھا لیکن چونکہ مقصود خدمت اسلام ہے مجھے یقین ہے کہ اس تصدیعہ کے لیے جناب معاف فرمائیں گے اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔باقی التماس دعا!

مخلص محمد اقبال

اس مکتوب کے جواب کا تو ہمیں علم نہیں۔ البتہ یہ سراغ ضرور ملتا ہے کہ اقبال نے مسئلہ زمان و مکان پر جو کچھ نظم ونثر میں تحریر فرمایا ہے، اس میں حضرت گولڑوی کے ملفوظات کو ضرور دخل ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم اقبال کے خطبات مدارس (الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو) سے اس حصہ کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جو زمان و مکاں کی ماہیت سے متعلق ہے۔

علم الکلام کی تاریخ میں پہلے پہل اشاعرہ نے زمانے کی ماہیت پر عقلی اعتبار سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی رائے میں زمانہ آیات منفردہ کے تواتر کا نام ہے۔۔ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی دو زمانی لمحات ایسے نہیں ہیں جن کے مابین خلا نہ پایا جائے۔ اس مضحکہ خیز تخیل کا باعث فقط یہ ہے کہ اشاعرہ نے زمانے پر محض خارجی حیثیت سے نظر ڈالی۔ انہوں نے یونانی فلسفہ کی تاریخ سے متعلق کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جو خود اس غلطی کا شکار ہو گئے تھے۔ عرب ایک عملی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور وہ یونانیوں کی طرح زمانہ کو بے حقیقت نہیں ٹھہرا سکتے تھے۔۔۔۔ بایں ہمہ

ماہیت زمانہ کی تحقیق میں اشاعرہ نے آج کل کے علما کی طرح اس کے نفسیاتی تجربے کی کوئی کوشش نہیں کی لہذا وہ اس کے داخلی مظہر کے ادراک سے قاصر رہے۔ آگے چل کر مسلمان علما نے ان دقتوں کو بخوبی محسوس کر لیا تھا جو زمانے کے اس تصور سے پیدا ہوتی ہیں۔ ملا جلال الدین دوانی نے ''الزورا'' میں لکھا ہے کہ اگر ہم زمانے کو ایک مخصوص مقدار فرض کر لیں جس پر ایک متحرک جلوس کی طرح جملہ حوادث رونما ہوتے ہیں اور اس مقدار کو بجائے خود ایک وحدت ٹھہرائیں تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ زمانہ فعالیت الٰہی کی ایک کیفیت ہے جو اس کی تمام بعد میں آنے والی کیفیات پر حاوی ہے لیکن ساتھ ہی مصنف نے یہ تنبیہ کر دی ہے کہ اگر غور سے کام لیا جائے تو زمانے کا تواتر محض اضافی ہے۔

مشہور صوفی شاعر عراقی نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے نزدیک جس طرح مدارج حیات مختلف ہیں اسی طرح زمانے کی شکلیں بھی لاتعداد ہیں۔ بڑے بڑے اجسام کا زمانہ جو گردش افلاک سے پیدا ہوتا ہے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غیر مادی اشیا کا زمانہ بھی سلسلہ وار ہے لیکن بڑے بڑے اجسام کا ایک سال ان کے ایک دن کے برابر ہے۔ اس طرح بتدریج ہم زمان باری تعالےٰ تک پہنچتے ہیں۔ جو مرور سے قطعاً آزاد ہے وہ ابدیت سے بھی بالاتر ہے۔ نہ اس کی ابتدا ہے، نہ انتہا۔ علمائے اسلام میں امام فخر الدین رازی نے سب سے زیادہ اس مسئلے کے متعلق کاوش اور جستجو سے کام لیا ہے لیکن ان کو اعتراف ہے کہ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔

زندگی کا یہی تصور ابن خلدون کے نظریہ تاریخ کا سب سے اہم پہلو ہے۔ فلنٹ نے غلط نہیں کہا کہ افلاطون، ارسطو اور اگسٹائن کا یہ منصب نہیں کہ وہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کریں۔ باقی حضرات کا ذکر ہی کیا ابن خلدون کا یہ نظریہ ہمارے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ماتحت تاریخ کا تصور یہ ہوگا کہ وہ ایک مسلسل حرکت ہے۔ زمانے کے اندر گویا وہ فی الواقعہ ایک تخلیقی حرکت ہے۔ ایسی حرکت نہیں جس کا راستہ پہلے ہی سے متعین ہو۔ ابن خلدون کو مابعد الطبعیات سے متعلق دلچسپی نہیں تھی لیکن زمانے کے متعلق اس نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم بجا طور پر اس کو برگساں کا پیش رو ٹھہرا سکتے ہیں۔ قرآن پاک کا یہ کہنا کہ اختلاف لیل ونہار، حقیقت مطلقہ کی، جس سے ہر وقت ایک نئی شان کا ظہور ہوتا ہے، ایک آیت ہے۔ اسلامی مابعد الطبعیات کا یہ رجحان ہے کہ زمانے کو ایک خارجی وجود تسلیم کیا جائے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۹ اپریل ۱۹۵۷ء)

اقبالیات

شمارہ پیوستہ میں ہم نے اقبالیات کے تحت ملک برکت علی کے نام قائداعظمؒ کے خطوط کی چوری کا ذکر کیا تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے چور کون ہے؟ کس نے سرقہ کیا، کس نے فروخت کیے اور صلہ وانعام کیا ملا۔۔۔یا لوگوں نے اس پر بے پر کی اُڑانی شروع کی ہیں، ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کریں گے، کس سے؟ پلاننگ کمیشن کے وائس چیئر مین جناب ممتاز حسن سے، کہ انہیں اقبال سے عشق والہانہ ہے، کم سے کم ان خطوط کی چوری کا سراغ ضرور لگائیں۔۔۔اور چور کا پتہ دیں، کیونکہ ایک طرف تو ان کی باخبری کا یہ عالم ہے، کہ وہ کھیم کرن کے کھنڈروں کو کھود کھود کر مولانا ابوالکلام آزاد کے حسب نسب کی ہڈیاں تلاش کرتے ہیں۔ دوسری طرف تعجب ہے کہ وہ اقبال کے صحابہ کی فہرستیں تیار کرتے یا کرواتے وقت بڑے نازک موڑ نظرانداز کر جاتے ہیں ۔۔۔آخر کیوں؟

اقبال کے بارے میں ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ سچ کو سچ ہی رہنا چاہیئے۔ یار لوگوں کو بلاوجہ علامہ اقبال علیہ رحمۃ کا صحابی بننے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے، اگر اقبال کے دشمنوں کو اس بناء پر ٹوکا اور روکا جاتا ہے، کہ وہ ان کے افکار کی پاکیزگی پر حملہ آور ہوتے ہیں، تو ان کے "دوستوں" کی بھی خبر لینی چاہیئے۔ کہ وہ اقبال کی عظمتوں کا سہارا لے کر کہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔۔۔جن لوگوں نے اقبال سے شناسائی کے مفروضہ پر اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ہمارے نزدیک ان کے سومنات بھی غزنوی کے گرزالبرز شکن کی ضربوں کے مستحق ہیں۔ مثلاً واقعات کی مختلف کڑیاں ہیں:۔

۱:۔ چوہدری محمد حسین مرحوم علامہ اقبال کے تمام زندگی جگری دوست رہے، مگر اقبال کے اسماء الرجال میں سے ان کا نام عمداً غائب کیا جارہا ہے۔ کسی تذکرہ نویس نے ان کا ذکر اس اعتماد سے نہیں کیا، جو اعتماد انہیں علامہ اقبال کی نظروں میں حاصل تھا۔

۲:۔ علامہ اقبال کے نام پر سب سے زیادہ اپنی دوکان قلم چودھری غلام احمد پرویز اور مرحوم خلیفہ عبدالحکیم نے چمکائی ہے۔ مگر واقع یہ ہے کہ پرویز صاحب، علامہ نوراللہ مرقدہ کے افکار وکلام کے خوشہ چینوں میں سے تھے کبھی ہم نشینوں میں نہیں رہے۔ خلیفہ عبدالحکیم علامہ کے ہاں ایک قلیل سی مدت میں آتے جاتے رہے۔ مگر فکر

اقبال میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا زیادہ تر حصہ غلط ہے۔۔۔

۳۔ ایک صاحب۔۔۔۔۔آجکل علامہ کے مختلف دواوین کی شرحیں لکھ رہے ہیں۔ ان کا اپنا ایک اسلوب ہے۔ بعض اشعار کی شرحیں حد درجہ ناقص ہیں۔ مگر ان کا ایک لطیفہ سانحہ کی حد تک دلچسپ ہے، کہ وہ اپنے آپ کو علامہ اقبال کا شاگرد ظاہر کرتے ہیں۔ جو بے اساس ہے، اور نہ حضرت علامہ کے کسی شاگرد نے کبھی چشمہ لیا تھا۔۔۔۔۔حضرت علامہ نے کبھی کسی شخص کو اپنا شاگرد نہیں بنایا۔

۴۔ مرزا جلال الدین مرحوم ومغفور علامہ اقبال علیہ رحمۃ کے ابتدائی دور میں بے شبہ ان کے یاران سرپل میں سے تھے، مگر ایک خاص موڑ پر یہ رشتہ منقطع ہونے کے برابر ہوگیا تھا، کیونکہ دونوں کے مذاق کی راہیں جداجدا تھیں۔ مگر سوانح اقبال میں ان کے فرمودات کو ثقہ روایتوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۵۔ میوروڈ (اقبال روڈ) پر ان کی اقامت گاہ جاوید منزل زمین کے حصول کا واقعہ مدت ہوئی شیخ عظیم اللہ مرحوم نے غالباً "کریسنٹ" میں لکھا تھا۔۔۔یہ زمین لاہور میونسپلٹی کی ملکیت تھی، ارکان بلدیہ میں طے پایا تھا کہ ایک خاص بولی پر حضرت علامہ کے نام منتقل کر دی جائے، اور وہ اس پر مکان بنوالیں۔ مگر جب بولی دینے کا وقت آیا، تو ایک مخصوص خاندان کے فرد نے اس وقت کے سنگھٹی ممبروں سے سازباز کر کے بولی کا رخ پھیر دیا، اور معاملہ یکا یک آٹھ ہزار سے اٹھارہ ہزار تک چلا گیا۔۔۔

۶۔ محترم بیگم شاہنواز نے فرط ارادت سے تھل کے علاقہ میں کچھ مربعہ زمین حضرت علامہ کے فرزند کو منتقل کرنے کا ایک اعلان کیا تھا۔ اس وقت تھل بنجر تھا۔ پھر کچھ پتہ نہیں چلا کہ یہ زمین منتقل ہوئی یا نہیں؟ البتہ یہ واقعہ ہے کہ جاوید اقبال کے نام کوئی سی زمین نہیں ہے۔

۷۔ اس حقیقت کو پردۂ اخفاء میں رکھنے کی سعی کیوں جاری ہے، کہ جب کبھی حضرت علامہ کی عدالت عالیہ میں جج کا سوال سامنے آیا، اس صوبہ کے بعض بڑے بڑے خاندانوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ اوران کے بارے میں گورنر وچیف جج کو اس قسم کی شرمناک درخواستیں دیں کہ آج ان کے تصور سے جی کانپ کانپ جاتا ہے۔

۸۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ پاکستان کے اس فکری موسس کی صوبائی لیگ، جس کے وہ صدر تھے، آخر وقت تک آل انڈیا مسلم لیگ سے اپنا الحاق منظور نہ کرا سکی۔ اور ان کے اس راستے کی سب سے بڑی دیوار خود فروخت کنندگان اقبال تھے۔

۹۔ کیا یہ صحیح ہے کہ پنجاب کے تین بڑے، اقبال کی شکایتیں اپنے خداوند ولی نعمت سے کیا کرتے تھے۔

۱۰۔ کیا یہ درست نہیں کہ پنجاب میں دیہاتی وشہری کا مسئلہ پیدا کرنے کے بعد یونینسٹ پارٹی کے سربراہوں

نے اقبال کے خلاف ایک مورچہ سا قائم کئے رکھا، اور جب بھی ان کی معاش کا سوال سامنے آیا، وہ سد سکندری بن گئے۔

۱۱۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی "اقبال کے آخری دو سال میں لکھتے ہیں، کہ جب عدالت عالیہ سے مسجد شہیدا ؟ کا مرافعہ خارج ہوگیا تو سر سکندر سول نافرمانی کے اعادے سے سخت پریشان تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ پریوی کونسل میں اپیل کا واسطہ دیکر مسلمانوں کے اضطراب کو روک لیں۔ اس غرض سے وہ علامہ اقبال کا ایک بیان چاہتے تھے۔۔۔ انہوں نے نواب مظفر خاں اور غالباً (میاں امیر الدین کو اس مطلب کے لئے مقرر کیا۔ نواب ممدوٹ اور میاں امیر الدین حضرت علامہ اقبال کے ہاں پہنچے اتنے میں نواب مظفر خاں کا موز بھی حضرت علامہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ علامہ انہیں دیکھتے ہی فوراً اٹھے اور اپنی خوابگاہ میں چلے گئے ایک صاحب نے اندر جا کر عرض کیا کہ وہ تین اصحاب آپ کا باہر انتظار کر رہے ہیں حضرت نے فرمایا مظفر خان آج بیس سال کے بعد میرے مکان پر آیا ہے مسجد اس نے خود گرائی ہے اور اب بیان دلوانا چاہتا ہے جب تک یہ شخص بیٹھا ہے میں باہر نہیں جاؤں گا۔ اس کی کچھ اور شاخیں بھی ہیں لیکن تذکرہ نویسوں نے ان پر خفا پانی بھی رکھا ہے۔

۱۲: یار لوگ اس پر کیوں غور نہیں کرتے کہ علامہ اقبال کا سارا کام ان کے فکری ارتقا کی مختلف منزلوں میں سے گزرا ہے اس طرح ان کی زندگی بھی مختلف مرحلوں میں مختلف رہی ہے، جس کو چیز نے اقبال کو اقبال بنا دیا۔ اس سے صرف نظر کر کے کچھ تضادات ڈھونڈنا اور عظمت کی اس فضا میں عطیہ فیضی کے خطوط چھاپنا کیا بداخلاقی نہیں؟

۱۳: عطیہ فیضی کے خطوط بڑی حد تک ان کے زمانہ طالب علمی اور اس سے فارغ ہونے کے بعد ایک ابتدائی دور کی یادگار ہیں ان کی نشر و اشاعت سے نہ جانے ادب و علم کی کونسی گمشدہ کڑیاں ہاتھ آتی ہیں۔

۱۴: مولانا غلام رسول مہر نے بھی باقیات اقبال کے نام سے ایک دلچسپ لیکن مضحک مجموعہ مرتب کیا ہے جس حصہ شعر کو حضرت علامہ نے رد کر دیا ہو۔ اس حصہ شعر کو مرتب کرنا کسی کی خدمت ہے اپنی، ناشر کی، یا علم و فن کی یا کسی اور صنف تحریر کی۔

اقبال و بخاری

"اج او ہوندا، تے اینان کرگساں نوں دسدا، کہ بخاری غدار اے کہ فدا کار۔
میں کنوں کواں، میرے تے ساتھی ای میرے کولوں وچھڑ گئے تے یاں نکھڑ گئے نے"

اقبالؒ کا ذکر ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے ایک سرد آہ بھری اور کہا اقبال زندہ ہوتا تو پھر ان کرگسوں کو بتاتا، کہ بخاری غدار ہے یا فدا کار، میں کسے کہوں کہ میرے ساتھ ہی مجھ سے بچھڑ اور بچھڑ گئے ہیں۔

شاہ جی فرماتے تھے جب بھی میں ان کے ہاں حاضر ہوتا اور چارپائی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھے ہوتے، حقہ سامنے ہوتا، دو چار کرسیاں بچھی ہوتیں، صدا دیتا، یا مرشد! فرماتے آ بھی پیرا، بہت دناں بعد آیاں ایں۔ (بہت دناں بعد آئے ہو) علی بخش سے کہتے، حقہ لے جاؤ اور کلی کیلئے پانی لاؤ۔ کلی فرماتے، پھر ارشاد ہوتا، ایک رکوع سناؤ میں پوچھتا حضرت، کوئی تازہ کلام؟ فرماتے ہوتا ہی رہتا ہے۔ عرض کرتا، لائیے، کاپی منگواتے، پہلے رکوع سنتے، پھر اشعار، جو حضورﷺ کا ذکر ہوتا، یا ان کے متعلق کلام پڑھا جاتا، چہرہ اشکبار ہو جاتا۔ حضورﷺ کا ذکر ہمیشہ باوضو شخص سے سنتے اور خود ان کا نام بھی باوضو ہو کر لیتے تھے۔ حضورﷺ کے ذکر پر اس طرح روتے جس طرح ایک معصوم بچہ ماں بغیر روتا ہے۔

افراد و اشخاص اور واقعات و حالات کے بارے میں ان کا تجزیہ حیرت انگیز طور پر درست ہوتا تھا۔

شاہ جی کا بیان ہے کہ مجھ سے اکثر لوگوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے اور ان کی سیرتوں کا اجمالی خاکہ پیش فرماتے۔ سرکار کی بیشتر باتیں انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچی تھیں۔ پہلے خود ہی طرح دیتے، پھر احتراز فرماتے۔ بھئی دلی دروازے کے باغ میں لوگوں کو بتا دو گے؟ پھر بتا بھی دیتے فرماتے اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ لطف یہ تھا کہ اپنے بھی معتمدین کو بتاتے چلے جاتے۔ اور بھی کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنے آپ تک محدود رکھنا۔ اور جب بات بکھر جاتی تو فرماتے تم لوگ نہیں رکھ سکتے ہو؟ عرض کی جاتی کہ آپ ہی نے فلاں فلاں کو بتایا ہے پھر مسکراتے، اچھا تو عام ہو جانے دو، اس میں راز کی کونسی بات ہے۔

ایک دفعہ (بروایت شاہ جی) جلسوں کی رونق پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے۔ عامۃ المسلمین میں بڑی جان ہے۔ اس قوم کا مزاج حرارت سے بنا ہے یہ بجھنے کیلئے پیدا نہیں کی گئی۔ ساری خرابی لیڈر شپ کی ہے۔ خواص تو خیر، عضو معطل ہیں۔ انہیں اپنے جسم کا عیش چاہیے۔ لیڈر گم کردہ راہ ہیں۔ لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لاتے۔۔۔ عرض کیا۔ حضرت یہ بھی آپ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے۔ قوم خود ہی صحیح راہ پر نہیں

آتی؟۔۔۔آپ کیلئے عامۃ المسلمین بری طرح تڑپتے ہیں۔ لیکن آپ مجمع میں آتے ہی نہیں؟

نہیں، پیر جی، یہ بات نہیں، میرا مجمع میری کتابیں ہیں۔ میں ہجوم وافکار میں اس طرح کھڑا رہتا ہوں کہ بسا اوقات فرصت کے لمحات ہی عنقا ہو جاتے ہیں۔

ٹھیک ہے مرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے۔

''او شاہ جی تساں تے دلاں تے دماغاں دیاں مٹی جھاڑدے او''

(شاہ جی۔ آپ تو دلوں اور دماغوں کی مٹی جھاڑتے ہو)

شاہ جی نے یہ بیان کیا، تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، فرمایا ہائے کیا انسان تھا۔ جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطہ معراج، چونکہ میاں ﷺ سے محبت کرتے تھے، اس لیے اللہ نے ان پر علم ودانش اور فکر ونظر کی بھی راہیں کھول دی تھیں۔ وہ میدان کا کھلاڑی نہیں تھا لیکن علم اس کا خانہ زاد تھا۔

آج جو شیفتی وفادار، شاہ جی نے فرمایا۔ اس کا نام لے لے کر اس کے ہمنشینوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا رہے ہیں، کسی علمی مسئلے پر اقبال نے کبھی ان سے مخاطبت کی؟ کبھی ان سے کوئی دینی سوال کیا، کبھی ملی امور پر ان کے از خود گفتگو کی، کبھی مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ان سے زیر بحث لاتے رہے؟ ان کے ساتھ تو ان کے زیادہ سے زیادہ لاغر قسم کے مجلسی روابط تھے۔

شاہ جی نے کہا۔۔۔ یہی وہ لوگ۔ جو اقبال کی راہ میں ہمیشہ مزاحم ہوتے رہے۔ انہی لوگوں نے اقبال کے خلاف مخبریاں کی تھیں اور انہیں کسی منصب پر فائز نہیں ہونے دیتے تھے۔ اقبال نے مجھ سے آنسو لا کر کہا تھا۔

شاہ صاحب، ان خاندان فروشوں کی سیاہ دلی کی حد ہوگئی، خوف خدا سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔ میرے بارے میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، اور گورنر صوبہ کو عرض داشت بھجوائی ہے، جس میں مجھے ایک ایسے ذوق سے متہم کیا ہے، جس کا تصور بھی شرافت کو مرجھا دینے کے لئے کافی تھا۔

شاہ جی نے بتایا، یہ بیان کرتے ہی ان کا بدن کانپنے لگا، کہ انسان مخالفت اور مخاصمت میں کس حد تک سنگدل، سیہ رو، اور گندہ ضمیر ہو جاتا ہے۔

شاہ جی کی روایت ہے کہ فرنگ دشمنی سے ان کے خون کا قطرہ قطرہ انگاروں میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ یورپی تہذیب، یورپی دانش، یورپی سیاست اور یورپی کج دھج کے سخت دشمن تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہمارا مغرب زدہ طبقہ اپنے خصائص کھو چکا ہے۔ اس کے اندر مشرق کی روح بالکل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی

خودی اپنی قیمت کھو بیٹھی ہے۔ لوگ علم کی سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر فنون کا تماشا دیکھنے میں غلطاں ہیں۔

کاسہ لیس خاندانوں کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے۔ یہ طنطنہ میں نے صرف انہی میں دیکھا، کہ جن سے نفرت کرتے۔ انہیں اپنے گھر میں بھی گھسنے نہیں دیتے تھے، اور اگر کوئی کسی بہانے چلا آتا تو اسے دھتکار کر نکال دیتے۔ ورنہ منہ نہیں لگاتے تھے۔

ایک دفعہ فرمایا، شاہ جی میں مطمئن ہوں کہ میرا کلام لوگوں کے رگ وپے میں اتر رہا ہے۔ لیکن ابھی کاروان تیار ہو رہا ہے۔ ابھی کاروان بنا نہیں۔۔۔۔ سفر، راستہ اور منزل تو دور کی چیزیں ہیں۔ جب تک مشرق، مغرب کی ذہانت کو للکارے گا نہیں۔ اس وقت تک مشرق کی عظمت کا سورج نہ کبھی ابھر سکتا ہے، اور نہ اس کے نصف النہار پر پہنچنے کا سوال ہی زیر غور آ سکتا ہے۔

شاہ جی یہ عموماً فرماتے تھے!

کاش اقبال آج زندہ ہوتے، ان کا دماغ ایک عظیم الشان تنہائی کا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ جب کبھی ان کی ہمنشینی کا موقع ملتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لالہ زار کھل گیا ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۵ جنوری ۱۹۶۲ء)

اقبالؒ کے لطائف

علامہ اقبال مرحوم نے قوم کے سامنے شعر و حکمت ہی کے موتی نہیں بکھیرے بلکہ لطافت و ظرافت کے پھول بھی کھلائے ہیں۔ "بانگِ درا" میں ظریفانہ کلام دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جس طرح ان کا شعری و ادبی ذوق، فلسفہ و حکمت کی جلا سے آبدار تھا اسی طرح وہ لطافت اور بذلہ سنجی میں بھی دوسروں سے مختلف تھے۔ ظرافت و لطافت دراصل انسان کے ذوقِ لطیف اور طبیعت کی شگفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اکثر آدمیوں کو دیکھا ہے، وہ شعر و ادب میں بڑے ستھرے اور بلند پایہ خیالات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے فکر و تخیل کے چمن رنگ و نکہت سے آراستہ نظر آتے ہیں۔ لیکن ظرافت کے میدان میں بلند معیار قائم نہیں رکھ سکتے۔ روایتی نوک جھونک اور سطحی اندازِ تحریر انہیں ظرافت و لطافت سے ہزلیات کے خارزاروں میں کھینچ لاتے ہیں۔ حتیٰ کہ سعدی ایسے قادر الکلام شاعر بھی جب ہزل کی طرف آتے ہیں تو وہ رنگ برقرار نہیں رہتا۔ لیکن علامہ مرحوم نے اس صنف میں بھی اپنی حکیمانہ انفرادیت قائم رکھی۔ ان کے ظریفانہ اشعار میں بھی استعارہ و تلمیح کے وہی جوہر موجود ہیں جو ان کے حکیمانہ کلام کے روح تھے۔ مثلاً گائے کے نوکدار سینگ سے وہ ہندو کی پرپیچ سیاست کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

وہ مغربی طرزِ تعلیم پر طنز کرتے ہیں لیکن مقصودِ نظر یہاں بھی قوم کی اصلاح ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے سیکھ لی فلاح کی راہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

"نئی تہذیب" پر، جو اسلامی معاشرہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی اور اپنی رنگین آفرینیوں کے تیرلے کر قلب و ذہن پر حملہ آور ہے اس سے بہتر تبصرہ کیا ہوگا۔

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ان "گندے انڈوں" کو آجکل کی زبان میں آپ "ٹیڈی بوائز" بھی کہہ سکتے ہیں۔

جب حکومت پنجاب نے لاہور میں اسمبلی ہال بنایا تو علامہ نے کس بے ساختگی سے فرمایا۔

"کوئی تکیہ نہ تھا اس شہر میں سرمایہ داروں کا"

اسمبلی ہال کے متعلق ان کی پیشین گوئی کیسی برمحل ثابت ہوئی؟ علامہ مرحوم کا ظریفانہ کلام بھی اصلاح و حکمت سے خالی نہیں لیکن آج کی محفل میں ان کی نثری شگفتہ گوئی کے چند نمونے قارئین "چٹان" کے تفننِ طبع کی خاطر حاضر ہیں۔ جن سے نہ صرف ان کی بذلہ سنجی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی لطافت و ظرافت خالی از حکمت نہ تھی۔

جن دنوں علامہ مرحوم کیمبرج یونیورسٹی لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چند ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب نے دریافت کیا۔

"مسٹر اقبال! یہ کیا بات ہے۔ دنیا میں جتنے پیغمبر اور بانیان مذاہب آئے وہ ایشیا ہی میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیغمبر پیدا نہیں ہوا۔"

علامہ نے جواب دیا: "بھائی! اللہ میاں اور شیطان نے شروع شروع میں ہی اپنا اپنا پینترا جما لیا تھا۔ اللہ نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔"

وہ صاحب فوراً بول اٹھے۔ "تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟"

علامہ نے بے ساختہ جواب دیا: "یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہلِ سیاست، اسی کے رسول ہیں۔"

اس فقرے پر محفل کشتِ زعفران بن گئی اور قہقہے بکھرتے رہے۔ یورپ اور انگلستان میں آج بھی ہزاروں ایسے لوگ موجود ہیں جو برصغیر پاک و ہند کو بڑے بڑے دریاؤں، پہاڑوں، بیابانوں، شیروں، ہاتھیوں، سانپوں، بچھوؤں، سپیروں اور جنگلی آدمیوں کی سرزمین سمجھتے ہیں۔ یہ خیال شروع شروع میں دراصل عیسائی مشنریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی افسانہ طرازیوں کی پیداوار تھا تاکہ ان لوگوں کو اپنی بہادری اور دلیری کا سکہ جمانے کا موقع مل سکے۔ وہ عجیب و غریب افسانے بیان کر کے یورپ کی محفلوں کو گرماتے تھے۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء کو انگلستان گئے تو انہیں بھی اسی قسم کی حکایات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مجلس

میں ایک محترمہ پوچھنے لگیں" کیوں مسٹر اقبال! کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا تھا؟"

علامہ نہایت سنجیدگی سے بولے ۔۔۔"نہیں بی جان! ہر روز نہیں ۔۔۔ ہر تیسرے دن ۔"

علامہ مرحوم خود بیان کرتے ہیں انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا۔

"(ALL CHANGE)" "سب بدل جاؤ۔"

ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے ۔ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔"یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں۔ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے۔"

چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا، میں نے کہا "ابھی جواب دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر چپ ہو رہا چند منٹ کے بعد انہوں نے دوبارہ پوچھا، میں نے پھر کہا "ابھی جواب دیتا ہوں۔" وہ کہنے لگے ۔۔۔شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں"۔۔۔

میں نے کہا "ہاں"

اسی دوران میں اسٹیشن آ گیا اور گارڈ پکارنے لگا "ALL CHANGE" ۔۔۔ "سب بدل جاؤ"

میں نے کہا "بس یہی بدھ مذہب ہے"۔

میاں بشیر احمد بیرسٹرایٹ لاء مدیر "ہمایوں" بیان کرتے ہیں ۔۔۔ جب وہ اپنی میوروڈ والی کوٹھی جاوید منزل میں آ چکے تھے ،میں کبھی کبھی حاضر ہوتا اور بال جبریل کے بعض اشعار کا مفہوم دریافت کرتا تھا۔ایک روز میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! اس شعر میں کیا اشارہ ہے؟

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

میں حیران ہوا کہ تین سو سال ہوئے جہانگیر کے ہاں میخواری کا دور دورہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا پھر وہی رسم قدیم جاری کرنا چاہتے ہیں؟

جواب دیا نہیں ۔ یہ شیخ مجدد الف ثانی سرہندی کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانان ہند کے سب سے

زبردست رہنما گزرے ہیں۔

سعید اللہ نے کہا" آج کل ہندوستان میں "نیشنل انیتھم" کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے، آپ کی اس مسئلہ کے متعلق کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر صاحب "نیشنل انیتھم" تو اس صورت میں ہو کہ کوئی "نیشن" ہو، جب سرے سے "نیشن" ہی کا کوئی وجود نہیں ہے تو "نیشنل انیتھم" کہاں ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی "نیشنل انیتھم" کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سعید اللہ ۔"بندے ماترم" پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی میں ہے، دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔(ذرا گرمی سے) آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں؟ ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالئے ،کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے، ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثنا ہے، رامائن، اور وہ بھی بعض بعض حصوں میں۔

عبدالواحد :۔مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے۔قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب:۔ میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں، جس طرح منشیات سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کرے۔

عبدالواحد:۔کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے، مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہیوں کا میلہ ہوتا ہے، وہاں قوالی سے بعض لوگ یک دم حال میں آ جاتے ہیں، کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک دستور بنا لیا ہے یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے خوش جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔

(ہفت روزہ چٹان ۔۲۳ اپریل ۱۹۶۲)

اقبال کے دوست یا دشمن

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند باما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

"اقبال اس دنیا سے اٹھ گیا تو سب پکار اٹھے کہ ہمارا دوست تھا مگر کوئی نہیں جانتا کہ اس نے کیا کہا؟ کس سے کہا؟ اور کس مقام سے کہا؟"

اقبالؒ کے بارے میں بہ اختصار یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس صدی کے مسلمان مفکروں میں مقبولیت عامہ کے اعتبار سے جو خلعت دوام قدرت نے انہیں بخشا ہے وہ اعزاز فی زمانہ کسی مسلمان مفکر کو حاصل نہیں ہوا اور غالباً فکر ونظر کی یہ صولت بھی کسی مسلمان حکیم کے حصہ میں نہیں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس ایک سو سال میں، ہمارے ہاں۔۔۔ یعنی دنیائے اسلام میں بعض نامور شمشیر زن، صاحب نظر اور مدبر پیدا ہوئے یعنی اس قسم کے سیاسی راہنما بھی پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کی اجتماعی تقدیر کے بدلنے میں مقامی اور غیر مقامی طور پر حصہ لیا مثلاً جمال الدین افغانی کا سیاسی کردار مسلمانوں کے بین الاقوامی وجود کے لئے آیہ رحمت ثابت ہوا اور ان کے دل میں ایک انحطاط سے ابھرنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ گو یہ خواہش حریت خوابوں تک ہی رہی۔ مسلمان ملکوں کی بادشاہتوں اور غلام ملکوں میں ان کی کارفرما لیڈرشپ نے اسے عملاً قبول نہ کیا۔ تاہم ان کے اثرات قلم وزبان کے مختلف دوائر میں بڑے ہی مفید ثابت ہوئے۔ ہم برصغیر کے مسلمان کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ان کے فکری وجود سے دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ فائدہ اٹھایا اور ہم میں مسلمان ملکوں کو آزاد دیکھنے کی آرزو جوان سے جوان ہوتی گئی۔ اقبال کا کردار فکری رہا انہوں نے ایک ایسے فکر کو جنم دیا جو مغرب کے اقتدار اور مشرق کے انحطاط کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس فکر کے برگ وبار ابھی سامنے نہیں آئے اور عملاً ہم اس کو کسی ریاست، مملکت یا قوم کی ذہنی زمین میں بو نہیں سکے ہیں لیکن اس کا چرچا اتنا ہے کہ اقبال کے تصورات لحظہ بہ لحظہ پھیلتے چلے جارہے ہیں اور مسلمانوں کے دماغی صحراؤں میں اس ابر خوش ہنگام نے توانائی فکر کے بہت سے نخلستان پیدا کردیے ہیں۔

اقبال کے اس کردار کی فتوحات پر ایک جامع کتاب تفصیل لکھی جاسکتی ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ ہمارے اہل قلم کی تحقیقی فرومایگی کے باعث اقبال کے اس حقیقی کارنامہ پر شاذ ہی کسی نے قلم اٹھایا ہے اور جن لوگوں نے اقبال کے نام پر ادارے بنا کر اقبالیات کی فصل کاشت کرنی شروع کی ہے انہوں نے اقبال کی ان فتوحات پر نہ صرف صرف نظر سے کام لیا ہے بلکہ اقبال کی فکر کے اساسات سے ناواقف ہونے کے باعث ایک طرف انہیں یورپ کے فلاسفۂ عصر کا خوشہ چین قرار دینا چاہا ہے دوسری طرف یورپ کی فکر کو انہوں نے جو چیلنج کیا ہے اس پر تعریض کی ہے۔ جیسا کہ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی بھاری بھرکم تصنیف "فکر اقبال" سے ظاہر ہے

بہر حال یہ ایک دوسرا موضوع اور مبحث ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال کی بے پناہ مقبولیت نے ان کے نام پر شرح وتفسیر، سوانح اور افکار، اور نظریہ وبیان کے جو حلقے پیدا کیے ہیں اور جو لوگ ان کے نام پر جمع ہونے لگے انہوں نے

1۔ اقبال کو کم پیش کیا، خود زیادہ پیش ہونے لگے۔
2۔ اقبال کے احباب میں شریک ہوکر اپنا نام چمکانے کی آرزو کا شکار ہوگئے۔
3۔ اقبال کا قلم کار بننے کی آرزو انہیں کشاں کشاں ان کے حلقے میں لے گئی۔
4۔ سرکاری امداد نے ایک طائفہ قلم پیدا کردیا جس نے اقبال سے ناآشنا ہونے کے باوصف اقبال کو موضوع سخن بنایا تا کہ ان کا بازار سخن گرم ہوتا رہے۔

ان لوگوں نے اقبال سے کہیں زیادہ اقبال کی آڑ میں اپنے ماضی کا دفاع شروع کیا۔ بڑی بدنصیبی یہ رہی کہ اقبال کا حقیقی فکر گم ہوتا رہا اور اقبال کے نام پر اس قسم کی کتابیں منظر عام پر آنے لگیں جنہیں ایک چمنستان کے سبزہ آور سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔۔۔ اس پس منظر سے ایک اور چیز پیدا ہوئی بلکہ اب عام ہوگئی ہے اور مستقبل میں یہ ابتلا ثابت ہوگی کہ اقبال کے نام پر کچھ سے کچھ تصنیف ہونے لگا۔ راویوں کا ایک قافلہ پیدا ہوگیا اور ہر شخص نے خواہ اس نے کلام اقبال کی شرح لکھی، خواہ سوانح لکھے، خواہ ان کے فکر پر قلم اٹھایا، خواہ سیاسی اور نجی زندگی کے خطوط وضع کیے یہ بات بڑے وثوق سے کہی ہے، کہ حضرت مجھ سے یہ فرماتے تھے، مجھے فلاں خط میں یہ لکھا تھا، میری ان کے ہاں حاضری ہوتی تو یہ ارشاد ہوتا۔ ایسی باتیں اپنی جگہ کتنی ہی وقیع کیوں نہ ہوں لیکن بعض باتیں حقائق کے درجے میں ہیں بلکہ مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اقبال کے سوانح سے لے کر اقبال کے افکار تک بعض لوگوں نے خطرناک قسم کی گستاخیاں کی ہیں۔

اقبال کے خیالات سے اتفاق بھی ہوسکتا ہے اور اختلاف بھی۔ یہ ہر شخص کے اپنے ذوق اور اپنے

فکر کے مطابق ہوگا۔ لیکن اقبال کی ذات سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے اپنی ذات کی نمائش کرنا اور خلاف واقع باتیں عقیدت کی آڑ میں کہہ جانا نہ صرف خطرناک قسم کی گستاخی ہے بلکہ پرائے گھر میں نقب لگانے کے برابر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت علامہ کے ملاقاتی بہت سے تھے اور ظاہر ہے کہ حضرت علامہ ان سے بہت سے موضوعات پر گفت گو فرماتے رہے لیکن پیچ وتاب رازی اور سوز و ساز رومی کی متاع سے ان ہم نشینوں نے کیا حصہ پایا؟ اور جو کچھ حضرت علامہ نے اپنے کلام میں کہا ہے، اس کے بیان پر یہ کہاں تک قادر ہیں؟ جب اقبال کے عنوان سے ہم ان کی تحریریں پڑھتے ہیں تو واقعتاً مایوسی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جو چیز طے کرنی ہے یہ ہے کہ اقبال کے اسماء الرجال کی ایک فہرست تیار کی جائے پھر ان کے درجات کی تقسیم ہو۔ پھر ان کی مدت کا تعین ہو، پھر ان کے ساتھ بات چیت کا رخ معلوم ہو، پھر ان کی ملاقاتوں کے زمانے کا حال معلوم ہو تب یہ بات طے ہو سکتی ہے کہ کون کیا کہہ رہا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ اور کس برتے پر کہہ رہا ہے؟

ایک مثال ذہن میں رکھیے کہ علی بخش سے بڑھ کر علامہ اقبال کا وفادار، رازدار اور جانثار کون ہوگا؟ جس نے عمر کی نصف صدی ان کے ہاں گزار دی ہے۔ مگر آپ اس سے خودی کی ماہیت نہیں پوچھ سکتے۔ اور نہ اس بارے میں وہ ابجد آشنائی کا دعوی ہی کر سکتا ہے۔۔۔۔ یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو اقبال کے چند دنوں ملاقاتی ضرور رہے یا خط و کتابت کا عارضی شرف حاصل کیا مگر اب قطعیت کے ساتھ اقبال اور ان کی فکر کے بارے میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو واقفیت در علمیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ اقبال سے بالتزام ملنے والوں میں بہت سے لوگ تھے۔۔۔

۱۔ ذاتی احباب۔ جن میں مثلاً چودھری محمد حسین مرحوم کا نام امتیاز کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ان کا علمی رشتہ بھی تھا۔ حضرت علامہ جو لکھتے چودھری صاحب سے بحث و نظر کی صحبت رچاتے۔ یہ گویا ان کے معتمد تھے۔

۲۔ ذاتی عقیدت مند۔ مثلاً راجہ حسن اختر وغیرہ جو خدمت گزاری اور اکتساب نظر کو اپنا سب سے بڑا شرف سمجھتے تھے۔

۳۔ سیاسی احباب۔ پیر تاج دین، غلام رسول بیرسٹر، ملک برکت علی، جن سے وہ واقعی معلومات حاصل کرتے اور سیاسیات کے رنگ و روغن پر بات چیت فرماتے تھے۔ لیکن یہ کوئی مکمل فہرست نہیں۔ یہ صرف مثالیں ہیں۔ اسی طرح نذیر نیازی ان کے مشیر مخلص اور خدمت گزار رہے۔ لاہور میں ہوں یا لاہور سے باہر جامعہ ملیہ دہلی میں، وہ اقبال کے ہی صحابی تھے۔ مہر و سالک سے بھی حضرت علامہ کے روابط تھے۔ مگر ان میں اخباری آب و ہوا کے مطابق اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا۔ شیخ عبدالقادر" آخری پندرہ برس میں ان سے بالکل ہی

نہ ملے، کچھ وجوہ تھے جن کے باعث علامہ اقبال کا دل ان سے کشیدہ تھا۔ بعض مسجدوں کے پیش امام حضرت علامہ کے نزدیک سرکاری جاسوس تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اکثر لوگ مرکزی حکومت کے انٹیلی جنس بیورو کے گماشتے اور صوبائی حکومت کے فرستادہ کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پنجاب کے سرکاری خاندانوں نے انہیں زندگی بھر معیشت کے اعتبار سے پریشان رکھا۔ غلام احمد پرویز۔۔۔ اب داعی ہوتے جا رہے ہیں ۔ بلکہ ہو چکے ہیں لیکن علامہ اقبال سے ان کا تعلق صرف نذیر نیازی کی معرفت کا تھا۔ اقبال کی تفسیر کا وہ حصہ پرویز کا اپنا ہے۔ جو ان کے ذہن کی افتاد کے باعث کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یوسف سلیم چشتی کی شرحیں محل نظر ہیں۔ بلکہ عجیب الخلقت شرحیں ہیں کہ ان پر شرح و بسط سے قلم اٹھایا جائے تو ایک بڑا حصہ ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

غرض اقبال زیادہ تر ان لوگوں کے قبضہ و تصرف میں ہے جو برطانوی عہد کے انٹیلی جنس بیورو کی طرف سے ان کے اندر کی سراغ رسانی پر مامور تھے اور اب کلام اقبال کے "شارح" بن کر۔۔۔ علم کا منہ کالا کر رہے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ء)

کچھ سوال کچھ جواب

سوال: شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر ماہنامہ "ساقی" نے اپنی کتاب "گنجینہ گوہر" میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کے جو خاکے کھینچے، لکھے یا بنائے ہیں ان میں سعادت حسن منٹو کے خاکے میں علامہ اقبالؒ کے دست راست چودھری محمد حسین کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"(منٹو) نے دھڑلے سے "فحش" مضامین لکھنے شروع کر دیئے حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر چودھری محمد حسین ایک عجیب وغریب بزرگ تھے۔ تھے تو علامہ اقبال کے حاشیہ نشینوں میں سے، مگر انہیں یہ زعم تھا کہ اقبال کو اقبال میں نے بنایا ہے۔ یہ صاحب ہاتھ دھو کر منٹو کے پیچھے پڑ گئے اور یکے بعد دیگرے انہوں نے منٹو پر کئی مقدمات قائم کرا دیئے۔ پھر ان کا نشہ اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مضمون نگاروں کے ساتھ ناشروں اور کتب فروشوں کو بھی پیٹنا شروع کر دیا۔۔۔" صفحہ ۱۴۷

کیا یہ درست ہے یا شاہد صاحب محترم کے اپنے خامہ گوہر رقم کا اعجاز ہے؟

سعید اختر، ایم اے گلوالی دروازہ، ملتان

جواب: گنجینہ گوہر راقم الحروف کی نظر سے بھی گذری ہے۔ شاہد صاحب کا اسلوب نگارش بڑا ہی پیارا ہے لیکن بعض جگہ وہ رو رعایت کر گئے ہیں اور کئی افراد کے ضمنی ذکر میں انہوں نے سنی سنائی باتوں پر انحصار کیا ہے چودھری صاحب مرحوم کے بارے میں یہ بالکل ہی غلط ہے کہ انہیں زعم تھا کہ اقبال کو اقبال میں نے بنایا ہے شاہد صاحب کے قلم سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ ایک بے بنیاد روایت پر انحصار کریں گے یا الفاظ کے چناؤ میں ترشی کو مقدم رکھیں گے۔ چودھری صاحب مرحوم پریس برانچ میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور پنجاب میں جو کتابیں رسالے یا اخبار چھپتے تھے، ان کا قانونی احتساب و جائزہ ان کے فرائض میں تھا۔ لیکن وہ سرکاری فرائض کی بجا آوری کے باوجود سچے مسلمان، انتہائی دیانتدار، طبعاً بے ضرر، درویش صفت، بڑے ہی فاضل اقبال کے مزاج شناس اور ان کے جگری دوست تھے اور یہ دوستی دنوں کی نہیں، برسوں کی تھی۔ حضرت علامہ ہی نے انہیں اس پوسٹ پر لگوایا تھا۔ وہ علامہ اقبال کے مطالعاتی مشیر تھے۔ انہوں نے حضرت علامہؒ کی ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کے بعد بھی خدمت کی۔ ان کے بارے میں شہادت حضرت علامہ، ان کے خاندان یا جگری دوستوں کی وقیع ہو سکتی ہے یا کہ منٹو وغیرہ کی۔ منٹو کی فحش نگاری کا اس طرح دفاع کرنا یا ایک واقعہ کی روایت

میں اس قسم کے پیوند لگانا ہمارے نزدیک اونچے درجے کی بات نہیں اور شاہد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ خلاف واقعہ اور اصلاً غلط ہے۔

منٹو افسانہ نگار تھا اور اپنے دوائر میں اس کا بڑا نام تھا لیکن اس کا قلم عموماً جنسیات کے گرد گھومتا تھا اور اس میدان میں اتنا بے قابو ہو چکا تھا کہ ہم اس کی تحریروں کو کسی طرح بھی ادب کی اس صف میں جگہ نہیں دے سکتے جس سے کسی قوم کی اخلاقی قدریں نشوونما پاتی ہیں۔۔۔

سوال:۔ کیا وجہ ہے کہ علامہ اقبال کے اشعار سے تو ہم تقریر و تحریر میں غایت درجہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ان کی نثر (خطبات، خطوط، بیانات) سے استفادہ نہیں کرتے۔ حالانکہ جو کچھ انہوں نے نظم میں کہا ہے اس کی تفصیلات ان کے نثری افکار میں موجود ہے؟

حامد علی خان بی، اے گلبرگ، لاہور

جواب:۔ یہ بات خود راقم الحروف نے کئی دفعہ لکھی ہے اور اب کے ایک دو جلسوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اقبال کے نام پر جو ادارے کام کر رہے ہیں وہ اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان اداروں میں اس قسم کے عناصر جمع ہو گئے ہیں جو خود خاص قسم کے رجحانات رکھتے ہیں اور جن کے دماغوں میں مخصوص نظریات جاگزیں ہیں۔ اقبال نے واقعتہً اپنے نثری افکار میں بیشمار مسئلوں کی طرف اپنے جوابات کے ساتھ نشاندہی کی ہے۔ حالت یہ ہے کہ جو لوگ اقبال سے عشق رکھتے ہیں وہ جذباتی حدود سے آگے نہیں بڑھتے اور جو لوگ اقبال کو سیاسی لحاظ سے استعمال کرتے ہیں وہ ان افکار کے فہم کی توفیق نہیں رکھتے۔ پھر ان خطبات و خطوط میں ایسی باتیں موجود ہیں جو اقبال کے ان "شیدائیوں" کی ذاتی، حزبی، سیاسی اور سرکاری مصلحتوں کے منافی ہیں۔ سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وقتی نوعیت کی بعض باتیں جن کی **تصحیح و تصریح** کو حضرت علامہ نے قبول کر لیا تھا آج بھی بہ التزام نمایاں کی جاتی ہیں۔ مثلاً مولانا حسین احمد مدنیؒ سے منسوب یہ فقرہ کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں روایتہً غلط تھا۔ جب مولانا مدنیؒ نے اپنی تقریر کی اصل بیان کی کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وہ اسے قبول کریں یا اختیار کریں بلکہ ایک خبر دی تھی کہ آجکل قومیں اوطان سے بنتی ہیں تو پھر نقد و بحث کے بعد حضرت علامہ نے اپنے قطعہ کی تلخی کا احساس کرتے ہوئے اپنے مرتبہ کے مطابق اعتذار فرما دیا۔ "ارمغان حجاز" حضرت علامہ کی وفات کے بعد چھپی اور یہ قطعہ اس میں شامل کر دیا گیا۔ یہ دیانتداری کے خلاف ہے کہ حضرت علامہ کی وفات کے بعد ہم سڑی قسم کے خطوط بھی

علامہ کے مجموعہ مکاتیب میں شامل کریں اور عطیہ فیضی بھی اپنے گلرنگ خطوط چھپوائے مگر اس سلسلہ میں جو خط و کتابت جناب طالوت اور حضرت علامہ کے درمیان ہوئی وہ غتر بود کر دی جائے اور علامہ کے اس خط کو خط ہی نہ سمجھا جائے کیا یہ خط علامہ کا نہیں؟ یہ تو ان کی زندگی میں چھپا تھا پھر اس کے ساتھ یتیم پوتے کا سا سلوک کیوں ہو رہا ہے؟ اور ان خطوط کی اشاعت کا جواز کیا ہے جو اب دفعتہً سامنے لائے جا رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے نام بعض مشاہیر کے خطوط کتابی شکل میں چھاپے ہیں۔ ان میں حضرت علامہ کا ایک خط ہے جس میں قادیانیوں کو اسلام اور ہندوستان دونوں کا غدار کہا ہے لیکن پاکستان میں کسی نے اس خط کی رسید تک نہیں دی۔

حضرت علامہ نے عمر کے آخری برسوں میں قادیانی امت کے خلاف یقین و ثبات کے ساتھ قلم اٹھایا تھا اور بڑے کھلے لفظوں میں قادیانی امت کا تجزیہ کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا تھا کہ وہ اسے مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دے۔ ادھر پاکستان بن جانے کے بعد یہ سوال اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ جب پاکستان کی تخیل کے بانی ہیں تو ان کے اس واضح مطالبہ کو قبول کرنے میں روک کیا ہے؟ وہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی یہ تحریر اقبال کے نام پر کاروبار کرنے والے اداروں اور اقبال کے نام پر گرانٹ حاصل کرنے والی اکادمیوں نے غائب کر رکھی ہے۔ ''اقبال اور ملا'' قسم کے کتابچے تو خود ساختہ مفاہیم و مطالب کے تحت سرکاری روپیہ سے شائع کیے جاتے ہیں یا اقبال کی مذہبی روح کو کچلنے کے لیے ''فکر اقبال'' جیسی لغو کتابیں بھی منظر اشاعت پر چلی آتی ہیں مگر حضرت علامہ کے ان ارشادات کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا جاتا۔

یہ صورت حال خود ہمارے لیے ایک سوال ہے جواب اس کا یہ ہے کہ اقبال جن لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے تھا وہ اس سے بہمہ وجوہ کنارہ کش ہیں اور جن لوگوں کے خلاف اقبال نے بغاوت کی ہے وہ اس کی مجاوری میں پیش پیش ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کی اصل فکر قلم کے لقدروں نے ہتھیا رکھی ہے۔ یہ اقبال کو چوری کرنے کی ایک عجیب و غریب سازش ہے اندریں حالات ایک ایسی اقبال اکیڈمی کی ضرورت ہے جو اقبال کو ان لوگوں سے نجات دلا سکے جو اس کی فکر پر غاصبانہ قبضہ کر کے اپنی مرضی کا مال اقبال کے نام پر فروخت کر رہے ہیں اور جن کا اپنا کوئی وجود نہیں بلکہ وہ مستعار خاکے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۶ مئی ۱۹۶۳)

اقبال دانشوروں کے نرغہ میں

اقبال کے متعلق ایک دستاویزی فلم پر اعتراض کیا گیا تھا کہ فیض احمد فیض نے مکالمے لکھ کر افکار اقبال کی نفی کی ہے۔ قدرتاً فیض احمد فیض کے خیالات اور علامہ اقبال کے نظریات بھی زیر بحث آ گئے دانشوروں میں سے ایک صاحب نے اصل بحث سے قطع نظر کر کے اس کا رخ موڑ دیا۔ نتیجۃً ایک دن میں یہ بحث ختم ہو گئی۔ بظاہر کسی لمبی چوڑی بحث کا محل ہی نہ تھا فیض احمد فیض اور علامہ اقبال کے خیالات میں بُعد المشرقین ہے فیض صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے اور اقبال کے نظریات میں کوئی مطابقت نہیں۔ فیض ایمانداری سے کمیونزم کے حامی ہیں اور اقبال کے نزدیک ہر وہ نظریہ قابل استرداد ہے جس سے اسلام کی نفی ہوتی ہے۔ اس بحث کو آسان کرنے کے لیے یہ ماننا اور جاننا کافی ہے کہ:۔

☆ فیض تاریخ کی مادی تعبیر کے قائل ہیں

☆ ان کے نظریات کی بنا مارکسزم پر ہے

☆ ان کا آئیڈیل نظام اشتراکیت ہے

☆ ان کے نزدیک معاشرہ کی آئندہ بنیاد عدم طبقاتی نظام پر ہے اور اس عدم طبقاتی نظام کو کمیونزم کے معروف و معلوم طریقوں ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے

اقبال کا تصور حیات اس سے بالکل مختلف ہے

☆ وہ تاریخ کی مادی تعبیر کے بالکل ہی قائل نہیں

☆ ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسی طاقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے سرچشمہ ہدایت ہے۔ ان کا سارا کلام توحید و رسالت کی اساس پر ہے اور ان کی ساری وفاداری اسلام کے ساتھ ہے

☆ اقبال کا آئیڈیل قرآن و سنت ہیں ان کے نزدیک نزاع کا باعث طبقاتی سماج ہی نہیں انسان کی مذہب سے بیگانگی اور مغرب کے مادی افکار کا اتباع بھی ہے۔

وہ کسی خارجی فلسفہ کی بنیاد پر انسانی وحدت کے قائل نہیں، بلکہ ایک ہی وحدت کے قائل ہیں اور وہ ہے بنی نوع انسان کی وحدت، جس کی اساس الخلق عیال اللہ کے

اصول پر ہو

اقبال کے مطمح نظر کا یہ خلاصہ ان کے افکار و اشعار میں بہ تفصیل موجود ہے۔ اب اگر کوئی اختلاف کرتا ہے تو اس کو اپنے خیالات کی بنا پر اس کا حق پہنچتا ہے۔ کوئی اتفاق کرتا ہے تو مطالعہ اقبال کی گہرائی و گیرائی کا ہی مطالبہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص جو اقبال کے افکار کی بنیادی روح ہی سے متفق نہیں اس کو یہ حق دیا یا سونپا جا سکتا ہے کہ اقبال کی فکر کا نمائندہ ہو یا ان کے سوانح و افکار کو اپنے نظریاتی سانچہ میں ڈھالے؟ فرض کیجئے فیض ہی پر ایک دستاویزی فلم تیار کی جائے۔ کیا ان کے معتقدین کسی ایسے شخص کو ان کے سوانح و افکار فلمانے کا حق دے سکتے ہیں جس کا تصور زندگی فیض سے مختلف بلکہ متضاد ہو۔ خود ترقی پسند تحریک نے اپنی تمام جدوجہد میں اس شعار کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے نزدیک وہ تمام قومی اور ادبی تحریکیں جن کی اساس ان کے نظریہ پر نہ ہو یا ان کا مزاج اشتراکی نظریے سے مختلف ہو، نا قابل اعتنا ہیں۔ اسی طرح وہ تمام افراد جو ان کے نظریہ و تصور سے متفق نہیں ان کے نزدیک رجعتی ہیں۔ ایک ایسا شخص جو ان کے افکار و اعمال اور تحریک و تنظیم کا نکتہ چین ہو، اس کا ان سے محفوظ رہنا، تاریخی شواہد کے خلاف ہے۔

کوئی شاعر، ادیب، نقاد یا معلم جس کا تعلق فیض کے مدرسہ فکر سے ہے، کبھی اقبال کے بنیادی تصورات کی ہمنوائی نہیں کرے گا۔ اس طرح اس کی اپنی عمارت گر جاتی ہے۔ خود فیض نے چند مضامین نثر میں لکھے ہیں۔ میزان کے نام سے یہ مجموعہ چھپ چکا ہے۔ ان میں ایک آدھ مضمون اقبال پر ہے۔ اسی مضمون سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کے تصورات سے انہیں کہاں تک اخلاص ہے۔ سردار جعفری بھارت میں ترقی پسندوں کے سرخیل ہیں۔ ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے متعلق بظاہر دلفریب لیکن اساسا منفی تنقید کی ہے۔ مجنوں گورکھپوری ان سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ ان کی نظر میں اقبال کا سب سے بڑا جرم اسلام پر ان کا عقیدہ ہے۔ اقبال جن تصورات کو بالا کرتے ہیں، ان کے نزدیک وہ قدامت اور رجعت کی علامتیں ہیں۔ ان کے نزدیک اقبال کی حیثیت ایک شاعر کی ہے۔ ان کے فکر و نظر سے انہیں کوئی سروکار نہیں اور نہ وہ شاعر سے زیادہ انہیں کوئی درجہ دیتے ہیں۔

اقبال اپنے اشعار و افکار میں جس نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ مثلاً:۔ خودی کا نظریہ یا مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ تو ترقی پسندوں کا ذہن اس سے ابا کرتا ہے لیکن اس کے اظہار سے ہچکچاتے ہیں۔ چونکہ اقبال کو

نظر انداز کرنا ان کے لئے مشکل ہے، لہذا اقبال کے نام پر اپنی مرضی کا شکار کھیلتے ہیں۔ اقبال کے شاعرانہ اعجاز کی تائید اور ان کے نظریاتی افکار کی تردید ان کا گھتا ہوا موضوع ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے ان کی کوشش ہے کہ اقبال کا ذکر ایک شاعر کی حیثیت سے کریں اور سارا زور اس پر دیں کہ اقبال نے شاعری کو ایک روایت، ایک لہجہ اور ایک مزاج دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرز بیان سے تغلیط کا وہ پہلو عوام پر مخفی رہتا ہے جس کی حقیقی ماہیت اقبال کے فکری محرکات کی اہانت یا استخفاف ہے اور یہی ان کے طرز تنقید کا شیوۂ خاص ہے۔

انکی ادبی تحریک کا انحصار ہی کمیونزم پر ہے۔ پاکستان بنا تو اس تحریک کے اجتماعی ذہن کو احساس تھا کہ اقبال ان کے ادبی محاذ کی راہ میں سب سے بڑی روک ہیں اور ان کی فکر سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اقبال پر چھا جانا چاہا۔ اب چونکہ خود بے بضاعت تھے لہذا اقبال کی فکر میں نقب لگانے کا ایک نیا ہتھکنڈا ایجاد کیا۔ اور وہ ان کی سیاسی سیرت کے عین مطابق تھا۔ ہمارے ان دوستوں کی روایت ہے کہ جب کسی ملک میں اقتدار سے محروم ہوتے یا مختلف محاذوں پر معنوی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں تو جن عقائد کی رسوائی و پسپائی مقصود ہوتی ہے ان کی داعی شخصیتوں کے دامن میں پناہ لے کر اپنی شخصیت کو قائم رکھتے اور بہ لطائف الحیل ان کی دعوت کو رد کرتے ہیں۔ لینن کی ہدایت کے مطابق ان کا ایک ہی اصول ہے کہ پارٹی طاقت ور ہو تو اپنی اصطلاحات اور اپنے نظریات کو ذہنوں میں راسخ ہی نہیں، نافذ کرو۔ پارٹی کمزور ہو تو ارکان کو لازم ہے عوام کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں۔ ان کے قومی تفاخر کا ثقافتی پیرایا میں ذکر کرتے رہیں اور جس ملک میں رہ رہے ہیں اس کی سیاسی زندگی کو اپنے ہاتھ میں رکھنے اور اپنے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے اس قسم کا طرز عمل اختیار کریں جس سے عوام میں یہ احساس پھیلتا رہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو ان کی محبوب اشیاء اور ان کے محبوب افراد کی اعلیٰ قدروں کے پشتیبان ہیں۔

اقبال اور فیض دو مختلف نظریے ہیں۔ ان میں عقیدہ و خیال کی یک رنگی کا تصور ہی عبث ہے۔ خرابی ان لوگوں کے انتخاب یا ذوق کی ہے جو فکر و نظر کے مسئلہ میں ان دونوں کے لئے ایک سی ترازو رکھتے ہیں۔ ان معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

☆ اقبال پاکستان میں ایک فکری تحریک کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس کی اساس اسلام پر ہے۔

☆ کمیونسٹوں کا ادبی محاذ محسوس کرتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں ''اپنی کمزور رجمنٹ'' کے نظریاتی ہتھیاروں سے اقبال کو شکست دینا مشکل ہے۔ وہ اپنے دفاع کے لئے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے عقائد کی تغلیط کے لئے ان پر نظریات کے تضاد کے الزام دھرتے ہیں اور

اس طرح ان کے سوانح کو ان کے افکار سے جدا کرتے ہیں۔

☆ کمیونسٹوں کا یہ طرزِ عمل اپنے وجود کو مسلمانوں کے معاشرے میں اجالنے اور اچھالنے کا ایک حربہ ہے۔

☆ اس غرض سے انہوں نے نشر و اشاعت کے ان تمام ذرائع کو اپنے تصرف میں لے رکھا ہے جو اپنے قبائح کی بنا پر اسلام کے تصوراتی معاشرہ سے خوفزدہ ہیں۔ لیکن کمیونسٹوں کے سیاسی محرکات کو ان سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔ فیض اپنے تصورات سے مختلف اقبال کی تصویر بناتے تو اس پر تعجب ہوتا۔ اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے کہ انہوں نے اقبال کی تصویر اپنے تصور سے کھینچی ہے۔ فیض نے وہی کیا ہے جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ ہم اقبال کو دانشوروں کے اس نرغہ سے کیونکر بچا سکتے ہیں؟

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۷)

سوال کیا جا سکتا ہے

(۱) اقبال کے نام پر جو لوگ سرکاری خزانہ سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ان کا علمی حدود اربعہ کیا ہے؟ انہوں نے اقبال کے متعلق کیا لکھا؟ وہ کہاں تک درست ہے؟ فی الجملہ ان تحریروں کا ادبی و فکری اور تاریخی و لسانی مقام کیا ہے؟

(۲) اقبال کے نزدیک ہر وہ چیز جو ناروا تھی، ''اقبالین'' نے روا کر لی ہے۔ اس کا جواز کیا ہے؟ مثلاً یوم اقبال بزرگانِ چشت کے سالانہ اعراس کی طرز کا اک میلہ ہو گیا ہے کہ ہر سال مشاعرہ، قوالی اور طعام کا انتظام کیا جاتا ہے۔

(۳) وہ لوگ جو اقبال کے ''دوست'' بن رہے ہیں ان میں کتنے لوگ تھے؟ جو اقبال کے فکری ہم سفر رہے۔ کتنوں نے ان کا قرب و اعتماد حاصل کیا اور کتنے ہیں جو اقبال کی بنیادی روح کو سمجھتے ہیں؟

(۴) اقبال کے متعلق اس وقت تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں کتنی ثقہ ہیں، کتنی غیر ثقہ؟ اور کتنی ایسی ہیں جن میں رطب و یابس بھرا ہوا ہے؟

(۵) کیا یہ واقعہ نہیں کہ بزمِ اقبال اور اقبال اکیڈمی کی بیشتر مجلدات سرکاری امداد کو دوستوں کی نذر گزارنے کا ایک لطیفہ غیبی ہیں اور ہم ان کتابوں کو کسی لحاظ سے بھی وقیع قرار نہیں دے سکتے؟

(۶) کیا یہ صحیح ہے کہ جن لوگوں نے اپنے آپکو اقبال کا شارح یا مفسر قرار دے رکھا ہے، وہ کلامِ اقبال کے بیشتر حصے بلکہ ننانوے فی صد کو بزعم خویش منسوخ کر چکے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے بصیرت افروز مقالہ بہ عنوان ''اقبال کا منسوخ کلام'' کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے؟

(۷) کسی شخص کو خواہ وہ کسی درجہ پر فائز ہو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ تعلیماتِ اقبال کو اپنے تصورات کا رنگ دے اور اس طرح محرف کر کے اپنے لئے روزی پیدا کرے جیسا کہ خلیفہ عبدالحکیم نے ''ملا و اقبال'' میں کیا اور اقبال اکیڈمی کراچی کے بعض دوسری کتابیں اس پر شاہد ہیں؟

(۸) اقبال نے جو پیغام دیا، اس کے متعلق اب تک کیا تحقیق ہوئی ہے۔ اقبال کے نام پر رقمیں کھانے والے اور گراں قدر مشاہروں سے مستفید ہونیوالے اس باب میں کیا کر رہے ہیں؟

(۹) اقبال اکیڈمی اور بزم اقبال اپنے اہتمام میں شائع شدہ کوئی کتاب پیش کر سکتے ہیں جس کو ''روح اقبال'' اور ''اقبال کامل'' کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ اس کا اعتراف بزم اقبال لاہور کی ایک کتاب ''شعر اقبال'' میں خود سید عابد علی عابد نے پیش کیا ہے لیکن خود جو کچھ لکھا ہے وہ اغلاط کا ایک طلسم ہوشربا ہے۔

(۱۰) اقبال اکیڈمی کراچی نے عطیہ کے خطوط، اقبال کی سیاست ملی اور اقبال اور حیدر آباد دکن کے نام سے جو کتابیں طبع کروائی ہیں، وہ کسی اعتبار سے بھی معیاری نہیں۔ اقبال اور حیدر آباد یا عطیہ کے خطوط تو کسی بھی افادی نوعیت کے نہیں، بلکہ ان کے مندرجات سے اقبال کی فکری عظمت آشکار ہی نہیں ہوتی بلکہ اسکو صدمہ پہنچتا ہے۔

(۱۱) کسی مؤلف یا مرتب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اقبال کے نظریات کے معاملہ میں اپنی صوابدید پر حسن و قبح کا معیار قائم کرے۔

(۱۲) پاکستان میں ''دانشوران اقبال'' (وہ لوگ جنہیں اس نام پر اصرار ہے) کا یہ رویہ سخت قابل اعتراض ہے کہ وہ کلام اقبال کے اس حصہ کو تو عام کریں جو ان کے مقاصد، ذوق اور مصالح کی اعانت کرتا ہو اور ان حصص کو گلدستہ طاق نسیاں بنانے میں ساعی ہوں جو ان کے افکار و نظریات کا صحیح عکس پیش نہ کرتے ہوں۔ اس مہم و تحریک کے نقیب و پشتیبان، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ریڈیو کے بزرجمہر یا پھر اقبال اکیڈمی کراچی کے دانشوران بے بصر ہیں۔ اسی گروہ میں دوسرے درجہ کے وہ اہل قلم بھی ہیں جو اقبال کے نام پر اپنی شخصیتوں کو بالا کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔

(۱۳) ہم پورے وثوق کے ساتھ ان کتابوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو اقبال کے نام پر اقبال کی تنقیص کرتی ہیں۔ لیکن ان کے مصنفین نے اقبالیات پر اپنی ذات پر ایک مستند استاد کی چھاپ لگا رکھی ہے، حالانکہ اقبال کے بارے میں ان کا طول و عرض یہ ہے شاید اقبال کی حقیقی فکر کے مبادیات سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔

(۱۴) اقبال کے اشعار کی شرح اگر ان کے اپنے قلم سے نکلی ہے تو وہ صحیح ہے؟ یا وہ شرح کہ جو بعض اقبالین کر رہے ہیں اور جس کا مطلب اخفائے حق و کتمان شہادت ہے۔

(۱۵) کیا وجہ ہے کہ اقبال نے جن اہم قومی و دینی مسائل پر روشنی ڈالی اور بعض امور میں قطعی رائے قائم کی، ان کو صرف نظر کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ بلکہ گم شدہ چیز بنا دیا گیا ہے اور جن مسلکوں، نظریوں یا رویوں میں ان کا نقطہ نگاہ اضافی رہا، وہ بنیادی حیثیت سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً اقبال نے اپنے محض شاعر ہونے سے بار بار انکار کیا۔ لیکن یار لوگ انہیں محض شاعر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی قرار دی جا رہی ہے۔

(۱۶) عمر کے آخری دور میں قادیانیت کے متعلق اقبال نے واضح اور قطعی نقطہ نگاہ پیش کیا، لیکن اس معاملہ کی جتنی تحریریں، جتنے خطوط، جتنے اشعار اور جتنے بیانات ہیں انہیں ایک خاص ذہنی سازش کے تحت محو کیا جا رہا ہے اور جو لوگ اقبال و حیدر آباد کی بے معنی کتابیں اور عطیہ کے خطوط جیسی ناپختہ دور کی تالیفات مرتب کراتے ہیں، وہ اقبال کے ان قطعی نظریات اور حتمی تصورات پر مطلقاً توجہ نہیں دے رہے، بلکہ اس سرمایہ کو غیب کرنے میں بد دیانت ثابت ہوئے ہیں۔ اس اخلاقی اور فکری بد دیانتی کا ان کے پاس جواز کیا ہے؟ جو لوگ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور علامہ اقبالؒ کے ایک ''عارضی تصادم'' کو مسلسل ہوا دیئے جا رہے ہیں اور اس بارے میں غور نہیں کرتے کہ خود حضرت علامہ نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا تھا، وہ ختم نبوت کے سرقہ پر علامہ اقبال کے تصورات کو فی الجملہ ختم کر رہے ہیں، بلکہ بزعم خویش ختم کر چکے ہیں۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ علامہ اقبال احرار کے جھانسے میں آ گئے، یہ ایک ایسا الزام ہے جس سے علامہ اقبال کی ساری فکر پر مختلف گوشہ ہائے خیال کی طرف سے آنچ آ سکتی ہے۔

آخر اقبال کے نام پر اس دھاندلی کے تدارک کی صورت کیا ہے؟

کیا اقبال کے احباب انگریزی حکومت کے نمک پروردہ تھے یا کچھ اور لوگ بھی تھے، جن کا وجود تحریک استخلاص و حریت میں راہنما تھا، ان کا تذکرہ کہاں ہے؟

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۷)

اقبال اور تہذیب مغرب

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی نظر میں

اقبال کے نام پر مختلف بزرجمہروں کے ادارے سرکاری خزانے سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں لیکن اس روپے کا مصرف جس انداز میں ہو رہا ہے ایک پر اسرار المیہ ہے۔ کراچی میں اقبال اکیڈمی اور لاہور میں بزمِ اقبال نے اقبال پر جو کتابیں شائع کی ہیں۔ قطع نظر کہ سرپرستوں نے اپنے دست آموزوں کو فراخدلی سے نوازا ہے۔ ان میں فکرِ اقبال، شعرِ اقبال، ذکرِ اقبال اور سوانحِ اقبال کے نام سے جو کچھ درج ہے وہ یہاں تک افسوسناک ہے کہ اقبال اس سے ابھرتے نہیں بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی عمارت گرائی جا رہی ہے۔ ذیل کے اقتباسات بزمِ اقبال لاہور کی ''فربہ کتاب'' فکرِ اقبال مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے نقل کیے گئے ہیں۔

اقبال کے افکار کا ایک ثلث مغربی افکار و استیلاء کے خلاف احتجاج پر مشتمل ہے۔ خود حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ تقلیدِ مغرب نہیں تنقیدِ مغرب میں ہے۔ لیکن فکرِ اقبال کے مولف کیا فرماتے ہیں اس اقتباس سے ظاہر و باہر ہے۔

''اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے اور یہ مخالفت اس کی رگ و پے میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ اثر ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر و باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان، تصوف اور ذوق و شوق کے اشعار کہتے کہتے یونہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بالِ جبرئیل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں۔ اکثر اشعار میں حکمت اور عشق کی دل کش آمیزش ہے لیکن اچھے شعر کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں، اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ عیوب سے لبریز ہی سہی لیکن اس کا ذکر نہ ہی کیا جاتا تو اچھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفا آبِ رواں کا لب جو بیٹھے لطف اٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بیک ایک مردہ جانور کی لاش تیرتی ہوئی سامنے آگئی۔ اگر کہیں ملا کو برا کہتا ہے جو تہذیبِ فرنگ کی طرح اقبال کے طعن و

طنز کے تیروں کا ایک مستقل ہدف ہے تو اس کے ساتھ ہی فرنگ کو بھی لپیٹ لیتا ہے۔ حالانکہ غزل کے باقی اشعار نہایت حکیمانہ اور عارفانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً غزل کا مطلع ہے ۔

اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی

ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

باقی اشعار بھی اسی طرح کے بلند پایہ ہیں۔ لیکن چلتے چلتے ایک یہ شعر بھی فرما دیا جس میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھی متہم کیا ہے۔ ۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

مگر افرنگ میں جو ظاہری پاکیزگی اور حسن و جمال ہے اقبال اس کا منکر نہیں۔ تمدنِ فرنگ کے اس پہلو کو جو اس کو ایشیا کی زندگی سے ممتاز کرتا ہے۔ اقبال بھی قابلِ رشک سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ مشرق میں بھی جنت ارضی کے نمونے نظر آئیں ۔

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

اسی غزل کے ایک شعر میں پھر تہذیبِ جدید اور ملائیت پر ایک تازیانہ رسید کیا ہے ۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

نے ابلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

افغانستان کے سفر میں حکیم سنائی غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی اور اس عارف و حکیم کے پرتو فیض سے بہت اچھے اشعار اقبال کی زبان سے نکلے ہیں۔ مشرق کی جھوٹی روحانیت سے بیزاری ظاہر کی ہے لیکن فرنگ کو یہاں بھی نہیں بھولے ۔

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے

گلیم بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا؟

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق اور مغرب کے میخانے

یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

پھر ایک شعر میں تہذیب حاضر کے متعلق وہ شعر کہتے ہیں جسے انہوں نے اور جگہوں پر بھی دہرایا

ہے کہ تہذیب حاضر نے بہت سے جھوٹے معبودوں کا خاتمہ کیا ہے۔ نفی کا یہ پہلو ضروری تھا لیکن اس کے بعد اثبات حقیقت کی طرف اس کا قدم نہیں اٹھ سکا۔ اس لیے اس کی فطرت میں ایک واویلا پیدا ہو رہا ہے ۔

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ الا
دبا رکھا ہے اس کو شیشہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اور کئی غزلوں میں بھی یہی کیفیت ہے کہ بات کچھ بھی ہو رہی ہو لیکن ضرب لگانے کے لیے فرنگ کا ذکر کرنا لازمی ہے ۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

یہ غزل کس قدر عرفانی اور لامکانی ہے جس کے شروع کے دو اشعار یہ ہیں ۔

تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر
جس کا عمل ہے بے غرض، اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

ایسی اونچی باتیں کہتے ہوئے پھر یک بیک فرنگ کی طرف پلٹتے ہیں ۔

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر

بالِ جبریل میں ساتویں غزل ایسی ہے جس سے روح وجد کرنے لگتی ہے۔ نصف غزل میں بڑے موثر انداز میں اپنے من میں غوطہ لگانے کی تلقین کی ہے جو تمام اسرار الٰہیہ کا خزینہ ہے۔ من اور تن کے مقابلے کے یہ اشعار اقبال کے شہ کاروں میں سے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن
من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق

تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا، مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن، جاتا ہے دھن

مقطع میں خودی کی ایسی تلقین ہے جو دل میں گھر کر جاتی ہے ۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

افرنگی کا راج کچھ ختم ہو گیا اور باقی جاں بلب ہے۔ آئندہ نسلوں کے لیے افرنگی راج تاریخ کا ایک قصہ پارینہ رہ جائیگا۔ اس زمانے میں اس شعر سے کون لطف اٹھائے گا۔ پچاس یا سو سال کے بعد غالباً اس وجد آور غزل کو گانے والے اس شعر کو ساقط کر دیں گے لیکن غلبہ افرنگ نے بے چارے اقبال کو اس قدر بیزار کر رکھا ہے کہ وہ ایسی غزل میں بھی اس کے ذکر سے باز نہیں آ سکتا۔''

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء)

علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس کا [illegible] خلیفہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ خلیفہ صاحب کے قلم کی لغزیدہ پائی کیا گل کتر گئی ہے۔ "ایک محمدی کیفیت ان میں یہ بھی تھی کہ وہ (شیخ نور محمد) نبی امی کی طرح نوشت و خواند کے معاملہ میں امی تھے ...."

پہ بے خبر، مقام محمد عربی است

پاکستان۔ اقبال کی فکری کاوش کا نام ہے

قائداعظم علامہ اقبال اور اصفہانی

محترمی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں ایک لمبی تحریک، جس نے حال ہی میں خاص زور پکڑا ہے، موجود ہے، جس کا مقصد قائداعظمؒ کی خدمات اور مادرِ وطن کی تشکیل کیلئے ان کے اہم اور فیصلہ کن کردار کی اہمیت کو گھٹانا ہے اس پہلو سے ہر پاکستانی کو عموماً اور ان لوگوں کو خصوصاً دکھ ہوتا ہے جنہوں نے تحریک قیام پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔

مجھے اپنے قومی فلاسفر شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کو جاننے کا شرف حاصل ہے اگرچہ میرے تعلقات ان سے اتنے زیادہ گہرے نہیں تھے مجھے جون ۱۹۳۶ میں آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں ان سے اہم مذاکرات میں شرکت کا بھی موقع ملا اگرچہ وہ ان دنوں میں بیمار تھے لیکن انہوں نے ہمیں اپنے مشوروں سے مستفید فرمایا۔ اس وقت سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کے قطعی دن تک جب پاکستان معرض وجود میں آیا۔ میں مسلم لیگ کے عروج وزوال سے قریبی طور پر وابستہ نہ رہا ہوں۔

متعلقہ تاریخی حقائق کو مختصر دہراتے ہوئے اگر کوئی بھی شخص سید جمال الدین افغانیؒ (پیدائش ۱۸۳۸ء، وفات ۱۸۹۷ء) کو نظر انداز نہیں کرسکتا جو ایسی شخصیت تھے جنہوں نے دنیائے اسلام کے اتحاد استحکام کے نظریہ کو فروغ دیا اور کہا کہ ایک مسلم مملکت پر حملہ کو تمام اسلامی ممالک پر حملہ سمجھنا چاہیے انہوں نے ایک ایسی مسلم جمہوریہ قائم کرنے پر بھی زور دیا جو وسطی ایشیاء کی موجودہ اشتراکی جمہوریتوں افغانستان اور برصغیر کے شمال مغرب میں مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ہو۔ اس عظیم مسلمان مفکر و عالم کو یہ کریڈٹ حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اس تخیل کے بیج بوئے جو پاکستان کے قطعی تصور کی حیثیت میں ابھرا جمال الدین افغانیؒ کے بعد بعض دوسرے مسلمانوں نے بھی ان ہی خطوط پر سوچ وبچار کی۔ ۱۹۱۸ میں سٹاک ہالم میں سوشلسٹوں کی بین الاقوامی کانفرنس میں علی گڑھ کے دو بھائیوں عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری نے ہندوستان کو دو حصوں ''مسلم ہند'' اور ''ہندو ہند'' میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ۱۹۲۰ میں ایک شخص محمد عبدالقادر بلگرامی نے بدایوں کے اخبار ''ذوالقرنین'' میں مہاتما گاندھی کے نام ایک کھلا خط لکھا جس میں برصغیر کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کردینے کی تجویز پیش کی گئی اس سلسلہ میں انہوں نے اضلاع کی ایک فہرست

بھی دی جو مشرقی و مغربی پاکستان کی موجودہ سرحدوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ۱۹۲۳ء میں تقریباً ان ہی لائنوں پر ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے سردار گل خان نے فرنٹیر انکوائری کمیٹی کے روبرو ایسی ہی ایک سکیم کی تائید و حمایت کی۔

اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں کیمبرج کے ایک نوجوان گریجویٹ چوہدری رحمت علی کا نام آتا ہے جنہوں نے اس خطہ کے لیے پاکستان کا نام تجویز کیا۔ اور لندن میں گول میز کانفرنس کے اجلاسوں کے دوران علیحدہ مسلم مملکت کا نظریہ پیش کیا۔ لیکن اس وقت وہاں اس کرنسی کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ البتہ اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ڈاکٹر اقبال کے فکر، شاعری اور خطبات کا رخ اسی کی حمایت میں تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ مسلم مملکت کا نظریہ انکی تخلیق تھا۔ تاریخ کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ خیالات کتنے ہی اعلیٰ وارفع کیوں نہ ہوں خود اپنے طور پر نتائج کی طرف رہنمائی نہیں کرتے۔ سیاسی معاملات میں خصوصیت سے خیالات کو واضح اور مستحکم تصورات اور منصوبوں کی صورت میں لانا پڑتا ہے۔ جنہیں عملی جامہ پہنانے کیلئے مثبت اقدام کی ضرورت پڑتی ہے میں دریافت کرتا ہوں کہ وہ مخلص کون ہے جس نے فرزانوں کے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیا جو سب سے پہلے پوری قوم کو تصور پاکستان کے گرد لایا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے اسے تیار کیا۔ اور پھر انہیں اس کیلئے جدوجہد اور قربانیوں پر آمادہ کیا یہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ صرف محمد علی جناح تھا پاکستان کے تصور کو ایک قابل عمل سیاسی اور آئینی منصوبہ کی حیثیت سے پیش کرنے اور اسے کامیابی سے عملی جامہ پہنانے کی کاروائی کرنے کے جرات مندانہ اقدامات کا کریڈٹ صرف اور صرف محمد علی جناح کو جاتا ہے۔ کسی بڑی شخصیت کی یاد منانے کے لیے حقائق کو خلط ملط یا نظر انداز کرنا کوئی خدمت نہیں ہوتی، جن کامیابیوں یا کارناموں کا اس شخصیت سے عملاً کوئی واسطہ نہ ہو انہیں اس کے نام سے منسوب کرنا کوئی خوبی نہیں۔ ایک شاعر، مفکر، فلاسفر اسلام کے صحت مند و توانا پیغام کے ترجمان اور مسلمانوں کی جانشیں نسل کے محرک کے لحاظ سے ڈاکٹر علامہ اقبال کی عظمت ناقابل انکار و غیر متنازعہ حقیقت ہے لیکن سیاسی اقدام وجدوجہد کے میدان کے میدان میں خود انہوں نے بخوشی محمد علی جناح کی قیادت قبول کی جیسا کہ انہوں نے موخر الذکر کے نام اپنے خط میں لکھا آپ ہندوستان میں واحد مسلمان ہیں جس کی قیادت سے قوم یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اسے طوفان سے بچائے گا، جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان سے اٹھ رہا ہے ڈاکٹر اقبال کے ساتھ ایک ملاقات میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے بقول ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی قائداعظم کی قیادت پر اعتراض کیا۔ تو انہوں نے صاف کہ

دیا۔ ''مسٹر جناح واحد شخصیت ہیں جو مسلمانان ہند کی طرف سے ہر قسم کی کاروائی کے مجاز ہیں۔ اور میں ان کا محض ایک سپاہی ہوں'' ڈاکٹر اقبال کے دل میں قائداعظم کے لیے احترام و عزت کے جو احساسات پائے جاتے تھے ان کا اظہار اس مراسلے سے بھی ہوتا ہے جو نیروبی (مشرق افریقہ) کے مسلمانوں کی انجمن کی طرف سے پیغام مبارکباد کے جواب میں لکھا۔ اس میں انہوں نے کہا۔ ''میں آپکو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا کام مکمل کر لیا ہے مجھے اب طویل عرصہ تک زندہ رہنے کی اب کوئی خواہش نہیں ہے۔ لیکن ایک انسان جس کی خدمات کی ضرورت دنیائے اسلام کو عموماً اور مسلمانان ہند کو خصوصاً ہے وہ ہے مسٹر جناح۔ میں اس امر کو پسند کروں گا کہ آپ ان کی درازی عمر کیلئے دعا کریں۔

اقبال اور جناح دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اور دوست تھے جو ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے طریق سے قومی نصب العین کی خدمت کی قوم ان دونوں کی ہمیشہ متشکر و ممنون احسان ہے اور دونوں کی عظمت کی قائل ہے قائداعظم نے علامہ اقبال کی جو شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ میں اسے یہاں دہراتا ہوں ''وہ میرے ذاتی دوست تھے اور دنیا میں بہترین شاعری کے خالق۔ وہ اس وقت یک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ رہے گا۔ ان کی عظیم شاعری مسلمانان ہند کی تمناؤں کی ترجمان ہے جو ہمیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو ہمیشہ متحرک کرتی رہے گی۔ آپ کا ایم اے ایچ اصفہانی کراچی

پاکستان ٹائمز ۲ مئی کے شمارے میں جناب ایم ایچ اصفہانی کراچی کا مکتوب بالا شائع ہوا ہے ی اس کا ترجمہ ہے ہم اس ضمن میں بین السطور کے معانی و مقاصد پر حق تبصرہ محفوظ رکھتے ہیں۔ البتہ یہ امر خاص طور پر نشاندہی کا مستحق ہے کہ بعض افراد جن کا خمیر خاص آب و گل سے تیار ہوا ہے۔ ایک عرصہ سے علامہ اقبال کے متعلق چیں بجبیں ہو رہے ہیں۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مفکر کی عظمت کا ذکر کرنے سے ایک سیاست دان کی توقیر میں کس طرح کمی ہو جاتی ہے کیا عید الفطر منانے سے عید الضحیٰ کی اہمیت گھٹ جاتی ہے۔ قائداعظم۔۔ قائداعظم تھے اور علامہ اقبال علامہ اقبال۔ ایک کے فکری اور دوسری کے سیاسی مقام کو تاریخ کا کوئی غیبی ہاتھ بھی ان سے چھین نہیں سکتا۔ اصفہانی صاحب نے جو کچھ لکھا وہ ایک خاص ذہنیت کا عکس ہے۔ جانے اصفہانی صاحب نے یہ کیسے باور کیا یا اخذ کیا کہ یوم اقبال کی تقریبات یا اقبال کے علم و نظریہ قومی اجتماعات سے قائداعظم ''پس منظر'' میں چلے جاتے ہیں۔ جس سے ہر پاکستانی کو عموماً اور ان لوگوں کو خصوصاً دکھ ہوتا ہے۔ جنہوں نے تحریک قیام پاکستان میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دکھ کی بات بھی خوب رہی۔ یہ کسی صوت کا معاملہ ہے یا کوئی عمارت ڈھائی جا رہی ہے ہمارے

نزدیک یہی وہ ذہن ہے جس کی بدولت اب تک تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب نہیں ہو رہی اور جو کچھ مرتب ہوا ہے وہ زیادہ تر اخباری تراشوں کے یکطرفہ افکار و اخبار کی حسب منشا ہے۔ اس ضمن میں وہ لوگ بھی آ جاتے ہیں جو بے سر و پا حکائتیں وضع کر کے گل کھلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی بھی انہی لوگوں میں پیش پیش ہیں اور ہم ان کی قلمکاریوں یا تاریخ سازیوں کو ثقہ نہیں سمجھتے۔

کیا اصفہانی صاحب نے پاکستان کے نظری محرک یا فکری مصور کی حیثیت سے بعض دوسرے غیر معروف لوگوں کا نام لکھ کر یہ ثابت نہیں کیا کہ وہ اقبال کو گھٹانا چاہتے اور اس دستار فضیلت کو دوسروں کے سر باندھنا چاہتے ہیں۔ انہیں اقبال اور ان لوگوں کے مراتب کا فرق لازماً معلوم ہوگا۔ پھر ہم لوگ کیا نتیجہ اخذ کریں۔

بات مختصر ہے کہ اقبال جن کی آواز میں تحریک بن جانے کا جادو تھا، پہلے راہنما تھے جنہوں نے اسلامی ریاست کے نظریے کو مسلمانوں کی آواز بنا کر پیش کیا اور ان کے فکری خطوط ایک تحریک، ایک جماعت اور ایک نصب العین ہو گئے۔

قائداعظم نے پاکستان کے نصب العین کو باقاعدہ اختیار کیا تو علامہ اقبال دو، سوا دو سال پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ تحریک پاکستان کا عملی نقشہ ان کے بعد بنا۔ قائداعظم نے بلاشبہ اقبال کے اس فکری سفر اور عامۃ الناس کی بے پناہ طاقت کو منزل مقصود سے قریب تر کیا۔ قائداعظم نے منزل حاصل کی تو اسکی وجہ مسلمان عوام کی طاقت تھی جو ان کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ اصفہانی صاحب سے یہاں ایک اور سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ فرانس کا انقلاب، جس نے یورپ کی کایا پلٹ دی اس کا اصل ذکر والٹیر اور روسو سے ہوتا ہے۔ وہ اس انقلاب کے عملی راہنما نہ تھے لیکن انہی کے رشحات فکر نے اس انقلاب کی نیو رکھی تھی۔ انقلاب کے راہنماؤں سے زیادہ آج ان کا نام گونج رہا ہے بلکہ انہی کا نام سرفہرست ہے۔

نپولین کہا کرتا تھا! انقلاب فرانس کچھ نہ تھا مگر روسو۔ ایک اور موقعہ پر اس نے کہا تھا! روسو ہی انقلاب کا باپ تھا۔ اس نے صرف فرانس ہی نہیں بلکہ اپنے پورے عہد کی عقلی و اجتماعی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔

ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں پاکستان کچھ نہ تھا مگر اقبال۔ ہندوستان میں علیحدہ قومیت کا اثباتی تصور صرف اس کی بدولت مسلمانوں کے ذہنوں میں نمایاں ہوا۔ اس نے صرف ہندوستانی مسلمانوں ہی میں نہیں، بلکہ اس پورے عہد کی عقلی و اجتماعی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اور ایشیا کی نشاۃ ثانیہ کا سنگ میل رکھا ہے والٹیر اور اس کی روح کو سمجھ لینا اٹھارہویں صدی کی روح کو سمجھ لینا ہے۔ اٹلی ایک بڑی تہذیب کا

منبع تھا۔ جرمنی سے اصلاح دین کا سرچشمہ پھوٹا۔ لیکن فرانس؟ تو فرانس والٹیر تھا۔ والٹیر ایک پوری قوم ہے انقلاب عظیم کی دعوت نہیں بلکہ سرتاپا انقلاب۔

اصفہانی صاحب غور فرمائیں۔ تو انہیں بھی محسوس ہوگا۔ اقبال اور اس کی روح کو سمجھ لینا بیسویں صدی کی روح کو سمجھ لینا ہے۔ ایران ایک روائتی تہذیب کا منبع تھا۔ عرب اسلام کا سرچشمہ۔ لیکن اسلامی ہندوستان تو وہ اقبال اور صرف اقبال تھا۔ اقبال ایک پوری قوم ہے۔ انقلاب عظیم کی دعوت، بلکہ سرتاپا انقلاب ہے۔

گفتند جہاں ما آیا نہ تو می سازد
گفتم نمی سازد گفتند کہ بر ہم زن

اور یہ بات اصفہانی صاحب کے فکر و نظر پر فی الحال آشکار نہیں ہوئی ہے

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۵ مئی ۱۹۶۷ء)

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ کی تصریحات

''اکثر انسانوں کو کنج تنہائی میں بیٹھ کر ہمہ دانی کا دھوکا ہو جاتا ہے''

(اقبال نامہ صفحہ ۱۱)

''مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے''

(اقبال نامہ صفحہ ۱۶۹ سید سلیمان ندوی کے نام)

''زندگی اس طرح بسر کرو گویا یہ لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے''

(ملفوظات صفحہ ۱۷۴)

علامہ اقبال کے نام پر بعض علیل روحوں نے ملا کو گالی دینے کی جو صنعت اختراع کی ہے وہ اب قرآن و سنت کے خلاف ایک تحریک بنتی جا رہی ہے۔ اس تحریک کا خطرناک پہلو یہ ہے۔ کہ علامہ اقبال کے نام پر جو لوگ اپنے افکار کو پیش کر رہے یا اپنی ذات کی نمائش میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کلام اقبال کو اپنے حملہ ترکانہ کا خنجر بنا لیا ہے۔ اقبال نے جو کچھ کہا، جس مقام سے کہا اور جن لوگوں کے لئے کہا اس کو طاق نسیاں پہ رکھ دیا ہے۔ اور خود یہ لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کو افکار اقبال کے نام پر اس خیرہ چشمی سے پیش کر رہے ہیں کہ بقول غالب ''خامہ انگشت بدنداں'' اور ''ناطقہ سر بگریباں'' ہو کر رہ گیا ہے۔

ہم اپنے اس دعویٰ میں حق بجانب ہیں کہ اس وقت جو لوگ ''اقبال فروشی'' کا فرض ادا کر رہے ہیں وہ کبھی اقبال سے قریب نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اقبال کی فکر تو ایک طرف رہی اس کی چوکھٹ سے بھی قریب نہیں تھے۔ اقبال نے ان لوگوں میں سے اکثر افراد کو کبھی شرف ملاقات نہیں بخشا، ایک آدھ دفعہ حاشیہ کے طور پر چلے گئے ہوں تو الگ بات ہے۔ کئی ایک حیدر آباد میں حصول ملازمت کے خواہاں تھے مہاراجہ کرشن پرشاد کے نام سفارشی خط لینے حاضر ہوئے۔ علامہ کی موت کے بعد ان کے معتقد بن گئے۔ علامہ نے انہیں کبھی دو سطریں بھی نہیں لکھیں۔ بعض اپنے والدین کی بدولت اقبال کی معرفت حاصل کرنے کے دعویدار ہیں، اکثر صرف اس خدمت پر مامور تھے کہ علامہ اقبال کی ذہنی سرگزشت حکومت کے کانوں تک پہنچایا کریں، اس وقت جو لوگ بفضل تعالیٰ زندہ ہیں ان میں اقبال کے بارے میں سوانحی گفتگو کرنے کا حق سید نذیر نیازی کو ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کو ہے۔ ڈاکٹر سید محمد

عبداللہ کو ہے۔ میاں امیر الدین کو ہے۔ مولانا غلام مرشد کو ہے۔ خود جاوید اقبال کو ہے۔ لیکن ان کی جگہ کون لے رہا ہے۔ وہ لوگ جن کے دماغ، افکار اقبال کے معاملہ میں سپاٹ میدان ہیں اور جو پیچ و تاب رازی اور سوز و ساز رومی کی اس عصری شخصیت ۔۔۔۔۔۔۔۔ کے دروازے پر انگریزوں کی مخبری کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے الحاد کو پروان چڑھانے کے لئے اقبال و ملا کے عنوان سے لگاتار ژاژ خائی شروع کر رکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنے کلام میں ملا کو نقد و نظر کی سان پر کھینچا ہے لیکن ملا سے ان کی مراد علمائے سوء ہیں، علمائے حق نہیں۔ وہ اس ملا کو ہدف تنقید بناتے ہیں جس نے توحید و رسالت کی روح سے بغاوت کر رکھی ہے۔ ان کا نشانہ دین حقہ یا شریعت اسلامیہ نہیں۔ اس باب میں وہ علماء سے بھی زیادہ متشدد ہیں۔ بلکہ دانشمندان بے دین کی اصطلاح میں اجڈ مسلمان، آخری حد تک قدامت پسند، اس مضمون کی سرخیوں ہی سے اندازہ کر لیں، یہ الفاظ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے خطوط اور ملفوظات سے نقل کئے گئے ہیں کہ ان دانشوروں کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا تھا۔ ملا پر تو اقبال نے زیادہ سے زیادہ اپنے کلام کے قلیل حصہ میں تنقید کی ہے۔ کہ وہ اسلام کا خدمت گزار نہیں رہا۔ اس میں روح بلالی نہیں جھلکتی اور اس کا فقر ابوذر " کی غیرت و جرات سے ہٹا ہوا ہے۔ لیکن جس طبقہ نے اقبال کے نام پر دین کا استخفاف اپنی جبلت میں داخل کر لیا ہے۔ اور جو اپنے عقربی شیوہ کو ملا دشنام کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ اس کے متعلق اقبال نے تنقید نہیں کی بلکہ سورۃ ابولہب کا انداز اختیار کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ گروہ ابولہب کے دست و بازو ہیں، جو ٹوٹ گئے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے اقبال نے ان کے بارے میں کیا کہا ہے؟ ملا کے متعلق ایسی کوئی تنقید بھی پورے کلام میں نہیں ہے۔

اگر ایں آب و جاہ از فرنگ است
جبیں خود منہ جز بر در او
سریں را ہم بہ چوبش دہ کہ آخر
حقے دارد بہ خر پالاں گر او

اگر یہ آب (علم) اور جاہ (طاقت) یورپ کی وجہ سے ہے۔ تو پھر اس کے دروازے کے سوا کسی اور کے آستانہ پر نہ جھک۔ اپنے چوتڑ اس کی چوب کے حوالے کر، کمہار کو گدھے کی مقعد میں ڈنڈا دینے کا حق ہوتا ہے۔۔۔۔ اس کی تشریح کے لئے "ضرب کلیم" دیکھیے۔ نزدیکان بے بصر کے اس گروہ سے مخاطب ہیں

ترا یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

کیا ملا کے متعلق کلام اقبال میں ایسا کوئی خفی مصرع بھی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اقبال کو مسجد و محراب کے ذہن سے خارج کرنے کی ایک سازش ہے۔ کہ اس طرح انکی لے کو سرد کر کے ختم کیا جا سکے یعنی ان کا کلام محراب و منبر پر نہ گونجے اور ان لوگوں کے عیش خانوں میں نگالی گفتار کا ذریعہ بن جائے۔

اقبال نے اس پست فطرت گروہ کو اپنے کلام میں جن الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس کی سرسری فہرست یہ ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ خانزادگان کبیر
۲۔ بتان وہم و گماں
۳۔ زناری برگساں
۴۔ نقش فرنگ
۵۔ نیام تہی
۶۔ وجود کس
۷۔ مرکب ایام
۸۔ [illegible]
۹۔ مور و مگس
۱۰۔ لب گور
۱۱۔ مفسد
۱۲۔ ارواح خبیثہ
۱۳۔ بیگانہ خودی
۱۴۔ داشتۂ فرنگ
۱۵۔ شکستہ بال
۱۶۔ بندگان معاش
۱۷۔ غیرت گردیں
۱۸۔ قمار باز
۱۹۔ مرد بیکار
۲۰۔ تہی آغوش زن
۲۱۔ رات کا شہباز
۲۲۔ ادراک فروش
۲۳۔ ابلیس زادے
۲۴۔ سوداگران مے و قمار
۲۵۔ تاجران زنان بازاری
۲۶۔ جان بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر
۲۷۔ کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
۲۸۔ مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس
۲۹۔ جوانان خاک باز
۳۰۔ ممولا
۳۱۔ کرگس
۳۲۔ شکم پرست
۳۳۔ پرکار و سخن ساز
۳۴۔ صید ظن و تخمین

۳۵۔ ذرّیت افرنگ

۳۶۔ نگاہش نقشبند کافری ہا

۳۷۔ کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

۳۸۔ بینائے غلط بین

۳۹۔ بے دین دانشمند

۴۰۔ فروتر از زاغ و خمہ

۴۱۔ غرا استعمار

۴۲۔ چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

۴۳۔ نہ معرفت، نہ محبت، نہ زندگی، نہ نگاہ

۴۴۔ زاغ دشتی

۴۵۔ جہل مرکب

۴۶۔ حشیش فروش

۴۷۔ شرح پیمبر سے بیزار

۴۸۔ شکار مردہ

۴۹۔ کوتاہ پرواز

کیا فرماتے ہیں افکار اقبال کے خوردہ گیر اس باب میں کہ ان کے خواص خمسہ اور عناصر اربعہ کی تیغ تصویر اس میں آ گئی ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۵ مئی ۱۹۶۷ء)

﴿شخصیت، سچائی، رعنائی اور اچھائی کا مجموعہ ہوتی ہے۔﴾

﴿مسجد قوت الاسلام کے جلال وقوت نے مجھے اتنا مرعوب کیا کہ اس میں نماز پڑھنے کا خیال مجھے ایک جسارت معلوم ہوا۔﴾

﴿اقوام کی زندگی میں قدیم وجدید ضروری عنصر ہیں۔﴾

﴿کنکریاں موتیوں کو گھورتی ہیں۔﴾

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے علامہ اقبالؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شعر جتنی دفعہ پڑھیں کوئی نہ کوئی نیا معنی ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گویا تخیل کا ایک ناپیدا کنار سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔۔۔۔ بالفاظ دیگر ایک اچھا شعر کھلا ہوا پھول اور کھلا ہوا نافہ ہے۔

نثر میں بھی علامہ اقبالؒ نے جو کہا خواہ مدراس کے خطبات ہوں، خواہ سیاسی خطبات، خواہ خطوط ہوں، خواہ عمومی بیانات ۔۔۔ جو نکتہ بھی قلم سے ادا ہو گیا انگوٹھی میں نگینہ ہے۔ قوس قزح کی طرح مربوط، خالی خولی انشاء پردازی نہیں۔ تصنع نہیں، مینا کاری نہیں۔ الفاظ اتنے سادہ کہ لغت کے سنگار سے بے نیاز، معانی اتنے گہرے کہ ہر تہ میں موتی چھپا ہوا ہے۔

ڈاکٹر سعید اللہ لکھتے ہیں۔

علامہ سے میں نے سوال کیا۔ حدیث ہے کہ دہر کو برا مت کہو دہر خدا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

فرمایا۔ برگساں نے مجھ سے یہ حدیث سنی تو اچھل پڑا۔

پوچھا۔ یہ کون کہتا ہے؟

میں نے کہا! ہمارے رسول ﷺ

دہر (Reality) کا لازمی جزو ہے وقت کو ہم (Eternal) مانتے ہیں مگر وہ گذر بھی رہا ہے۔ ان دونوں کو ملایا جائے تو جس چیز کو ہم (Now) کہتے ہیں وہ (Eternal Now) ہو جاتی ہے (Reality) دو معنوں میں لی جاسکتی ہے۔ ایک (Extensive) دوسرے (Intensive)۔ مثلاً ایک گیند اپنے محور کے گرد حرکت کرے اور ہر گردش میں اس کا رنگ بدل جائے۔ اس طرح وقت کو تصور کر سکتے

ہیں کہ وہ اپنے گرد چکر کاٹ رہا ہے رات اور دن کی تمیز ہم نے قائم کی ہے وقت اس تمیز سے پاک ہے۔ ہندو وقت کو مایا کہتے ہیں۔ وقت کا (Atomick) تصور بدھوں سے شروع ہوتا ہے۔ ایران میں یزدان اور اہرمن کا تصور روشنی (دن) اور تاریکی (رات) کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان دونوں کا اجتماع (Reality) ہے۔ قرآن پاک میں بار بار دن اور رات کا ذکر آیا ہے۔ وقت کا تصور (Personality) شخصیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان صداقت (ستیہ) (Truth) کا متلاشی ہے ایران (Beauty) جمال کا اور عرب (Goodness) صلح کا۔ اسلام نے تینوں کو (Personality) میں جمع کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں گویا وہ ذات شخصیت ہوگی جو سچائی رعنائی اور اچھائی کا مجموعہ ہو۔

پروفیسر حمید احمد خاں (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) علامہؒ سے متعلق راوی ہیں فرمایا!

مسلمانوں کی عمارتیں دو قسم کی ہیں جلالی اور جمالی اور یہ دونوں قسم کی عمارتیں اپنے بنانے والوں کے کردار کا آئینہ ہیں مثلاً جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیبؒ میں محبت کا عنصر زیادہ تھا اس لئے تاج محل، شالیمار اور شاہی مسجد لاہور، حسن و جمال کا مظہر ہیں۔ شیر شاہ سوری پیکر جلال تھا اس لئے اس کے تعمیر کردہ قلعوں سے ہیبت برستی ہے۔ الحمرا کے بانی بنو نصر تھے جن میں شدت اور سخت گیری زیادہ تھی اسی لئے الحمراء کو دیکھ کر خوف سا آنے لگتا ہے۔ میں نے الحمراء میں ہر جگہ ہوالغالب لکھا دیکھا اور ایسے حصوں کی تلاش کرتا رہا جن سے انسان کے غالب ہونے کا تصور پیدا ہو۔

مسجد قوت الاسلام (دہلی) کے جلال و قوت نے مجھے اس قدر مرعوب کیا کہ اس میں نماز پڑھنے کا خیال مجھے ایک جسارت معلوم ہوا۔ اس کا وقار مجھ پر چھا گیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں اس میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔ (ضرب کلیم میں مسجد قوت الاسلام پر علامہ کی ایک نظم بھی ہے)

جوں جوں زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے توں توں تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔

فرمایا۔ قصر زہرا دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے مسجد قرطبہ مہذب دیوؤں کا مگر الحمراء مہذب انسانوں کا۔۔۔ تاج محل کے متعلق فرمایا مسجد قوت الاسلام کی کیفیت اس میں نہیں۔ دہلی کی جامع مسجد کے متعلق کہا وہ تو ایک بیگم ہے۔

علامہ اقبال کی کابل میں ایک تقریر سے ماخوذ:۔ قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں، حکماء کے فیضان سے پروان چڑھتی ہیں اور سیاست دانوں کے ہاتھے چڑھ کر مر جاتی ہیں۔

سید سلیمان ندویؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں اقوام کی زندگی میں قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ جدید بلکہ میرا میلان قدیم کی طرف ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سورۂ نور کی تفسیر (ناشر مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور) کے صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں۔

''کمینہ خصلت لوگوں کا خاصا ہوتا ہے کہ جب دوسرے کی خوبیاں اور اپنی کمزوریاں صریح طور پر دیکھ لیتے ہیں اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اسے بڑھا رہی ہیں اور ان کی اپنی کمزوریاں انہیں گرا رہی ہیں تو انہیں یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ اپنی کمزوریاں دور کریں اور اس کی خوبیاں اخذ کریں بلکہ وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے اس کے اندر بھی اپنے ہی جیسی برائیاں پیدا کر دیں اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اوپر خوب گندگی اچھالیں تا کہ دنیا کو اس کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور صحافت میں ہم نے اپنے حریفوں کو کبھی بلند نہیں پایا کسی لحاظ سے بھی۔ بلکہ ایسے آدمی ہمارے سامنے آتے رہے جو خلقتاً اس قابل ہی نہ تھے کہ انہیں منہ لگایا جائے۔ چنانچہ ذوق کو شاعر ہونے کے باوجود غالباً اسی قماش کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا کہ انہیں تر دامنی پر ناز کرنا پڑا اور اپنے علونفس کی تحریک پر یہاں تک کہہ گئے۔

دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

دنیا کے بدترین آدمیوں نے ہمیشہ دنیا کے بہترین آدمیوں پر چھینٹے اڑائے ہیں۔ لیکن وہ لمحہ خاصا جانگداز ہوتا ہے جب پستیاں بلندیوں پر تنقید کرتی ہیں اور کنکریاں موتیوں کو گھورتی ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۵ اپریل ۱۹۷۱ء)

«غریب شہر»

سخنہائے گفتنی دارد

جناب احمد سعید کرمانی نے گورنمنٹ کالج ہال میں نذرل اقبال (واضح رہے کہ نذرل۔۔نذرالاسلام کا مخفف ہے) تقریب میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔۔۔۔

(۱) علامہ اقبال اور قاضی نذرالاسلام کا مقصد ایک ہی تھا مگر طریق کار جدا جدا تھا۔

(۲) اقبال عوام وخواص کے شاعر تھے نذرالاسلام صرف عوامی شاعر ہیں۔

(۳) علامہ اقبال کی زبان علمی تھی، قاضی نذرالاسلام کی عوامی۔

(۴) دونو مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔دونو کا مطمح نظر ہندو کے غلبے سے بچانا اور انگریز سے نجات دلانا تھا۔

(۵) نذرالاسلام پہلے شاعر تھے جنہوں نے اسلامی لٹریچر کو بنگالی زبان میں سمویا۔

یہ الفاظ کرمانی صاحب کے اپنے اخبار کوہستان کی اشاعت مجریہ ۱۹ مئی سے ماخوذ ہیں۔

امروز نے جو رپورٹنگ کی ہے اس میں درج ہے کہ۔۔۔۔

(۱) علامہ اقبال اور قاضی نذرالاسلام کا نقطہ نگاہ ایک ہی تھا اور دونو براعظم کے مسلمانوں کو خواب خفتہ (حسن ترکیب ملاحظہ ہو) سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔مشرق (نیشنل پریس ٹرسٹ کا پہلوٹھی کا بیٹا) رقم طراز ہے۔

قاضی نذرالاسلام اپنے دور کے عظیم شاعر تھے انہوں نے اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

چار چار کالمی تصویروں کے ساتھ ہم نے یہ روداد پڑھی تو سوال پیدا ہوا کہ رپورٹنگ غلط ہوئی ہے کرمانی صاحب نے جو کچھ کہا ہوگا وہ یقیناً اس سے مختلف ہوگا کیونکہ کرمانی صاحب اتنے بڑے آدمیوں کے متعلق ایک خلاف واقعہ بات کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

اگلے روز تردید و تصحیح نہ گزری تو ہم نے محسوس کیا کہ کرمانی صاحب کی نگاہ سے یہ خبر ہی نہیں گزری ہوگی۔

نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخباروں کا بیشتر عملہ اس قسم کی علمی وفکری رپورٹنگ پر قادر نہیں۔وہ صرف محلوں، بازاروں اور مکانوں کے جرائم کی کہانیاں ہی لکھ سکتا ہے۔لہٰذا اس رپورٹنگ کے مجروح ہو جانے سے علم وفکر کی رسوائی نہیں ہوتی؟

کئی روز گذر جانے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) ان ارشادات کی تصحیح فرما دیں۔یہ اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ان اخباروں میں بعض کالم نویس حضرات جس انداز میں تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں اس سے غلطی ہائے مضامین کے پختہ ہونے کا اندیشہ قوی ہوتا ہے۔

(۲) کرمانی صاحب نے جس جماعت کو خطاب فرمایا وہ طلبہ کی جماعت تھی اور اس میں ایک کثیر تعداد طالبات کی بھی ہے۔اگر انہوں نے یہ خیالات ،دماغ میں نقش کر لیے اور صرف اس سند پر کہ ایک وزیر کی زبان سے نکلے ہیں تو معیار تعلیم پہلے ہی تنزل پر ہے اس سے اور مضحک ہو جائے گا۔فرض کیجئے ان طلبہ و طالبات نے اگر یہی خیالات کسی امتحانی پرچے میں لکھ دیے یا کسی مجلس میں بیان کیے تو نہ صرف علم کی اہانت ہوگی بلکہ ان کا فیل ہو جانا بھی لازمی ہے۔

بہر حال قاضی نذرالاسلام اور علامہ اقبال کے موازنہ میں جو کچھ چھپا ہے اس کا ننانوے فی صد حصہ حقیقت کے خلاف ہے۔

(۱) نذرالاسلام کو اقبال سے کوئی مماثلت یا مشابہت نہیں۔وہ ایک علاقائی زبان کے عظیم شاعر ہیں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ترجمہ سے پہلے ان کے کلام سے اس برصغیر کی اسلامی وغیر اسلامی تحریکیں کاملاً ناواقف تھیں۔ان کا دائرہ اثر بنگال تک محدود تھا۔انہیں اگر اپنے کلام کی روح اور اپنے اظہار کی جسارت کے باعث کسی شاعر سے تشبیہ یا مماثلت دی جا سکتی ہے تو وہ جوش ملیح آبادی ہیں۔۔۔۔اقبال نہیں۔

(۲) نذرالاسلام محض شاعر تھے مفکر نہیں، اقبال اور انکے مقاصد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔رہا طریق کار تو جب مقصد ہی ایک نہیں، تو اس پر بحث ہی فضول ہے۔اگر طریق کار کی جگہ طریق اظہار ہوتا تو یہ کسی حد تک برمحل تھا۔

(۳) ''اقبال عوام وخواص کے شاعر تھے؟'' یہ بھی ایک چلتی ہوئی بات ہے۔اقبال حقیقتاً ملت اسلامیہ کے شاعر تھے۔انہوں نے اپنے خیالات کی توسیع وتبلیغ کے لیے (عربی کے بعد) مسلمانوں کی سب سے زیادہ مقبول و موثر زبان یعنی فارسی اور اردو کا انتخاب کیا اور اسی میں دعوت فکر دیتے رہے۔بنگالی زبان کو اسلامی ادب یا دینی تفکر میں کبھی کوئی مقام حاصل نہیں ہوا ہے۔

(۴) اقبال کی زبان علمی تھی اور نذرالاسلام کی عوامی۔یہ فقرہ صرف داد کا مستحق ہے۔

حالانکہ اقبال کی زبان اسلامی تھی اور نذرالاسلام کی بنگالی۔اگر دونو زبانوں کے حدود فاصل مقرر کو

معلوم ہوں، تو وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں ورنہ ؎

یک حرف کا شکے کہ بعد جا نوشتہ ایم

رہا مطمح نظر کا سوال تو یہ بھی فاضل مقرر کی دستگاہ فکر سے باہر رہا۔ علامہ اقبال کو محض اس لیے نذر الاسلام کے مقابلہ میں کھڑا نہیں کرنا چاہیے کہ مشرقی پاکستان کو ہر معاملہ میں، خواہ فکر ہو خواہ سیاست، پیرٹی (Priority) کی ضرورت ہے۔ اقبال کے ہاں توحید و رسالت اور اس کے مقتضیات کے سوا کچھ نہیں۔ وہ پاکستان سے زیادہ مشرق اور مشرق سے زیادہ اسلام کے شاعر ہیں۔

نذر الاسلام کا کلام وقتی اتار چڑھاؤ یعنی وقت کی تحریکوں سے متاثر ہوا اور انہیں علاقائی سطح پر متاثر بھی کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ''بلبل'' میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے جرأت آموز نظمیں لکھی ہیں یا پھر انکے راہوار فکر نے (عمر کے ساتھ) مجاز کا رخ نہیں کیا بلکہ ماسکو کی طرف مڑ گیا ہے۔ فی الجملہ ان کا تصور۔۔۔ آخری منزل میں۔۔۔ اس نظریہ کی بکلی تردید کرتا ہے۔ ان کے ہاں ایک خاص ادا کے کلام میں اسلام سے شروع ہو کر اسلام پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اٹھتی اسی لے میں، لیکن ختم ہوتی ہے وطنیت اور اشتراکیت کے ساز پر۔

نذر الاسلام کے اخلاص فکر میں شبہ نہیں۔ وہ خیالوں کے جس سانچے میں ڈھل گئے ہیں اقبال سے یکسر مختلف ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بنگالی کے جیالے سپوتوں پر ان کی شاعری نے انقلاب آفریں اثر ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا شہری نہ ہونے کے باوجود اور کلکتہ میں مستقل قیام کے باوصف (گو اس کی وجہ ان کی مستقل بیماری، تقسیم سے بیزاری اور ہندو رفیقہ حیات بھی ہے) ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اہل علم و نظر کو ہے! لیکن، اقبال سے انہیں کوئی نسبت نہیں ہے۔ ان کی شاعری کو اقبال سے وہی نسبت ہے جو فکر اقبال کو گورگی کی ملفوظات سے ہو سکتی ہے۔

رہ گئی کرمانی صاحب کی یہ کرم فرمائی کہ نظر الاسلام نے اسلامی اقدار کی ترویج و احیاء کا فرض انجام دیا ہے۔ ہمارے مطالعے کی حدود سے ماورئی ہے۔ اگر وہ اس کی سندیں مہیا کر دیتے تو ہم ان کے شکر گزار ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ نذر الاسلام کے شعوری عہد کا لٹریچر ہندو صنمیات سے پر ہے۔ وہ بالطبع متحدہ قومیت کے داعی نہیں بلکہ سیاسی طور پر ان کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ اب بھی ان کا نقطہ نظر یہی ہے کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اس لئے انہوں نے پاکستان میں قیام کو پسند نہیں کیا۔ اس گذارش کا مطلب یہ ہے کہ ذمہ دار افراد کو لب کشا ہونے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا حقیقت سے کتنا تعلق ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۹ مئی ۱۹۶۷ء)

علامہ اقبال اور سر فضل حسین

بعض لرزہ خیز انکشافات

علامہ اقبال اور میاں سر فضل حسین کالج کی فضا میں ہم سبق تھے۔ دونو میں زمانہ طالب علمی کا دوستانہ علاقہ تھا۔ علامہ کے اس دوستانہ ذہن کا اندازہ بانگ درا کی ایک نظم فلسفۂ غم سے ہوتا ہے۔ نظم میاں فضل حسین کے نام سے منسوب ہے۔ چودھری نذیر احمد ایڈوکیٹ راوی ہیں۔ میاں صاحب کی والدہ ماجدہ وفات پا گئیں میاں صاحب کو شدید صدمہ ہوا۔ علامہ نے کچھ عرصہ بعد میاں صاحب کے لیے یہ نظم لکھی۔ اس کے ۳۳ شعر ہیں اور ان کا تاثر نہایت گہرا ہے۔

میاں صاحب نے اپنا سیاسی سفر کانگرس سے شروع کیا تھا اور ایک زمانہ میں (ترک موالات سے قبل) میاں صاحب صوبہ کانگرس کے صدر یا سیکرٹری تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے ہندوستان کو قسط وار اختیارات دینے شروع کیے تو اس کی پہلی قسط ہی میں میاں صاحب صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو کر مقتدرین میں ہو گئے۔ اس زمانہ میں وزراء کا وجود نہ تھا جو لوگ کسی محکمہ یا شعبہ کے انچارج ہوتے تھے وہ اس محکمہ یا شعبہ کے ممبر کہلاتے تھے۔ آخر میاں صاحب صوبہ سے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن ہوئے۔ وہ سرکاری مزاج ضرور تھے لیکن اکل کھرے انسان تھے۔ ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے درد تھا اور ہندوستان کو برطانوی استعمار کے مقابلہ میں عزیز رکھتے تھے۔ ان کی موت پر گاندھی جی نے بھی تعزیتی بیان دیا اور ان کی قابلیت پر استحسان کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا کہ ان کی موت سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا جو ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان اور انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانی تھا۔

قصہ خوانی بازار پشاور میں انگریزوں نے اپنے وحشیانہ تشدد سے پٹھانوں کو تہ تیغ کیا تو سارے ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کانگرس نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی۔ حکومت نے کانگرس سے خوفزدہ ہو کر ایک دوسری کمیٹی مولوی شفیع داؤدی (ممبر مرکزی اسمبلی) کی سیادت میں قائم کی۔ مولوی صاحب سرکار پرست قسم کے انسان تھے۔ سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہونے کی وجہ سے سرکاری عزائم سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنے ایک معتمد کو پشاور بھجوایا اور پٹھانوں کے سرفروش عناصر کو پیغام دیا کہ وہ مولوی شفیع داؤدی کی کمیٹی سے تعاون نہ کریں۔ اس میں ایک سرکاری چال ہے جو کچھ ہوا وہ کانگرس کمیٹی کو بتایا جائے کانگرس کمیٹی کے چیئرمین مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کے برادر اکبر مسٹر وٹھل بھائی پٹیل تھے۔ جو ان دنوں مرکزی

اسمبلی کے پریذیڈنٹ لیکن حکومت کے لئے صدارتی اعتبار سے سوہانِ روح تھے۔۔۔ چونکہ یہ مضمون حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں اور اس پر ۴۴ برس گزر چکے ہیں اس لیے تسامح کا امکان ہے۔ مسٹر ونھل بھائی کمیٹی کا داخلہ سرحد میں روک دیا گیا اور مولوی شفیع داؤدی پٹھانوں کے عدم تعاون کے باعث اپنا سامنہ لے کر واپس آ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں اقبال کی سیرت کے عظیم پہلو شاذ ہی بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے سرکاری اکادمیوں کی معرفت اقبال کے سوانح و افکار پر قلم اٹھایا وہ برطانوی ہند میں سرکار کے زلہ خوار تھے یا ریاستوں کے نمک خوار! انہیں ''اقبال وحیدر آباد'' اور ''اقبال و بھوپال'' کے تذکرے تو ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اقبال نے سیاسی زندگی میں فقر و استغنا کی جن روایتوں کا علم گاڑا وہ ان کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں۔ وہ کانگرس کے ساتھ قومی جدوجہد میں شریک مسلمانوں کو تو گالی دیتے ہیں۔ لیکن اقبال نے برطانوی حکومت کے زلہ خواروں سے جو سلوک کیا۔ وہ ان کے احاطہ تحریر سے خارج ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کانگرس سے بیزار ہونے کے باوجود برطانوی حکومت کا ناقوس نہ تھے۔ وہ ایک فرقہ وار سیاست دان کے بجائے ایک مسلمان فلسفی کی حیثیت سے مسلمانوں کی انفرادیت پر غور کرتے اور ان کی بالا بلندی کے متمنی تھے۔ آج اقبالیات کے مصنف ہزار ہا روپیہ سرکاری زر اعانہ سے حاصل کرتے ہیں اور بزم اقبال یا اقبال اکادمی کی مسند پر فائز ہیں۔ لیکن اقبال مدت تک معیشت کے اضطراب کا شکار رہے اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو آپ نے سید راس مسعود کو بھوپال کے وظیفہ سے متعلق لکھے یا حکیم احمد شجاع کے ان مقالوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو ماہنامہ ''نقوش'' اور ہفتہ وار ''چٹان'' میں چھپ چکے ہیں۔ ان مقالوں میں حکیم صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ اقبال کے اس معاشی اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے سر منوہر لال نے ان سے کہا کہ علامہ کوئی ایسی کتاب طلبہ کے لئے مرتب کریں۔ جس کی رائیلٹی ان کی گزر بسر کا ہاتھ بٹا سکے۔ وہ کتاب مرتب کی گئی لیکن پاکستان بنا تو نصاب کے نئے مرتبین نے وہ کتاب محذوف کرا دی اور اس کی جگہ اپنے تنور شکم کا ایندھن فراہم کیا۔ علامہ اقبالؒ برطانوی حکومت کی مشینری کا پرزہ بننے کے بجائے ایک دفعہ ہائی کورٹ کا جج بننے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن بیگم شاہنواز کے خاندان نے سر شادی لال سے ملی بھگت کر کے ان کا پتا کٹوا دیا۔ سر شادی لال نے ۱۹۲۵ میں علامہ اقبالؒ کے جج ہونے سے متعلق رائے ظاہر کی کہ ''ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں قانون دان کی حیثیت سے نہیں''۔

راقم سید عطاء اللہ بخاری علیہ الرحمۃ کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے ہاں قدم بوسی کے لئے گیا تو شاہ جی اور حضرت علامہ کی بے تکلفی لے حیرت و مسرت ہوئی۔ شاہ جی انہیں یا مرشد کہتے۔ علامہ او پیرا (اے پیر) یا عطاء اللہ شاہ کہہ کر مخاطب ہوتے۔ ایکا ایکی گفتگو کی باگ کاسہ لیس خاندانوں کی طرف مڑ گئی۔ علامہ نے اشکبار لہجہ میں شاہ جی سے کہا ''میری ججی کے مسئلہ میں باغبانپورہ کے ان کاسہ لیسوں نے چیف جسٹس ہائیکورٹ کو لکھ کر دیا کہ مجھے اغلام کا شوق ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ غالباً ان لوگوں کا خدا مر چکا ہے۔ میں انسان ضرور ہوں۔ میں نے جوانی کی وادیاں بھی قطع کی ہیں۔ لیکن اس گناہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

شاہ جی نے راقم سے بیان کیا کہ حضرت علامہؒ نے اس زمانہ میں بھی مجھ سے یہی بیان کیا اور بچوں کی طرح رو دیئے تھے کہ خدا کے دشمنوں نے مجھ پر وہ الزام لگایا ہے۔ جس کا تصور بھی میرے نزدیک انسان کو جہنمی بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر سچیتا نند سہنا (اب انتقال کر چکے ہیں) نے ہندوستان کی آزادی کے بعد علامہ اقبالؒ پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اس پر نو سال صرف کئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا نقطہ نگاہ اپنا ہی ہے۔ اس میں ایک ہندوستانی کی روح کے علاوہ ایک ہندو کا ضمیر بھی ہے۔ لیکن بہر حال وہ ایک مطالعہ کی چیز ہے۔ اور اس کے مندرجات سے کئی ایک راہیں کھلتی ہیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر سہنا ایک علمی انسان تھے۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہندوستان کی مجلس دستور ساز کے عارضی صدر رہے۔ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں اپنی قابلیت کا نقش جمایا ادبی و علمی دوائر میں ان کی شہرت معراج تک پہنچی۔ اقبال سے متعلق ان کی کتاب کے ۲۸ باب ہیں اور انہیں سب سے زیادہ اقبالؒ کے مسلمان ہونے کی شکایت ہے۔

انہوں نے اس کتاب میں علامہ سے متعلق سر فضل حسین کے فرزند ارجمند میاں عظمت حسین آئی سی ایس۔ کے حوالے سے علامہ اقبالؒ اور میاں فضل حسین کے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ تعلقات کے اشاراتِ ذیل ان کی سوانح عمری سے ماخوذ ہیں۔

میاں عظمت حسین نے اپنے والد کا تذکرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ علامہ اقبال کو میاں صاحب کی پنجاب میں دیہاتی و شہری تقسیم کے ذہن سے شدید اختلاف تھا۔ اور وہ اسی ذہن کے تحت اس نقطہ نگاہ کو اسلامی وحدت کے خلاف قرار دے کر سخت سے سخت تنقید کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء سے جب کہ میاں صاحب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ اور صوبائی خود اختیاری کے بعد یونینسٹ پارٹی

کے قائد کی حیثیت سے پنجاب میں انتخابات کا ڈول ڈال کر صوبہ کا وزیر اعظم ہونا چاہتے تھے تو حضرت علامہ نے ۱۹۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے میاں صاحب کے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ:

''یہ حقیقت المناک ہے کہ شہری و دیہاتی کی انتخابی تقسیم کو سر فضل حسین کی حمایت حاصل ہو، انہوں نے صوبہ کے دیہاتی راہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلم راہنما کی حیثیت سے اقتدار حاصل کیا اور حصول اقتدار کے بعد دیہاتی و شہری اختلافات پر زور دینا شروع کیا ہے''۔

اس وقت کے حالات میں یہ کلمۃ الحق تھا اور آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کے مصداق اقبال کلمۃ الحق کی پشتیبانی کے لئے مجبور تھے۔ حقیقۃً وہ سروں، خان بہادروں اور سرکاری خطاب یافتگان کی جماعت سے بیزار تھے۔

سر فضل حسین محسوس کرتے تھے کہ ان کے خلاف پنجاب میں سیاسی تنقید کا آغاز علامہ اقبال کی وجہ سے ہوا۔ اور ان کے لئے علامہ نے بعض مشکل سوال پیدا کر دیے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں گورنر پنجاب سر میلکم ہیلی کو میاں فضل حسین نے آمادہ کیا کہ علامہ اقبال کو ججی کا عہدہ دیا جائے۔ لیکن ایک تو باغبانپورہ کی سر شفیع فیملی سر شادی لال کی آلہ کار ہو کر مزاحم ہوئی، دوسرے عظمت حسین کی روایت کے مطابق علامہ نے حکومت پر ایسی تنقید کی جس سے برطانوی حکام ناراض ہو گئے۔

آئندہ اصلاحات میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لیے ۱۹۲۷ء میں وزیر ہند کے پاس ایک مسلم وفد بھیجنے کی تجویز ہوئی تو میاں فضل حسین نے علامہ اقبال سے اس وفد کی راہنمائی کے لیے کہا۔ اس غرض سے تین ہزار روپے فنڈ بھی اکٹھا ہو گیا لیکن علامہ اقبال نے انکار کر دیا۔ ان کے انکار پر سر ظفر اللہ خان پروان چڑھے اور وہ سرکار کی منشا کے مطابق لندن گئے۔

سر شہاب الدین پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر تھے۔ میاں فضل حسین نے تجویز کیا کہ ان کی معیاد ختم ہونے پر علامہ اقبال کو صدر بنایا جائے۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے یونی نسٹ پارٹی کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور اس کی پالیسی پر کھلم کھلا سخت سے سخت تنقید کی، نتیجۃً یونینسٹ پارٹی کے بزرجمہروں اور ان کے مہمل تابعین نے علامہ کو پریذیڈنٹ بنانے سے اتفاق نہ کیا۔ ادھر علامہ نے اپنے خیالات میں ترمیم کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسری گول میز کانفرنس میں برطانوی حکومت مسٹر محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کو نامزد کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ کہ دونو خود رائے ہیں۔ اور ''فرقہ وار'' مسلمان ہونے کے باوجود سرکاری مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ سرکار کے لیے سر میاں محمد شفیع اور ان کی بیٹی بیگم شاہنواز نعمت غیر مترقبہ تھے۔ لیکن سر میاں فضل حسین کی مداخلت اور رسائی سے علامہ اقبال کو نامزد کرنے پر سرکار راضی ہو گئی۔ قائد اعظمؒ کو نظر انداز کیا گیا۔۔۔

اثنائے سفر علامہ اقبالؒ سر اکبر حیدری کی کاسہ لیسی سے الجھ گئے۔ سرکاری منشا کے مطابق ساختہ مسلم وفد پر سخت تنقید کی نتیجتہً وزیر ہند ان سے آزردہ ہو گئے۔ علامہ استعفیٰ دے کر ہندوستان واپس آ گئے۔

الہ آباد میں مسلم لیگ کا خطبہ صدارت پاکستان سے متعلق پہلی آواز تھا۔ اس خطبہ میں آپ نے حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی کہ وہ مسلمانوں کو اپنی شطرنج کے مہرے بنا کر کھیلنا چاہتی ہے۔

اقبال کی ان آزاد خیالیوں اور بے باکیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ وائسرائے نے میاں فضل حسین کی اس تجویز سے اتفاق نہ کیا کہ علامہ کو پبلک سروس کمیشن کا رکن بنایا جائے یا جنوبی افریقہ میں انہیں ایجنٹ جنرل مقرر کیا جائے۔ اس آخری تجویز سے علامہ نے خود اتفاق نہ کیا۔ کیونکہ وہ اپنی اہلیہ کے بے پردہ ہونے اور انہیں بے پردہ رکھنے کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔۔۔۔ انگریز چاہتے تھے کہ علامہ اقبالؒ ان کی منشا کے مطابق چلیں، یہ اقبال کی فطرت اور غیرت کے خلاف تھا۔ سر فضل حسین ان کے لیے دوستانہ اخلاص یا کسی اور وجہ سے ملازمت پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر ان کی کوئی بیل منڈھے نہ چڑھی سرکار مان جاتی تو اقبال تاراج کر دیتے۔

سر فضل حسین نے سر اکبر حیدری کو لکھا کہ وہ نظام سے ان کے معاشی اضطراب کو غیرت مندانہ طور پر حل کرائیں۔ لیکن سر اکبر حیدری کے دل میں کوئی ناراضی یا بغض تھا کہ وہ ٹال مٹول کرتے رہے۔ یوم اقبال پر ایک ہزار کا چیک نظام کے توشہ خانہ سے بھجوایا۔ اقبال نے حقارت سے واپس کر دیا کہ

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے کہ ہے میری خدائی کی زکات

معاملہ سارا اتنا تھا کہ سرکار اقبالؒ کو خریدنا چاہتی تھی فضل حسین فی الواقعہ ان کے معاشی اضطراب کو دور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اقبال ان کے ڈھب کے نہ تھے۔ اقبالؒ کا فقر رسالتمآب ﷺ کے حکیمانہ ارشادات کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا اس کو موڑنا ناممکن تھا۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۲ اپریل ۱۹۷۳ء)

مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال

عادی مجرموں کی زبان درازیاں

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک پاکستان کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ ان دنوں دہلی میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح لیگ کے مقامی راہنما مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت کو جلسہ میں لے آئے خوب دھواں دار تقریریں ہوئیں۔ تقریباً تمام یاوہ گو مقرروں نے مولانا حسین احمد کے خلاف انتہائی گندہ زبان استعمال کی اور اس طرح اپنا نقطہ نگاہ پیش کیا۔ یہی ان کا سرمایہ تھا اور شاید اس کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے۔

خلاصہ بیان اس پر ختم ہوتا کہ شیخ الاسلام حسین احمد مدنی نہیں مولانا محمد الیاس ہیں اور ان کی تعریف میں دو چار زور دار کلمات کہہ کر اپنی تقریر ختم کر دیتے، آخر میں مولانا محمد الیاس نے خطاب کیا اور صرف چند کلمات کہہ کر تقریر ختم فرما دی۔ مولانا نے فرمایا کہ ''مولانا حسین احمد کی سیاسی رائے میری سمجھ سے بالا ہے۔ اگر میں اس سے اتفاق کرتا تو ان کی کفش برداری کرتا لیکن میں ان کی ذات کے خلاف کوئی کلمہ اپنی زبان پر لا کر جہنم کی آگ خریدنا نہیں چاہتا کیونکہ میں اللہ کے نزدیک ان کے مرتبہ سے آگاہ ہوں، اس قسم کا حوصلہ وہی نوجوان کر سکتے ہیں جو حسین احمد کے درجہ و مقام سے واقف نہیں ہیں۔ اور نہ قرآنی اخلاق کے اسلامی حدود سے بہرہ ور ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت ہونا چاہتے تھے لیکن مولانا مدنی نے ان کی طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے انہیں مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا اور وہ ان کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی مسلم لیگ کے حلقہ سیاست میں شیخ الاسلام تھے۔ ان کا مرتبہ و مقام بھی ڈھکا چھپا نہیں جب کبھی ان سے مولانا مدنی کے متعلق سوال کیا گیا انہوں نے عموماً یہی کہا کہ مدنی صداقت اسلام کی دلیل ہیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع بفضلِ تعالےٰ بقید حیات ہیں اور زمانہ دیوبند سے مسلم لیگ کے طرفدار ہیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی خدمت کی ہے۔ ان سے پوچھئے کہ مدنی غیرت اسلام کی دلیل تھے اور فقر اسلام کا نمونہ تھے یا ملتِ اسلامیہ کے غدار تھے؟ اور ہندو کے اجیر؟ ہم مولانا احتشام الحق تھانوی کو دین کے بجائے

دنیا کا انسان سمجھتے ہیں ان میں واعظانہ خوبیوں کے باوجود کسی حکومت سے ٹکراؤ کا حوصلہ نہیں وہ سیاسی اقتدار کے انسان ہیں۔ ان سے دریافت کر لیجئے کہ مولانا حسین احمد مدنی آیاتِ الٰہی میں سے تھے یا ہندو کے ایجنٹ تھے؟

جن دوستوں نے چٹان کو لگاتار اپنے مطالعہ میں رکھا ہے انہیں یاد ہو گا کہ ہم نے دس پندرہ سال پہلے جالندھر کے ایک راسخ العقیدہ لیگی نوجوان ڈاکٹر مولوی محمد اکرام الحق مرحوم کی زندگی میں ان کی اس روایت کو لکھا تھا کہ مولانا مدنی جالندھر اسٹیشن سے ٹرین میں جا رہے تھے تو لیگ کے دو نوجوان ان کے ڈبے میں گھس گئے۔ ایک نے مولانا مدنی کی داڑھی پکڑی۔ دوسرے نے اس پر تھوکا۔ مولانا مدنی نے آہ تک نہ کی جب یہ روایت ان نوجوانوں نے جالندھر مسلم لیگ کے صدر مولانا عظامی کو سنائی تو مولانا عظامی نے ان نوجوانوں سے کہا بڑ ہانک رہے ہو یا واقعی تم نے ایسا کیا اور اس پر فخر کر رہے ہو، جب دونو نوجوانوں نے تصدیق کی کہ فی الواقعہ وہ یہ کر آئے ہیں تو مولانا عظامی نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو۔ مدنی اہل اللہ میں سے ہے۔ اس نے مدتوں روضہ رسول ﷺ کی پلکوں سے جاروب کشی کی اور آستانہ اقدس کے سامنے بیٹھ کر حدیث پڑھائی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے مدنی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ پانی میں ڈوب جائیں گے یا انہیں آگ چاٹ جائے گی۔ ڈاکٹر اکرام الحق راوی تھے کہ ان دو نوجوانوں میں سے ایک تقسیم کے وقت دریائے بیاس کی نذر ہو گیا۔ دوسرا پاکستان میں آ کر پولیس کی معرفت ایک لیگی لیڈر ہی کے ہاتھوں آگ کی بھٹی میں پھینک دیا گیا اور بھسم ہو گیا۔

یہ اتنی واضح اور بین شہادتیں ہیں کہ اس کے بعد اگر کوئی بدکردار اور بدقماش قلم کار مولانا مدنی کی شان میں گستاخی کرتا اور قائداعظمؒ کی آڑ لے کر انہیں یا ان کے ساتھیوں کو اجیر علماء لکھتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بدبخت انسان ہے اور اسے اپنے نفس کی غلاظتوں پر ساری دنیا کا قیاس ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی۔ چراغ مصطفوی پر شرار بولہبی نے ہمیشہ رکیک حملے کئے ہیں۔ جو لوگ اپنے دل میں خدا کا خوف رکھتے ہوں وہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتے۔ اس ژاژ خائی کا حوصلہ صرف انہیں لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں اپنے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ کس نطفے کا پتا ہیں؟ آج دنیا میں نہ قائداعظم رہے نہ علامہ اقبالؒ، نہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ وہ پرانی بساط تمام لپٹ چکی ہے۔ اب ان سب کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے لیکن ان اکابر کی موت کو سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جو لوگ ایک کی آڑ میں دوسرے کو برا کہتے ہیں وہ بہرحال انسان نہیں ہیں۔ گو اس قسم کے افراد گنے چنے ہی ہیں۔ مثلاً صحافیوں میں قادیانی امت کے دسترخوان کا ایک ذلہ ربا تن تنہا اس طرز کا ہذیان کہنے میں پیش پیش ہے اور اکثر و بیشتر آڑ یہ لی جاتی ہے کہ

علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق درج ذیل قطعہ لکھا تھا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجمی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد ﷺ عربی است
بہ مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ است
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اشعار بالا ارمغانِ حجاز کے آخر میں درج ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال فرمایا۔ ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبال زندہ ہوتے اور ارمغانِ حجاز ان کی ترتیب و تدوین سے شائع ہوتی تو یہ اشعار اس میں کبھی نہ ہوتے۔ علامہ اقبال شخصیات کی مدح و قدح سے بالا بلند تھے اور عمر کے آخری دور میں یہ چیزیں ان کے تصور ہی سے عنقا ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اس طرز کے تمام اشعار اپنے کلام سے ہمیشہ خارج کر دیے۔ اگر مرتبین اتنے ہی دیانتدار تھے تو انہیں کم سے کم مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ارمغان میں ضرور شامل کرنا چاہیے تھا جو ایک روزنامچے ہی کے صفحہ اول پر شائع ہوا اور ملک کے تمام اخباروں نے نقل کیا اور شاید کوئی دوسرا مرثیہ اس پائے کا نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو وقتی سیاست کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں اور علامہ اقبالؒ ہی کے قلم سے نکلی ہیں۔ مثلاً حضرت علامہ نے علی برادران کی رہائی پر جو اشعار لکھے وہ مسلم لیگ کے اجلاس عام منعقدہ امرتسر میں پڑھ کر سنائے۔ لیکن بانگ درا میں جب کہ ان کا ابتدائی دور تھا شائع کیے تو علی برادران کا ذکر نہ کیا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کی تعریف میں چھ اشعار لکھے جس میں انہیں مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا سے مخاطب کیا۔ وہ اشعار ۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں چھپ چکے ہیں۔ علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری ایام میں قائدِ اعظم کے ساتھ تھے لیکن ۹ نومبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں محمد علی جناح سے بھی پانچ شعروں میں چٹکی لی۔ اسی طرح پہلی جنگِ عظیم میں علامہ نے دہلی کی وار کانفرنس میں مسدس لکھ کر سنائی جس میں شہنشاہِ انگلستان سے متعلق دو بند قصیدے کا انتہائی غلو رکھتے ہیں۔ جب یہ تمام نظمیں شاعرانہ محاسن کے باوجود علامہ نے اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیں تو مولانا حسین احمد سے متعلق تین اشعار کا ارمغانِ حجاز میں شامل کیے جانا فی الواقعہ سیاسی بدعنوانی اور ذہنی حادثہ ہے۔ اس صورت میں یہ اشعار اور بھی افسوسناک معلوم ہوتے ہیں کہ علامہ اقبال نے جس خبر سے متاثر ہو کر یہ اشعار لکھے تھے اس کی حقیقت

سے آگاہ ہوتے ہی روزنامہ احسان میں اس مطلب کا ایک بیان چھپوا دیا کہ مجھ کو اس صراحت کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔ ملاحظہ ہو انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، پیش لفظ جناب ممتاز حسن سابق فنانس سیکرٹری حکومت پاکستان۔ شائع کردہ اقبال اکیڈمی (کراچی)

علامہ اقبالؒ نے جناب طالوت کو ایک خط میں لکھا کہ وہ مولانا مدنی کی تصحیح کے بعد اپنے اشعار کی تلخی کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

اس حقیقت کشائی کے بعد اگر کوئی قلم دراز یا زبان دراز مولانا مدنی اور ان کے رفقا پر نشتر زنی کرتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی فضا سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ قائداعظم اور علامہ اقبالؒ کی روحوں کو بھی صدمہ پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس قسم کے غلط کار لوگ پاکستان میں غالباً یہ تصور کیے بیٹھے ہیں کہ وہ کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی کالک اپنے چہرے پر مل رہے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء)

اقبال کے اشتراکی دانشور

جناب زیڈ اے سلہری نے ۱۰ جولائی کے نوائے وقت میں علامہ اقبال کی سوویں سالگرہ کے سلسلے میں حکومت کی نیشنل کمیٹی کے مجوزہ مصنفین کے موضوعات کا ذکر کیا۔ اس مضمون سے معلوم ہوا کہ اقبال کے سوانح حیات جناب صفدر میر کے سپرد کیے جا رہے ہیں۔ اقبال کے معاشری و معاشی نظریات پر محترم فیض احمد فیض قلم اٹھائیں گے اور اقبال و تصوف کے موضوع پر پروفیسر محمد اجمل کتاب لکھیں گے۔ آپ آج کل وفاقی حکومت میں تعلیمات کے سیکرٹری ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تینوں بزرگ عقیدۃً اشتراکی ہیں کارل مارکس اور لینن کے نظریات و تحریرات سے الگ ان کا ذہن کسی دوسری نظریہ و خیال کا مؤید نہیں۔ اس بارے میں ہم ان کے اخلاص کی قدر کرتے ہیں کہ انہوں نے کسی دباؤ یا تحریص کے تحت کبھی اپنے خیالات کا سودا نہیں کیا۔ جہاں تک فیض احمد فیض کا تعلق ہے وہ ایک مخلص اشتراکی ہیں انہوں نے اس سلسلے میں نہ تو اپنی روش پر کبھی نظر ثانی کی اور نہ وقت کی ضرورتوں کے ساتھ اپنی لے کو بدلا۔ صفدر میر صاحب سے ہم کچھ زیادہ واقف نہیں ان کے متعلق مختلف دوستوں کی روایت ہے کہ وہ اشتراکیت سے خصوصی لگاؤ رکھتے ہیں البتہ حالات کا ریلا دیکھ کر کبھی کبھار الفاظ کے مینا بازار میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

صفدر میر اپنے ساتھیوں میں سب سے کم عمر ہیں انہوں نے انگریزی جرنلزم میں اپنے انداز میں خصوصیت پیدا کر رکھی ہے۔ پروفیسر محمد اجمل گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد تھے وہاں سے اپنے ایک برسر اقتدار شاگرد کی سعادت مندی سے صوبے میں تعلیمات کے سیکرٹری ہو گئے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے پھر اپنے طائفے کی بدولت مرکز میں تعلیمات کے سیکرٹری ہو کر چلے گئے۔ ہر سہ حضرات کو جو موضوع دیئے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کا مضمون نہیں۔ اگر اقبال کے متعلق ان میں کوئی علمی تحریک ہوتی تو پاکستان بن جانے کے ستائیس، اٹھائیس برس میں یہ بہت کچھ لکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے اقبال سے متعلق کسی تالیف یا تصنیف کی اس سارے عرصے میں کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب سرکاری سرپرستی میں اشتراکیت کو بال و پر مہیا کرنے کیلئے اقبال کی معرفت رونما ہو رہے ہیں۔ اب مسئلہ علمی نہیں معاشی ہے۔ کیونکہ انہیں گرانقدر معاوضے عطا کیے جا رہے ہیں اور یہ سب ان لوگوں کی ملی بھگت ہے جو نیشنل کمیٹی میں انجمن ستائش باہمی کے تحت فروکش ہیں۔ ہم فیض احمد فیض کے متعلق اپنے قلم کو داغدار نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے دل میں نظریاتی

فاصلوں کے باوجود ان کا بے حد احترام ہے۔ ہماری شاعری کو انہوں نے ایک نیا دور دیا ہے لیکن ان سے یہ عرض کرنا ہمارا عزیزانہ حق ہے کہ اقبال ان کے معاشی و معاشرتی نظریات سے بالکل مختلف مفکر ہیں۔ بہتر ہوگا کہ وہ اقبال کے افکار کو اس سانچے میں نہ ڈھالیں جس سے اقبال کے افکار کو اتنا تعلق بھی نہیں جتنا ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔ ہمارا فیض کو یہ مشورہ دینا سورج کو چراغ دکھانا ہے تاہم ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ اس کتاب میں نہ اقبال سے انصاف ہوگا اور نہ فیض اپنی عظیم شہرت میں اضافہ کر سکیں گے۔

رہ گئے صفدر میر تو ہم ان سے کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں لیکن نیشنل کمیٹی سے یہ سوال کرنا ہمارا فرض ہے کہ اس نے جناب صفدر میر کو کن خصائص کی بنا پر نامزد کیا ہے۔ کیا وہ انگریزی زبان کے بہت بڑے اہل قلم ہیں یا پاکستان کے ہیگل بولیتھو ہیں؟ وہ اقبال کے سوانح سے متعلق کیا جانتے ہیں؟ اگر مولانا عبدالمجید سالک کی ''ذکر اقبال'' پروفیسر طاہر فاروقی کی ''سیرت اقبال'' اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل'' کو انگریزی میں ترجمہ کرنا ہے تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کے علاوہ صفدر میر اقبال کے سوانح سے متعلق کہیں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں ہم پیشین گوئی کر سکتے ہیں ان سے اقبال کا خاندان کسی حالت میں تعاون کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ اور شاید وہ خود اس کے پاس جانے کی ہمت ہی نہ کر سکیں۔ رہ گئے جسٹس جاوید اقبال تو صفدر میر خود آگاہ ہیں کہ ان کے متعلق جو کچھ ان کے قلم سے ٹپکا ہے اس کے بعد جاوید اقبال ان کی کیا معاونت کر سکتے ہیں؟ اگر نیشنل کمیٹی مخلص ہوتی تو وہ انگریزی کے ان اہل قلم سے فائدہ اٹھا سکتی تھی جو اسلوب و نگارش میں بانکپن رکھتے ہیں اور ایسی شخصیتیں لاہور، اسلام آباد اور کراچی میں بہت ہیں۔ ہمیں سلہری صاحب کے اس نقطہ نگاہ سے کاملاً اتفاق ہے کہ جب ہمارے اشتراکی دوستوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مسلمانوں کے ذہن سے اقبال کو کسی طرح بھی خارج نہیں کر سکتے اور نہ ادب و شعر میں اب تک ان سے اقبال کے مقابلہ کا انسان پیدا ہو سکا ہے تو انہوں نے اقبال کو سبوتاژ کرنے کیلئے نیشنل کمیٹی کی آڑ میں موجودہ کھڑاگ رچایا۔ پروفیسر محمد اجمل کی شہرت نفسیات کے پروفیسر کی ہے لیکن انہوں نے اپنے لئے جو موضوع پسند کیا ہے وہ ان کے بس کا روگ نہیں۔ ہم علی وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اقبال اور تصوف کے زیر عنوان کوئی سی کتاب لکھی تو وہ دنیائے اسلام میں پاکستان سے متعلق یہ افسوسناک تصور پیدا کرنے میں مددگار ہوگی۔ کہ پاکستان کے اہل علم اسلامیات کے معاملے میں کس قدر مضحک ہیں۔ نہ جانے پروفیسر صاحب نے ایک ایسا موضوع کیوں پسند فرمایا جو ان کا موضوع ہی نہیں اور جس کے متعلق ہم اپنی معلومات کے مطابق کہہ سکتے ہیں۔ کہ پروفیسر صاحب مبادیات اقبال بھی نہیں جانتے۔ ہماری بدبختی ہے کہ ہم علمی و ادبی اور تہذیبی و فکری موضوعات پر بھی

پارٹی پالیٹکس کا شکار ہیں۔ اور بسا اوقات اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ جو مداری کا تماشا ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پروفیسر اجمل یا صفدر میر اقبالؒ سے متعلق جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی ذہنی ساخت ہی سے ظاہر ہے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جس ملک کی نظریاتی چھاپ اقبالؒ سے ہے۔ وہاں اقبال کو ہم اس طرح ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح سمرقند بخارا سے اسلامی ذہانت کے چشمے خشک ہو چکے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۱ جولائی ۱۹۷۵ء)

چوتھا باب: خطباتِ یومِ اقبال

☆ پاکستان میں صرف اسلام رہے گا

☆ یوم اقبال پر ایک تقریر

☆ افکارِ اقبال میں موسیقی کا تصور

☆ مرزائیت کی تاریخ، سیاسی دینیات کی تاریخ ہے

☆ لائل پور (فیصل آباد) میں یومِ اقبال

☆ لاہور میں یومِ اقبال

☆ مظفر آباد میں یومِ اقبال

☆ اقبال اور میر کے تصورِ عشق کا بنیادی فاصلہ

پاکستان میں صرف اسلام رہے گا!

کسی سیاسی اقلیت کو یہاں کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی

☆☆☆یومِ اقبالؒ پر آغا شورش کاشمیری کی تقریر☆☆☆

ہم نے آخری سوچ وچار کے بعد فیصلہ کرلیا ہے کہ ان کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا ذہنی مقابلہ کریں جو اس ملک میں جس کی اساس اسلام پر رکھی گئی ہے۔ لادینی افکار کی نیو رکھنا چاہتے اور عوام کی ضرورتوں کو اپنے بوقلموں نعروں کے سحر سے مسحور کر کے سوشلزم کے نام پر فریب دے رہے ہیں۔

ہم اب نہ تو ان سے اغماض کر سکتے، نہ مفاہمت، نہ مصالحت، نہ میثاق، نہ احتراز، نہ چشم پوشی، ہم نے ان کے چہرے کو ہر لحاظ سے بے نقاب دیکھا۔ ان کا تجربہ کر چکے اور ان کی تلخیوں کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ فکر ونظر کا میدان ہو یا علم وفن کا معرکہ، سیاست ہو یا خطابت، منبر ہو محراب، ادب ہو یا ثقافت، شاعری ہو یا نثر، قلم ہو یا بیان، غرض ہر میدان میں ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ یہ ہمارا قطعی فیصلہ ہے۔ پاکستان میں اس کی تخلیقی اساس یعنی اسلام، اور اس کی تعلیمات سے کسی فکری جماعت یا سیاسی اقلیت کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ رواداری کے معنی خودکشی کے نہیں، شرافت کے ہیں اور شرافت صرف شرفاء سے برتی جاسکتی ہے۔ جو لوگ ہماری وحدت، ہماری ملت، ہمارے دین اور ہماری تاریخ کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ یہاں ایک ہی چیز رہے گی اور وہ ہے۔۔۔۔ اسلام، صرف اسلام اور صرف اسلام۔

یہ تھے وہ الفاظ جو آغا شورش کاشمیری نے ۲۱ اپریل کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یوم اقبالؒ کی تقریب میں عوام الناس کو خطاب کرتے ہوئے کہے۔ اس فقید المثال اجتماع کی صدارت تہران یونیورسٹی میں فلسفہ وادبیات کے صدر ڈاکٹر حسین نصر نے کی۔ مسٹر اے کے بروہی نے ڈاکٹر حسین نصر کا تعارف کرایا کہ وہ اس وقت اسلام کے عالم افکار کی ایک عظیم شخصیت ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اقبالؒ کی شخصیت کو زبردست خراج ادا کیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبالؒ اور نشاۃ نو کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا جو اس شمارہ میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔

آغا شورش کاشمیری نے ڈاکٹر جاوید اقبال کے مقالہ پر اپنی مختصر تقریر میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مرکزیہ مجلس اقبال ان سے کاملاً متفق ہے۔ مجلس نے آئندہ انہی خطوط پر عوام وخواص میں کام کرنے کا فیصلہ کیا اور اس امر کا تہیہ کیا ہے کہ بعض گوشوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے تحت جن غلط تصورات کو اقبال سے منسوب کرنے کی مہم جاری کر رکھی ہے۔ اس کا پورے یقین واعتماد کے ساتھ تدارک کیا جائے۔

اقبال صرف مسلمان تھے۔ ان کا دل اسلام کے لیے دھڑکتا اور اسلام ہی کے لیے وہ اپنے غور وفکر کے لمحات صرف کرتے تھے۔ اقبال کو سوشلسٹ کہنا، خوفناک جسارت ہے۔ جو لوگ اس پر اصرار کرتے یا ان کے کلام سے سوشلزم کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ وہ اقبال اور ان کے کلام دونو کے متعلق اولاً غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ثانیاً وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ اپنے لیے راستہ پیدا کریں۔ ثالثاً وہ کلام اقبال کے فہم کی توفیق نہیں رکھتے۔ رابعاً وہ اقبال پر اس قسم کی تہمتیں جڑ کر اقبال پر تضاد خیال کا الزام دھر رہے ہیں۔ حالانکہ کلام اقبال میں تضاد نہیں، تنوع ہے۔

اقبال، قرآن کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام کی روح تمام تر قرآنی ہے۔ وہ عمر بھر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مضطرب رہے۔ ان کی شاعری کا مطمح نظر یہی ہے۔ انہیں اسلام کے ماضی پر فخر تھا۔ وہ اس کو ایک ابدی طاقت سمجھتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ مستقبل کی باگ دوڑ اسلام کے ہاتھ میں ہوگی۔ انہوں نے اسرار خودی میں بارگاہ ایزدی میں دعا کی ہے کہ میں نے کوئی فکر یا خیال غیر از قرآن لیا ہے تو اے العالمین! مجھے قیامت کے دن حضور ﷺ کے پائے مبارک کے بوسہ سے محروم رکھنا۔ میرے وجود سے اس زمین کو پاک کر اور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن

آغا صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

جو لوگ اقبال کے افکار سے سوشلزم پیدا کرتے اور اشعار کے سیاق وسباق کو چھوڑ کر اپنی ذہنی خواہشوں کو ان سے منسوب کرتے وہ کجروہی نہیں، خائن بھی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے معاشرے سے فائدہ اٹھانے کے لیے اقبال کی عظمت میں پناہ لے کر اپنا راستہ صاف کرنا اور مسلمانوں کے ذہنی فکر کی چھاپ لگانا چاہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نئی زمانہ معاشی مسئلہ نئی نسل کیلئے پریشان کن ہے لیکن کیمونسٹ یا سوشلسٹ اس مسئلہ کو اپنے مطمح نظر کے مطابق ایکسپلائٹ کر کے ایک نیا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جو خدا اور رسول

کی نفی اور اسلام سے کاملاً بغاوت پر منتج ہوتا ہے۔ کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں کی عادت مستمرہ ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں کوئی امتیاز ہی نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک سچ اور جھوٹ کا تصور ہی اضافی ہے۔ سوشلسٹوں اور کیمونسٹوں کا بنیادی عقیدہ ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے تمام ذرائع درست ہیں۔ کیونکہ ذرائع کے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ نصب العین سے ہوتا ہے۔ کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں نے تاریخی تجربات کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ جہاں جہاں مارکسی انقلاب لانے کی جدوجہد اٹھائی جائے وہاں وہاں اس ملک کے مخصوص قومی عقائد اور ہمہ گیر شخصیتوں سے تعرض نہ کیا جائے، بلکہ ان کو اس انداز میں سامنے رکھا جائے کہ ان کے تذکرے و تقریب سے اپنے افکار ونظریات کی آبیاری ہو، چنانچہ سوشلسٹ یا کیمونسٹ جو دراصل ایک ہی ٹہنی کے پتے ہیں۔ اقبال کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں تو یہ ان کے ہتھکنڈوں کا خاصہ ہے تاکہ ملک بھر میں اقبال کے نام پر جو اجتماع ہوتے ہیں، تقریبیں رچائی جاتی ہیں اور مسلمانوں میں ان کے لیے جو بے پناہ عقیدت موجود ہے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہی معاملہ ان کا اسلام سے ہے انہیں اصرار ہے کہ اسلام میں سوشلزم ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسلامی سوشلزم کی ترکیب اڑالی ہے جو کسی وقت بعض مسلمان اکابر نے نئی تعلیم یافتہ نسل کی تفہیم کے لئے سرراہے استعمال کی تھی۔

یہ کہنا کہ دین ہمارا اسلام ہے، معیشت ہماری سوشلزم ہے اور سیاست ہماری جمہوریت ہے۔ ایک دلچسپ مغالطہ ہے۔ ایک تزویر ہے جو ہم رنگ زمین ہے۔

سوشلزم اور اسلام اکٹھا نہیں ہو سکتے۔ ہم ان لوگوں کی سوشلزم کے متعلق تعبیر وتوضیح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جو بہ لطائف الحیل اپنی زمین ہموار کرنے کے لیے اسلام اور سوشلزم کو یکجا کر رہے ہیں۔ اسلام، اسلام ہے۔ سوشلزم، سوشلزم۔ دونو اکٹھا نہیں ہو سکتے ان میں بعد المشرقین ہے۔

سوشلزم کے متعلق ان لوگوں کی بہ نسبت کارل مارکس، لینن، سٹالن اور ماؤ کے نظریات وتوضیحات وزنی بھی ہیں اور مستند بھی۔ ہر سوشلسٹ کے لیے میٹیریلسٹ (Materialist) ہونا ضروری ہے اور میٹیریلسٹ وہی ہو سکتا ہے جو (Atheist) دہریہ ہو۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ کیمونسٹ یا سوشلسٹ ریاست میں خدا کا تصور بھی رہ سکتا ہے یا اپنے دینی عقائد کے مطابق عوام زندگی بسر کر سکتے اور انہیں تبلیغ کا حق ہوتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس کے فریب و خدع کی مثال نہیں اور نہ اس میں کھل کے سامنے آنے کا حوصلہ ہے۔

آغا صاحب نے اس پہلو کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے ان علماء پر افسوس ظاہر کیا۔ جو اسلامی

سوشلزم کو بھی دین قیم کا حصہ قرار دے رہے اور بہمہ وجوہ اس کی پشت پناہی میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ایسی ریاست میں جو خنجر سب سے پہلے اٹھے گا وہ ان کی گردنوں پر ہوگا۔

آغا صاحب نے کہا جو شخص قومی سیاست میں تشدد پر یقین رکھتا ہو، وہ قوم کا دوست نہیں ہو سکتا اور جو اسلامی معاشرہ میں سوشلزم کا ناد پھونکتا ہو وہ بالآخر اس ملک سے اسلام کو رخصت کرنے کی سازش کا آلہ کار ہے۔ حاضرین نے ہاتھ کھڑے کر کے اعلان کیا ہم صرف اسلام کے وفادار ہیں۔

یومِ اقبال پر ایک تقریر

اقبال پر اب تک جو لٹریچر چھپ کر سامنے آیا ہے، اس کا ہر کہیں اعتراف موجود ہے، اس کے تنوع اور وسعت میں بھی کلام نہیں۔ یہ کام ان کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت نمایاں پہلو یہ تھا کہ کلام اقبال کے بعض خفی پہلو ان کے ہمنشینوں یا یہ کہہ لیجئے کہ خوشہ چینوں کی بدولت جلی ہوتے چلے جا رہے تھے لیکن صورتحال کا یہ نقشہ زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ سانحہ یہ پیش آیا کہ جس وقت کلام اقبال کے خفی پہلو جلی ہونے لگے اور ہم نے ایک شاعر کے بجائے ان کے مفکر ہونے کے خصوصیتوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو بے شبہ مقامات اقبال کے فہم و ادراک کی شعوری راہ ابھر کر سامنے آ گئی، مگر جلد ہی یہ چیز طاق نسیاں پر چلی گئی کہ ان کا وقت آخیر آ پہنچا اور وہ دیکھتی آنکھوں، اپنے اللہ کے ہاں چلے گئے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ ان کی موت کے بعد ان کے شناسا نہ رہے یا وہ لوگ، زمانہ کی بدمذاقی کے ہتھے چڑھ گئے۔ جنہیں اقبال کی صحبتوں کا قرب نہ سہی اقبال کے مم کا قرب حاصل تھا۔ ظاہر ہے کہ جو بات بھی کہی جاتی ہے اس کے ادا شناس بھی اسی زمانے میں ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت جن لوگوں کو، انسانوں کے مذاق کی صحت کے لئے پیدا کرتی ہے یا جن اشخاص سے معاشرہ میں انقلاب لانا ہوتا ہے، خواہ وہ ذہنی انقلاب ہو خواہ جسمانی یا اسلامی لب و لہجہ سے قریب، یہ کہہ لیجئے کہ جن دماغوں سے قدرت تجدید و احیا کا کام لے رہی ہو، ان کے درد آشنا بھی ساتھ ساتھ اللہ کی ربوبیت کے سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور کوئی دور اس سے خالی نہیں رہا۔

اقبال کا دور جس وسعت سے تقسیم ہوا، اسی نسبت سے افراد کی ایک جماعت بھی ابھرتی چلی گئی۔ ہر بڑا آدمی جو اپنے ساتھ ایک مشن لاتا ہے، قدرت اپنی غیبی طاقتوں کی بدولت ایک جماعت بھی اس کے ہمرکاب کر دیتی ہے۔ جو حالات کی بھٹی میں سے کبھی کندن ہو کر نکلتی ہے اور کبھی اس درخت کے برگ و بار کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔

اقبال کی فکر کو زندگی ہی میں عروج کا راستہ مل گیا اور جب انہوں نے موت کا سفر اختیار کیا تو ان کے مقام شناسوں کی جماعت کا ایک حلقہ موجود تھا۔ گو اس حلقہ کے خطوط اس وقت تک ایک تصویر کی صورت اختیار نہیں کر پائے تھے۔ مگر اقبال کا ذہنی اثر خصوصیت سے ہندوستانی مسلمانوں میں یہاں تک راہ پا چکا تھا کہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے مختلف ادوار کی ایک پوری عصری تحریک، اقبال کا رنگ و روغن تسلیم کئے بغیر ادھوری

رہ جاتی ہے۔

میرے اپنے اندازے یا تجزیے کے مطابق ان کی بے وقت موت سے نقصان یہ ہوا کہ اقبال اپنے دماغی مجاہدات اور ذہنی مکاشفات کا جو سرمایہ اپنی نگرانی میں ابہام سے تفسیر کی طرف لانا چاہتے تھے اور جسے انہوں نے اپنی شاعرانہ دل آموزیوں کی رنگا رنگ نقابوں میں پیش کیا ہے کچھ تو حالات کی عمومی رفتار کے باعث ایک اور رخ کو نکل گیا اور کچھ یہ ہوا کہ سیاسیات کے وقتی بہاؤ نے بعض ایسی دیواریں اٹھا دیں کہ فہم و نظر کے دائرے کھلنے کے بجائے سمٹتے چلے گئے۔

ادھر یہ ایک دلکشا حقیقت ہے کہ تاریخ اسلامی میں شاذ ہی کسی مفکر کو زندگی اور موت کے درمیانی فاصلوں میں قبول عامہ کی یہ فراوانی حاصل ہوئی جو اقبال کے حصہ میں آئی، ان کی موت کے بعد تاریخ نے جب تیزی سے کروٹیں لیں اور برصغیر کے مسلمانوں نے بادیہ پیمائی کے ذوق میں جو وادیاں قطع کیں ان کی کہانی نتائج کے اعتبار سے ایک خاص مزاج رکھتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس مزاج نے اقبال سے عقیدت کا احاطہ کر لیا اور ہم اقبال کو حرم سے اٹھا کر میخانہ کی طرف دوڑنے لگے۔

بات کو سمجھنے کے لئے کہنا یہ چاہیے کہ اقبال کی موت کے بعد ہم نے اقبال سے عشق کے کوچہ میں قدم ضرور رکھا لیکن پتنگے کی طرح نہیں، بھونرے کی طرح ؎

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

غرضیکہ اقبال کے گردوپیش جذباتی قلعے اٹھتے چلے گئے۔ یہ قلعے، ان کی عمارتیں، ان عمارتوں کے مقیم اور ان کے قدم بہ قدم عسکریوں کا ایک خاص ہجوم، اتنے زاویے ہیں کہ ایک اچھی خاصی داستان امیر حمزہ مرتب ہو جاتی ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ دس سال میں اقبال پر جو کام ہوا ہے اس کا دو تہائی حصہ بے کار ہے تو ممکن ہے بعض علمی ماتھوں پر شکنیں ابھر آئیں۔ اور وہ پکار اٹھیں کہ "ایں چہ بو العجبی ست"۔ لیکن اقبال کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کارفرمایان ملت جو سیاسی اعتبار سے قد آور اور علمی لحاظ سے بونے ہیں۔ محض اپنے اغراض و مقاصد میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے اقبال کو ساتھ لے کر چلتے رہے ہیں بلکہ اس سے بھی صحیح چیز یہ ہے کہ یہ لوگ اقبال کے ساتھ نہ چلیں تو ان کی اپنی ہستی مخدوش ہو جاتی ہے۔ اور بعض حالتوں میں تو ان کا دور دور تک سراغ ہی عنقا نظر آتا ہے۔

یہاں یہ چیز شاید بے محل ہو مگر موضوع کی اہمیت سے حاشیہ کے طور پر عرض کرنا باقی ہے کہ اقبال ان معنوں میں سیاستدان نہیں تھے جن چہروں کو ہم اپنی زندگی کے روز مرہ میں طرحی شاعروں کے بے وزن مصرعوں کی طرح بکھرا ہوا پاتے ہیں۔ ان سیاستدانوں کے پہلو میں ایک عربی ضرب المثل کے مصداق دل ہی نہیں ہوتا۔ یہ کبھی تماشا اور کبھی تماشائی ہوتے ہیں۔ ان کی ذہنی سطح سخت ناہموار ہوتی ہے۔ یہ لوگ بظاہر خرام یار کی طرح دلفریب اور ریشمی آنچلوں کے مانند نرم ہوتے ہیں لیکن اصلاً ان کے خیالات ہی ان کے رقیب ہوتے ہیں۔ ان کی ہر شکن میں ایک دشنہ اور ہر آستین میں ایک خنجر چھپا ہوتا ہے۔ قوم کے معاملہ میں ان کا رویہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام عصری شہرتوں اور مسند آرائیوں کے باوصف جس حد پر ان کی موت واقع ہوتی ہے، اس حد سے ان لوگوں کی شہرت کا آغاز ہوتا ہے جن کے دماغ رحمت خداوندی کے کارخانے میں اہتمام سے تیار ہوتے اور زمانہ ان کی محراب عظمت میں اعتراف و تسلیم کی پیشانیاں جھکا دیتا ہے۔

اقبال کا ان ڈوبتے ابھرتے سیاستدانوں سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ ان کے ہاں اس قسم کے سیاستدان اگر کہیں نظر آتے ہیں تو ارمغانِ حجاز کی اس صحبت میں جو ابلیس کی مجلس شوریٰ کے زیر عنوان ترتیب دی گئی ہے۔

آیئے ایک لحظہ کے لیے اس مجلس شوریٰ میں شریک ہو کر بعض چہروں کو پہچاننے کی کوشش کریں۔

کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

ابلیس کہتا ہے اور اگر آپ لطف سخن کے طور پر ایک ثانیہ میری ہمنوائی کریں تو میں کہوں گا کہ ابلیس فرماتا ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرش اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

(مکمل نظم ارمغانِ حجاز میں بعنوان ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' دیکھیں)

یہ ایک ایسی نظم ہے جو سیاسیاتِ حاضرہ کے ہر گوشہ کی عکاس ہے۔ بعض لوگ بالخصوص اقبال کے ایسے شارحین، جن کے نقد و نظر پر سرکاری دوائر کے دوستانہ تقاضوں کی غلط بخشیوں کے سیم و زر کا گرد و غبار جما ہوا ہے۔ اس نظم کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے کے بجائے پرایا چہرہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نظم میں جن عوارض کی نشاندہی کے لئے اقبال کی نگاہیں اٹھی ہیں۔ وہ تمام شگاف اس عمارت کے در و دیوار میں نظر آ رہے ہیں۔ جو اقبال کی شرح و تفسیر کے لیے کھڑی کی گئی اور جس کے چند گوشے ہی ہماری شان صناعی کی ایک عمدہ کوشش ہیں۔

اب تک جو کوششیں سامنے آئی ہیں ان سے روح کے بجائے جسم، دماغ کے بجائے بازو، دل کے بجائے، پاؤں اور جڑ کے بجائے، تنے کے زیرِ عنوان بحث و نظر کا ایک میدان تیار ہو گیا ہے۔ نتیجۃً ہمیں عمارت کی بنیادوں کا حال معلوم نہیں کہ عمارت کا انحصارِ اصلی اسی پر ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ چونا کیسا ہے۔ گارا کیسا ہے۔ سفیدی کیوں کر ہے۔ اور مختلف رنگوں میں تناسب کا حدِ اوسط کیا ہے۔

یہ تمہیدی الفاظ، اسی غرض سے اٹھائے تھے کہ اقبال کے معاملہ میں گمراہیوں کا جو دفتر پھیلتا چلا جا رہا ہے اس کے تجزیہ و توسیع کے بعد اس پر بحث ہو کہ اقبال کا ہماری قومی زندگی کی تعمیر میں جو حصہ ہے اس کے مختلف مظاہر بہ لحاظ نتائج کیا ہیں۔ اور ہم نے اقبال سے کہاں کہاں راہنمائی حاصل کی ہے یا آئندہ عالمی معاشرے کو جو مسائل درپیش ہیں، اقبال ان مسائل سے کیونکر عہدہ برآ ہوتا ہے۔ مگر یہ مباحث اتنے سہل نہیں کہ اس مختصر سی صحبت کو اس سے سجا لیں اس کے لیے دل و دماغ کی یکسوئی کے ساتھ اظہار بیان کی ہم آغوشی بھی ضروری ہے۔

ملال یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اسلام کا نام لے کر اس کے فوائد سے جھولیاں بھر لیں اور معاملہ یکطرفہ رہا یعنی ہم اس کے عائد کردہ فرائض سے بھاگتے رہے اسی طرح ہم نے اقبال کی ذہنی فیاضیوں کا نام لیکر اقتدار بھی حاصل کیا اور اپنے یمین و یسار بیٹھنے والے ابوالفضلوں اور فیضیوں کو خشکہ بھی کھلایا مگر اقبال

ہمارے لیے ہمیشہ کی طرح اجنبی ہی رہا!

جب رات ہارون الرشید کے عہد کی یمنی لونڈیوں کی طرح اپنے سیاہ بالوں کے گجرے فتانہ افق کو پہنا دیتی ہے۔ ٹھیک اس وقت آپ اقبال کی تربت پر چلے جائیں تو آپ وجدان کے کانوں سے سن پائیں گے۔ جیسے اقبال کہہ رہا ہو......

چو رخت بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

(ہفت روزہ چٹان۔ ۵ مئی ۱۹۵۸ء)

افکار اقبال میں موسیقی کا تصور

بظاہر یہ ایک عجیب سا عنوان ہے لیکن میں نے اس مجلس کی رعایت سے یہ عنوان خود تجویز یا انتخاب کیا ہے۔ اس عنوان سے کئی پہلو نکلتے ہیں۔ مثلاً

(۱) اقبال کے افکار میں (جن سے بسا اوقات صرف ان کا کلام یعنی شاعری مراد لی جاتی ہے) موسیقی کا تصور کیا ہے؟ اور اس تصور سے معین مراد ہے شاعری میں غنا کی خوبیاں اور ان کا آہنگ! دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں موسیقی کے اجزا اور ان کی نزاکتیں یا لطافتیں کس حد تک پائی جاتی ہیں چنانچہ اس پر اقبال کے بعض ادبی نقادوں نے قلم بھی اٹھایا ہے۔ اور "کلام اقبال میں موسیقی" کے زیر عنوان اپنے قلم کی دھاک باندھی ہے۔ یا ان لوگوں نے ان کے کلام میں الفاظ کا زیر و بم اور عروضی بحروں کا حسن و جمال بیان کر کے اپنے موضوع کو استدلال کی بنیادیں مہیا کی ہیں۔

(۲) خود اقبال کے نزدیک موسیقی کا تصور کیا تھا وہ کس قسم کی موسیقی کے حق میں تھے۔ اور ان کی نظم و نثر میں اس بارے میں واضح خیالات کیا ہیں؟

یہ پہلو بھی اپنی دو شاخیں رکھتا ہے۔

اولاً بعض لوگ کلام اقبال (نظم و نثر دونو، نظم زیادہ نثر برائے نام) میں سے موسیقی کی ہر شاخ کا جواز پیدا کرتے اور ان کی سیرت کے ابتدائی عہد سے اس کے لئے جواز لاتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں جیسی قوم جو دماغاً قرآن و سنت کی پیرو ہے یہ بات بخوبی سمجھتی ہے کہ پیروان اسلام کے لئے قرآن حکیم کے اشارات، اور نبی اکرم ﷺ کی سنت مطہرہ کے سوا کسی فرد کا کوئی ذاتی قول بشرطیکہ وہ قرآن و سنت کی نفی کرتا ہو یا اس کا جواز قرآن و سنت میں نہ ہو یا اس میں ایسی روح موجود ہو جو قرآن و سنت سے متصادم ہو، کسی عنوان یا کسی پہلو سے بھی قابل اتباع نہیں اور نہ وہ اسے حجت قرار دے سکتے ہیں۔ اس بارے میں شاید ابھی تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا کہ اقبال نے فنون لطیفہ کے بارے میں کیا رائے دی ہے اور وہ کونسی بنیادیں تھیں جس پر وہ اپنے افکار کی عمارت کھڑی کرتے رہے، اسی ضمن میں موسیقی بھی آجاتی ہے لطف کی بات ہے کہ

موسیقی ہی کے عنوان سے حضرت علامہ نے اپنے خیالات کا اظہار نظم و نثر دونو میں کیا ہے چونکہ ان کے افکار کا زیادہ حصہ نظم میں ہے اس لئے موسیقی کے متعلق واضح طور پر ان کی نپی تلی رائے ان کے کلام میں موجود ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر بلکہ زیادہ تر انہی کے الفاظ میں نفس مضمون پر بحث کی گئی ہے۔

موسیقی؟ یہ کہ اس مجلس کے سبھی دوست جانتے ہیں فنون لطیفہ کے عناصر اربعہ میں سے ہے۔ اقبال نے فنون لطیفہ پر اجتماعاً اور اسکے عناصر اربعہ پر علیحدہ علیحدہ اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں اور یہ موضوع جس کو موسیقی تک محدود کیا ہے دراصل فنون لطیفہ کی ہر شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے مضمون میں ذرا وسعت پیدا کر لیں تو ہم خود محسوس کریں گے کہ شاعری، موسیقی، مصوری اور سنگتراشی اپنی ہیئت کے باعث ایک دوسرے سے الگ ضرور ہیں لیکن ان کی علیحدگی فراق کی علیحدگی نہیں ہے بلکہ وصال کی علیحدگی ہے۔ یعنی ہر سہ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں جس طرح حسن اپنے مکمل اظہار کے لئے بہت سی مختلف الاصل ادائیں رکھتا ہے یا جس چیز کو ہم شعر کہتے ہیں وہ لفظ و معنی کا مرکب نہیں ہوتا بلکہ اس میں کئی چیزیں سموئی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک اچھا شعر الفاظ و مطالب کی یکرنگی کے علاوہ تخیل اور اس کی گہرائی، اور تاثیر اور اسکی گیرائی بھی رکھتا ہے اور یہ سب اس قسم کے موثرات ہوتے ہیں جن سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ شاعری اور موسیقی میں تو ماں بیٹی کا رشتہ ہے اور اگر یہ استعارہ انوکھا معلوم ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں یا پھر ہم ردیف و قافیہ کے تعلق سے بھی مناسبت دے سکتے ہیں۔ یہ بھی قبول نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے صدیوں سے لازم و ملزوم ہیں ان کا اپنا بھی ایک وجود ہے لیکن ان دونو کے وجود سے بھی ایک وجود تیار ہوتا ہے۔ جس کو ہم الفاظ کے زمزمہ میں نہ بھی لا سکیں تو اس کو دیکھتے بھی ہیں، سنتے بھی ہیں، چکھتے بھی ہیں، اور چھوتے بھی ہیں اب اس کا انحصار حواس خمسہ پر ہے کہ ان میں موسیقی و شاعری کے ہم آغوش جمالیاتی پیکر کو دیکھنے، سننے، چکھنے اور چھونے کی صلاحیت کہاں تک ہے؟ مصوری و سنگتراشی کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں، مصوری کو جمال کہہ لیجیے سنگتراشی کو جلال، ان دونو کے مرئی طور پر ارتباط و امتزاج کا نام شاعری ہے اور جب شاعری ان سے ہم رشتہ ہو کر خوش آواز ہو جاتی ہے تو اس کو موسیقی، یا موسیقی کی معراج کہتے ہیں۔

اقبال نے فنون لطیفہ کے اس حسن و قبح کو تاریخی تجزیہ کے ساتھ اقوام و ملل کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہ صرف ایک اثباتی تنقید کی سان پر کسا ہے۔ بلکہ انہوں نے بکمال و تمام اس حقیقت کی نشاندہی بھی کی ہے کہ فنون لطیفہ اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے کس جادہ و منزل پر اپنے نتائج و آثار کی رو سے آب حیات ثابت

ہوتے اور کس مرحلہ ومقام پر اپنے برگ وبار کی رعایت سے زیر ہلاہل بن جاتے ہیں۔

اقبال کے بارے میں ہمیں ایک بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ وہ اسلام کے دلدادہ تھے۔ انہیں اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ قرآن وسنت کا پورا نظام ان کے سامنے تھا۔ وہ اس سے باخبر بھی تھے۔ اور جو کچھ ان کے علم وآگہی میں نہ تھا اس کے لئے متواتر جستجو کرتے رہے۔ انہوں نے سیکھنے سے کبھی اجتناب نہ کیا ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آخر وقت تک تحقیق وجستجو کے شیفتہ رہے انہیں ہر لحظہ حق کی تلاش رہی نتیجۃً ان کے کلام میں اسلام کے لئے اتنی تڑپ اور ولولہ موجود ہے کہ علم ویقین کی یہ دولت ان کے ہمعصر شعراء میں شاذ ہی پائی جاتی ہے۔ وہ اس باب میں اسلامی افکار واذہان کی معراج پر تھے۔ ان کے نزدیک اوامر وہی اوامر تھے جنہیں اسلام نے اوامر قرار دیا ہے اور نواہی وہی نواہی تھے جو اسلام کے نزدیک نواہی ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر معرکہ کو اسی ترازو میں تولا اور جو چیز اس ترازو میں تلنے کے بعد کھوٹی نظر آئی اس کو مسترد کر دیا

میں ان لوگوں کی اکثریت سے شدید اختلاف رکھتا ہوں جو اقبال کے بارے میں اپنے آپ کو حرف آخر سمجھتے ہیں لیکن اقبال ہی کے متعلق عجیب وغریب دو ذہنی کا شکار ہیں۔ میں ان لوگوں کی قسمیں نہیں گنوانا چاہتا اور نہ اس وقت میرے سامنے اس پوری جماعت کے خدوخال ہیں۔ مگر اس گروہ میں جو لوگ شامل ہیں ان میں ایک جماعت ان لوگوں کی ہے جو اقبال کے نام پر اپنے خیالات سجانا چاہتے ہیں۔ ایک طائفہ ان بزرگوں کا ہے جن کی ساری عمر اس میں بسر ہوگئی ہے۔ کہ اقبال یورپ کے کن حکماء وفضلاء کا خوشہ چیں تھا۔ ایک ٹولی ان اہل قلم کی بھی ہے۔ جو کلام اقبال کے اس حصے کو استعمال کرتے ہیں جو ان کی مرضی ومنشا کے مطابق ہو اور انکی خواہشوں کے مطابق نتائج پیدا کر سکتا ہو۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ کلام اقبال کا حسن استعمال ہے یا سوء استعمال، بہر حال کلام اقبال یا خود اقبال کے ان دوستوں یا پیروؤں، نقادوں یا مداحوں کی ایک بڑی تعداد علم وتنقید کے حلقوں میں موجود ہے اور وہ اتنی سی بات نہیں سمجھتی کہ علامہ کس مقام پر کیا کہنا چاہتے تھے۔ حضرت علامہ نے آل احمد سرور صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگر آپ پورے غور وتوجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے آپ انہی نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں۔ (اقبالنامہ جلد دوم ص ۳۱۴)

خود اپنے متعلق اقبال نے مثنوی اسرار ورموز میں واضح طور پر اقرار واظہار کیا ہے۔ یہ مثنوی کی آخری نظم ہے عنوان ہے عرض حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین ﷺ فرماتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است!
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن!
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس دعا وخواہش کے باوجود جس میں اقرار واظہار کی روح موجود ہے اگر دبستان اقبال کا کوئی عبقری، ادب کے نگارخانے کا کوئی نابغہ اور سرکاری توشہ خانہ کا کوئی دانشور، اقبال کے افکار کو یورپی علم وفلسفہ کے دسترخوان پر لے جاتا ہے۔ اور اس کو اصرار ہے کہ اقبال نے اپنے فن وحکمت اور اسلامی اصطلاح میں دعوت وتذکیر کے لئے قرآن وسنت سے باہر مستعار خیالات پر انحصار کیا ہے۔ یا اس کی کوئی سی بات جو اس کے ہاں بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن وسنت کی نفی پر ہے یا اس معاملہ میں اس نے اجتہاد کر کے مغربی فکر کا سانچہ تسلیم کیا ہے تو اس کا جواب خود کلام اقبال ہی سے دیا جا سکتا ہے ان افرنگ زدہ لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ،
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر

اپنے ایک خط میں جو آپ نے علامہ سید سلیمان ندوی (علیہ الرحمۃ) کو لکھا اور اقبال نامہ کے صفحہ ۱۲۹ پر موجود ہے۔ فرنگی معماروں کی ان عمارتوں کے متعلق فرماتے ہیں۔ "مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے"۔

جو کچھ اوپر عرض کیا اس موضوع سے قطع نظر جو اس گفتگو کی اصل بنیاد ہے یعنی کلام اقبال میں موسیقی کا تصور، یہ امر صاف ہوگیا کہ اقبال وہی سوچتے تھے جو سوچ اسلام نے دماغوں کو مہیا کی ہے اور وہی کہتے تھے جو اسلام کہلواتا ہے بالفاظ دیگر وہ قرآن وسنت کے علاوہ اسلام کی تاریخ وتجربہ اور اس بارے میں مسلمانوں کی طویل ذہنی وفکری جدوجہد سے آگاہی کی اساس پر ایک ایسے مفکر تھے کہ اس برصغیر میں تقریباً ڈیڑھ صدی سے ان کے پایہ کا انسان پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ بلاشبہ سوز وساز رومی اور پیچ وتاب رازی کا ایک انسانی پیکر تھے جس کو

مبدء فیاض نے نگہ بلند، سخن دلنواز اور جان پرسوز عطا کی تھی اور جو اپنے ہی الفاظ میں عجم کا حسن طبیعت اور عرب کا سوز دروں لیکر آئے تھے۔

ایک ایسے شخص سے جس کو فکر ونظر کی یہ رفعتیں ملی ہوں یہ خواہش کرنا یا اس کے افکار میں یہ تلاش کرنا کہ وہ فنون لطیفہ یا اس کی کسی شاخ کے متعلق اسلام کی مرضی ومنشا کے خلاف کوئی رائے دیگا، ناممکن ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام کا اپنا فن موسیقی ان معنوں میں کوئی نہیں جن معنوں میں کہ ہم اسلامی فقہ کہہ سکتے ہیں۔ ملفوظات اقبال میں ڈاکٹر سعید اللہ نے ان سے اپنی ملاقاتوں کا جو ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ کیا تھا، ان کی رائے میں۔

مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ رکھتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے۔ اور وجد وحال فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہیں۔ مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فن تعمیر کے سوا فنون لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔

(ذکر اقبال ص ۲۵۲۔ ملفوظات ص ۱۲۳)

اس موسیقی یعنی قوالی کے بارے میں ایک کھلا حملہ open Attack ارمغان حجاز میں موجود ہے۔ اور ارمغان حجاز علامہ کے فرمودات کا وہ مجموعہ ہے جو ان کی موت کے بعد شائع ہوا اور جس کے مندرجات ان کی اواخر عمر کے مشاہدہ ومطالعہ، یقین واثبات، ذوق وشوق، فکر ونظر، تجربہ وتوجہ اور سعی وجہد کا جامع اظہار ہیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کے ضمن میں پہلا مشیر کہتا ہے۔ کہ جس نظام کی بدولت عوام الناس خوئے غلامی میں پختہ ہوئے اور اس کی بنیادوں میں جو اینٹیں لگی ہیں۔ ان میں ایک بنیاد قوالی بھی ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم الکلام

لطف کی بات یہ ہے کہ یوم اقبال کی تقریبات میں نمایاں حصہ قوالی ہی کا ہوتا ہے اور وہ لوگ اس ضمن میں پیش پیش ہوتے ہیں جنہیں شاید فکر اقبال کے اس آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہو۔

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند باما آشنا بود!
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

ڈاکٹر سعید اللہ کا بیان ہے کہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ قوالی کی موسیقی میں جو گرمی ہے، وہ مصنوعی ہوتی ہے۔ جس طرح منشیات سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کرے اس ضمن میں وجد وحال کا بھی ذکر کیا۔ فرمایا

یہ بھی ایک دستور سا بن گیا ہے، یہ کیفیت واقعی طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے جوش جذبات کو اس طرح فرو کرتے ہیں تو پھر ان میں کچھ باقی نہیں رہتا اور نہ وہ جذبہ دوبارہ طاری ہوتا ہے۔

(ملفوظات صفحہ ۱۲۴)

اقبال کا خیال اس معاملہ میں یہ تھا کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود نہیں (ملفوظات صفحہ ۱۲۵ بروایت پروفیسر حمید احمد خاں) جیسا کہ اس سے پہلے ایک اقتباس میں آ چکا ہے۔ کہ وہ صرف فن تعمیر میں کسی قدر اسلامی چھاپ کے قائل تھے چنانچہ اندلس کی عمارتوں کا تجزیہ کرتے وقت وہ اسی نقطہ نگاہ کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جوں جوں قومی زندگی کے قوا شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا مثلاً اندلس کی تین عمارتوں کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ قصر زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا، اور الحمرہ محض مہذب انسانوں کا (ملفوظات ۱۲۵) دہلی کی مسجد قوت الاسلام کے متعلق انکے نقطہ نگاہ میں احساس وتاثر کی شدت ہے اس کا اظہار انہوں نے ضرب کلیم میں کیا ہے اور اسی کا نتیجہ ان کی اس پرتاثیر نظم کا یہ آخری شعر ہے۔

ہے مری بانگ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلمان کا سجود ؟

معاف کیجئے فن موسیقی کی جگہ فن تعمیر آ گیا ممکن ہے آپ نے یہ تاثر اخذ کیا ہو کہ اقبال ہر فن موسیقی کے مخالف تھے یا ان کے نزدیک اس کا وجود ناگوار تھا یا بعض شرعی بزرگوں کی طرح وہ اسکو قابل اعتنا ہی خیال نہ کرتے تھے۔ ان کے سارے کلام میں ایسی کوئی شرعی بنیاد نہیں، نہ وہ اس کو فنا کرنے کے حق میں تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں جو کچھ کہا ہے اس کا اجمال یہ ہے کہ موسیقی فرائض انسانی میں سے نہیں بلکہ فنون انسانی میں

سے ہے اور جس بات پر انہوں نے سختی سے تنقید کی ہے وہ موسیقی کے مضر پہلو ہیں جو کئی صدیوں سے معاشرہ انسانی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں ان مضرتوں کو ہم کئی چیزوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور اس کا اطلاق زندگی کے ہر گوشہ پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً انگور ہے اس سے گلوکوز بھی بنتا ہے جس سے مریضوں کو شفا ہوتی ہے، شراب بھی کشید کرتے ہیں، جس کے ام الخبائث ہونے میں کلام نہیں۔ عورت کو لیجئے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ مجھے تین چیزوں سے محبت ہے۔ نماز، عورت اور خوشبو، ذرا غور کیجئے کہ عورت کو نماز اور خوشبو میں بریکٹ کیا ہے۔ عبادت و نزاکت کی معنوی صفات پر سوچتے جایئے۔ آپ کے دماغ پر عجیب وغریب نکتے کھلتے جائیں گے۔ یہی حال قلم کا ہے۔ قلم سے ہم انصاف بھی کرتے ہیں اور ایسے احکام بھی قلم ہی سے صادر کئے جاتے ہیں جن کے خمیر وضمیر میں ظلم ہوتا ہے۔ غرض کوئی چیز اپنے وجود میں تخلیق کی رو سے بری نہیں ہوتی اس کو برا بنایا جاتا ہے۔ کبھی ماحول برا بناتا ہے، کبھی اس کا اپنا عمل اور کبھی اس کا استعمال، یہ ایک قاعدہ ہے جس کا اطلاق تقریباً ہر شے پر ہوتا ہے۔ موسیقی نوع انسانی کی مشترکہ زبان ہے اور اس کا حسن قدرت کی عالم گیر فیاضیوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بلکہ آواز خوش، درازی عمر اور بالیدگی روح کا وہ نسخہ کیمیا ہے جو بیاض قدرت میں بہمہ وجوہ سرفہرست ہے لیکن جس طرح ہم قدرت کے اور عطیات کے ساتھ مذاق کر کے اسکی آبرو کو مجروح کرنے کے مجرم ثابت ہوئے ہیں اسی طرح ہم نے سلیمان کی اس میراث کو شیطان کے حوالے کر کے شر و فساد کی ایک ایسی بنیاد رکھی ہے کہ موسیقی کی روح تبدریج نفس کو منتقل ہو گئی ہے۔ اقبال نفس کی اس موسیقی کے خلاف احتجاج کرتے رہے اور ان کے کلام کا حاصل کلام یہی ہے **تقدیر امم میں طاؤس ورباب** کی تلمیح اس موسیقی ہی کے زوال کا اشارہ ہے۔ ان کے نزدیک فطرت لبریز تگ ہے جلترنگ نہیں کیونکہ سرمایہ حیات خون دل وجگر کے آمیختہ کا نام ہے اور یہ آمیختہ جب کسی مغنی میں راہ پا جاتا ہے تو پھر عالم موسیقی ہی بدل جاتا ہے۔ ضرب کلیم میں اسی کی تصویر کھینچی ہے۔

آیا کہاں سے نالہ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے
دل کیا ہے اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے
کیوں اسکی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے
کیوں اسکی زندگی سے ہے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے در پے

کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنت روم و شام و رے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

اس ضمن میں ضرب کلیم کے وہ تین شعر بھی سن لیجئے جس سے ان کا موسیقی کے بارے میں نقطہ نگاہ صاف ہو جاتا ہے۔

وہ نغمہ سردیٔ خون غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موج نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبان لالہ چاک نہیں

(ہفت روزہ چٹان ۸۔ اگست ۱۹۶۶ء)

میرزائیت کی تاریخ سیاسی دینیات کی تاریخ ہے

چنیوٹ کے جلسہ عام میں آغا شورش کاشمیری کی تاریخی تقریر

ترتیب: حمید اصغر نجید

آغا شورش کاشمیری نے ہندوستانی نبوت کی پاکستانی پناہ گاہ ربوہ کے دامن اور شاہجہان فرمانروائے ہندوستان کے وزیراعظم سعداللہ خان کے مولد چنیوٹ میں سٹوڈنٹس سالڈریٹی آرگنائزیشن کے زیراہتمام ایک اجتماع عام کو خطاب کرتے ہوئے ڈھائی گھنٹہ تک ایک معلومات افروز تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ عنقریب ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیے جارہے ہیں۔ ذیل میں اس جامع تقریر کی ایک تلخیص پیش کی جارہی ہے۔ جن سے اقبالؔ اور قادیانیت کے ان پہلوؤں کی نشاندہی ہوجاتی ہے، جن کی اساس پر آغا صاحب نے اپنے خیالات قادیانی امت کے تجزیہ و تحلیل کی صورت میں پیش کیے۔ یہ اجتماع ۲۹ اپریل کی شام کو ہورہا تھا لیکن بارش کی وجہ سے اگلے روز صبح ۹ بجے پر ملتوی کردیا گیا۔ اس اجتماع میں دینیات و اقبالیات اور سیاسیات و عمرانیات سے شغف رکھنے والے لوگ ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ تقریر کا یہ عالم تھا کہ لوگ شامیانوں سے باہر دھوپ کی تیزی میں بھی گوش برآواز ہوکر کھڑے رہے اور آغا صاحب نے قادیانی جماعت کے بارے میں افکار اقبال کی روشنی میں جو نکات پیش کئے اس پر شروع سے آخر تک سر دھنتے رہے۔

جلسہ عام سے پہلے آغا صاحب نے شہریوں کی دعوت کے جواب میں ایک مختصر سی ادبی تقریر کی جس میں ان الفاظِ تہنیت پر اظہار تشکر کیا جو ان کے بارے میں سپاسنامہ میں استعمال کیے گئے تھے۔ شام کو آغا صاحب نے تنظیم طلبہ کے دفتر میں پرچم کشائی کی۔ اس موقع پر ”جاگ اٹھا ہے سارا وطن“ کی دھنیں بجائی گئیں۔ طلبہ نے گولے چھوڑے، نوجوانوں کے ایک زبردست ہجوم نے اخلاص و ارادت کا اظہار کیا۔ آغا صاحب نے سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا۔۔۔ ہمیں الفاظ کے استعمال میں محتاط رہنا چاہیے۔ اردو زبان چونکہ درباروں میں پلی ہے اس لئے اس کے مزاج میں ابھی تک عقیدت کی افسانوی بے بصری پائی جاتی ہے۔ اصلاً یہ ایک قسم کا ذہنی انحطاط ہے۔ جب تک اردو زبان میں سے عقیدت کے فالتو الفاظ اور درباروں میں کورنش بجالانے والے تصورات خارج نہیں کیے جائیں گے ہمارے لسانی مزاج میں حفظِ نفس کی روح پیدا

نہیں ہوگی۔ آغا صاحب نے کہا۔ سپاسنامہ میں میرے متعلق جن پرشکوہ اور پرجمال الفاظ میں اخلاص کا اظہار کیا گیا ہے۔ میں ممنون ہوں لیکن واقعتاً میں ان الفاظ کا مستحق نہیں، میں ایک انسان ہوں۔ بقول اقبال۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری

اس میں شک نہیں کہ میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خاں کی صحبت سے سالہا سال فیض اٹھایا اور فکرِ اقبال کے علاوہ نظرِ ابوالکلام سے ذہنی بالیدگی حاصل کی لیکن میں ان میں سے کسی کا ظل یا بروز نہیں۔ آپ نے غالباً اس لیے مجھے ان کا عکس قرار دیا ہے کہ آپ کے پہلو میں ”ظلی و بروزی نبوت“ کا کارخانہ چل رہا ہے۔ بہرحال میری خواہش یہی ہے کہ آپ الفاظ کے معاملہ میں احتیاط برتا کریں۔ بسا اوقات آج کے الفاظ کل کا روگ بن جاتے ہیں۔

۳۰ اپریل کے جلسہ عام میں آغا صاحب نے یوم اقبال کی تقریب میں قادیانیت اور اسلام کے موضوع پر جو نظریات اور تصورات پیش کیے۔ ان کا خلاصہ یہ تھا:۔

سب سے پہلے آپ نے منتظمین کی محبت کا شکریہ ادا کیا اور معذرت پیش کی کہ وہ چنیوٹ میں مسلسل دعوتوں کے باوجود نہ آسکے تو اس کی خاص وجہ کوئی نہ تھی صرف مصروفیتوں کی بوقلمونی اور مشغولیتوں کی بے پناہی مانع رہی۔ پارسال حاضر ہونے کا ارادہ تھا وعدہ بھی کرلیا تھا لیکن جیل خانے سے دعوت آگئی اور وہاں جانا پڑا۔ اب فرصت پیدا کرکے آج کی اس تقریب میں شمولیت کی ہے۔

تین اہم پہلو

آغا صاحب نے کہا۔

موضوع ہے۔ اقبال اور قادیانیت

اس ضمن میں تین گزارشیں ہیں۔

اولاً۔ میں جو کچھ عرض کروں گا پوری ذمہ داری سے عرض کروں گا۔ میری گذارش ہے کہ میرے ان خیالات کو میرے ہی الفاظ میں سی آئی ڈی کے ذمہ دار بھائی کا ملاً نوٹ فرمائیں اور ان کو مغربی پاکستان کے گورنر اور ان کی وساطت سے صدر مملکت کی خدمت میں پہنچادیں۔

ثانیاً۔ اگر ان میں سے کوئی چیز غلط ہو یا میں اس کا ثبوت نہ دے سکوں تو میں اس کے لیے تیار ہوں کہ مجھے

ہمیشہ کے لیے قید کر دیا جائے۔ ورنہ قادیانی امت کے اعمال وافکار پر کڑی نگاہ رکھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ان کے نہاں خانہ دماغ میں اپنے مسیح موعود اور مصلح موعود کی پیشگوئیوں کے باعث ایک ریاست کی خواہش مدۃ العمر سے مخفی چلی آ رہی ہے۔

ثالثاً۔ اگر قادیانی امت میں سے کوئی فاضل تیار ہو تو میں ان مباحث پر کسی بھی اجتماع میں گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جو نکات کہ اس تقریر میں پیش کر رہا ہوں فیصلہ سامعین کر لیں کوئی سا مصنف تسلیم کر لیا جائے یا پھر خود ان کا ضمیر اس امر کی توثیق و تردید کرے کہ جن حوالوں سے میں خطاب کر رہا ہوں وہ غلط ہیں یا صحیح؟ نتائج کے اعتبار سے آیا ان کے معنی وہی ہیں، جو میرے ذہن میں آئے ہیں یا اس سے مختلف تعبیر و تاویل بھی ہو سکتی ہے۔ قول کی تائید یا تردید ہمیشہ عمل کرتا ہے۔

بحث ہی غلط ہے

آغا صاحب نے فرمایا:

یہ بحث ہی غلط ہے کہ میرزا صاحب نبی تھے کہ نہیں؟ جو لوگ میرزا صاحب کی نبوت کا مفروضہ قائم کر کے نبوت کے مفہوم و مقصد پر بحث کرتے اور مناظرہ رچاتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ غلطی پر ہیں۔ سرور کائنات ﷺ کے مقابلہ میں پہلے کسی آدمی کو کھڑا کرنا، پھر اس کی تغلیط کرنا، ایک ایسا فعل ہے جس سے سوء ادب کا پہلو نکلتا ہے۔ رہا ظلی و بروزی کا سوال، تو قرآن و حدیث میں کہیں اس اصطلاح یا اس سے ہم معنی لفظ کا تصور تو ایک طرف رہا، قیاس تک نہیں ملتا۔ نہ عربی لغت میں اس غرض سے کوئی لفظ ہے اور نہ قرنِ اول کے دین و ادب میں اس کا وجود یا اس کی پرچھائیں کا نشان ہے۔

میں سمجھتا ہوں میرزائیوں سے خاتم النبیین کے لغوی، اصطلاحی یا قرآنی مفہوم پر بحث کرنا بھی بنیادی طور پر غلط ہے۔ مذہب کی بنیادی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ عقائد و اعمال کی جو دنیا پیش کرتا ہے اس میں ابہام و اہمال وغیرہ کا گزر تک نہیں ہوتا۔ وہ ہر بات کھل کے کہتا اور اس کی دعوت و تذکیر واشگاف الفاظ میں ہوتی ہے۔ اگر ظلی یا بروزی کسی نبی کے لئے اسلام میں کوئی نظریہ ہوتا یا اللہ کی رضا یہی ہوتی تو قرآن بول اٹھتا، احادیثِ نبوی میں بات آ جاتی۔ جس پیغمبر (فداہ امی وابی) نے زندگی کی ہر ضرورت پر احکام و قواعد مرتب کر دیئے ہوں اور امت کے پورے نظم و نسق کی بنیاد یں حشر تک استوار کر دی ہوں، کیا وہ نبی ﷺ ہم سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میری تعلیم کے احیاء کو وقتاً فوقتاً ظلی یا بروزی قسم کے نبی آتے رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ قرآن

و حدیث میں ایسا کوئی اشارہ یا کنایہ بھی موجود نہیں۔ رہ گیا خاتم النبیین کے معانی کا تصور تو اس پر اجماع امت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ قطعی ہے۔ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء اور صلحا سب کے سب حضور کی ختم المرسلینی پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے بعد کسی طرز کے نبی کی آمد کے قائل نہ تھے نہ انہوں نے کبھی اس باب میں کوئی خفی سے خفی کلمہ کہا یا اشارہ کیا۔ یہ تو ہوتا رہا کہ نبوت کے مدعیوں کو سزا ملتی رہی اور وہ مارے گئے لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ ان کے لئے کسی حلقہ سے کوئی تائید کی آواز اٹھی؟ یا کوئی حدیث سامنے آئی؟ یا قرآن کی کسی آیت کی تاویل کا بازیچہ بنایا گیا کسی نے کبھی اس کے جواز پر سوچا تک نہیں اور نہ ان مصنوعی نبیوں کی اولاد نے خلافت کا سوانگ رچایا یہ تنہا مرزا غلام احمد کی ذات ہے کہ برطانوی عہد میں ان کی نبوت قائم ہوئی۔ پروان چڑھی اسکو آب و دانہ مہیا کیا گیا۔ حتی کہ ایک باقاعدہ جماعت بن کر خلافت ہو گئی اور اب اس کے دماغ میں ایک سلطنت قائم کرنے کا خواب نقش ہو چکا ہے۔

اصل بنیاد

۱۔ میرزائیت کی اصل بنیاد دین نہیں سیاست ہے۔ اس کا مطالعہ دینی اعتبار سے نہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے کرنا چاہیے ان سے مذہبی بحث چھیڑنا ہی غلط ہے ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہیے جیسا کہ علامہ اقبال کا خیال تھا۔

۲۔ اگر ہم ٹیپو سلطان کی شہادت ۱۷۹۹ء سے لیکر بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری ۱۸۵۷ء تک کے احوال و وقائع پر نظر رکھیں تو ہمیں میرزا غلام احمد کی نبوت اور ان کے جانشینوں کی خلافت کے احوال و ظروف کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نیو رکھنے میں بالواسطہ اور بلاواسطہ کونسے عوامل و محرکات کا ہاتھ شامل رہا ہے۔

۳۔ انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت لے کر محسوس کیا جیسا کہ سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر یوپی نے کہا تھا کہ برطانوی عملداری کی راہ میں دو رکاوٹیں ہیں ایک محمد ﷺ کی تلوار دوسرا محمد ﷺ کا قرآن۔ محمد ﷺ کی تلوار کو تنسیخ جہاد کے نظریہ سے توڑنا چاہا۔ بعض مذہبی فرقے اور ان کے فتاویٰ ممد ہوئے۔ لیکن انگریزوں کو مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات سے اندازہ ہوا کہ مسلمان بہ الفاظِ اقبالؔ ایک ہی چیز سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ ربانی سند ہے۔ میرزا غلام احمد نے یہ فرض بکمال انجام دیا۔ جہاد منسوخ کیا۔ گویا اس طرح محمد کی تلوار کیلئے نیام بننا چاہا۔ خود کو محمد ﷺ کی مثل (خاکم بدہن) کہا اور اس طرح قرآن سے جہاد کی آیات ساقط کرنی چاہیں۔ نتیجۃً سرحد سے ملحق پنجاب کے قلب میں بیٹھ کر برطانوی شہنشاہیت کی

غلامی کے لئے الہامی بنیاد قائم کی۔ فی الجملہ میرزائیت سیاسی دینیات کا درجہ رکھتی ہے۔

۴۔ میرزا صاحب نے یہی نہیں کیا بلکہ اس عمارت کی نیو اٹھانے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی ذہنی زمین کو ہموار کرنا چاہا۔ آب وہوا کا رخ بدلا۔ غرض وہ مسلمان جو سلطان ٹیپو کے جہاد میں شعلہ جوالہ ثابت ہوئے تھے۔ جنہوں نے سراج الدولہ کے وجود میں تلوار کی آبرو رکھی تھی۔ جو بہادر شاہ ظفر کے عہد میں جنگ آزادی کا مواد لیکر اٹھے تھے۔ ان کے باقیات، سید احمد شہید کی تحریک اور اس کے برگ وبار جنگ امبیلہ کے نتائج واثرات، انبالہ، پٹنہ، راج محل، مالوہ اور پٹنہ میں علماء کے پانچ مقدمات، علماء کا شوق جہاد و شہادت سرحدی علاقے میں جہاد وغزا کی فراوانی ان تمام واقعات نے میرزا غلام احمد کے وجود کو برطانوی مصالح و مقاصد کی خاک سے اٹھایا اور وہ مسلمانوں کے مزاج کا رخ بدلنے میں منہمک ہوگئے۔

میرزا غلام احمد کی خصوصیات

انہوں نے مسلمانوں کو فضول مذہبی مباحث میں الجھا دیا۔ مثلاً

ا۔ برطانوی فاتحوں سے ہٹا کر برطانوی پادریوں سے الجھا دیا جس سے تلوار کی جگہ زبان نے لے لی اور جہاد کی امنگ سرد پڑ گئی۔ ذہنی زاویے بدل گئے۔

ب۔ آریہ سماجیوں سے اس طرز کے مناظروں کی نیو رکھی کہ دشنام کے جواب میں دشنام کا جھگڑا اٹھا اور میرزا صاحب کے جواب میں ستیارتھ پرکاش کے اس باب کا اضافہ ہوا جس میں قرآن و رسالت پر سب دشتم کیا گیا۔

ج۔ خلافت کے تصور پر بحثیں ہونے لگیں کہ یہ ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے یا کسی اسلامی ریاست کا فرمانروا، ان مسلمانوں کا بھی خلیفہ ہوسکتا ہے جو اس کی فرمانروائی کے علاقہ میں آباد نہ ہوں۔ حکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو اور وہ اس کی رعایا ہوں۔

د۔ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام۔

ر۔ اولی الامر منکم کی شرحیں

ہ۔ احادیث میں مہدی کے ورود کی پیش گوئی کا مطلب اور نوعیت۔

اس فضا کے پیدا ہوتے ہی انگریزوں کو استحکام سلطنت کا موقع مل گیا۔ مسلمانوں کے فکر و عمل کا میدان بدل گیا اور یہ ایک ایسی خدمت تھی جس کے نتائج واثرات ایک پراسرار و حیرت انگیز تاریخی دستاویز کا

درجہ رکھتے ہیں، جس سے برطانوی عہد میں مسلمانوں کی ذہنی ویرانی اور قومی بربادی کا پورا نقشہ معلوم ہوسکتا ہے۔

ارشادِ اقبال

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی سیاسی وحدت کو اس وقت نقصان پہنچتا ہے جب مسلمان سلطنتیں آپس میں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں اور مذہبی وحدت اس وقت ٹوٹتی ہے جب خود مسلمانوں میں سے کوئی جماعت ارکان واوضاع شریعت سے بغاوت کرتی ہے۔ میرزا نے مسلمانوں کی مذہبی وحدت کو شکستہ کیا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جب سیاسی وحدت منتشر ہو تو مذہبی وحدت ہی ملت کے وجود کو باقی رکھتی ہے۔ اب اگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ یہ کہتا ہے کہ دینی وحدت کے باغیوں سے رواداری برتی جائے اور صرف اس حیثیت سے کہ وہ اقلیت میں ہیں انہیں اجازت دی جائے کہ وہ ایک دینی وحدت کی ہر مقدس اینٹ اکھاڑتے چلے جائیں تو وہ اقبال ہی کے الفاظ میں دینی حسیات سے نہ صرف عاری ہے بلکہ پست فطرت بھی ہے، کیونکہ اس کو اس امر کا احساس نہیں کہ اس صورتحال میں الحاد، غداری اور رواداری، خودکشی کا درجہ رکھتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ایک یورپی دانشور کے الفاظ میں رواداری مختلف المعنی احساس وتاثر رکھتی ہے۔ مثلاً فلسفی کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ مورخ کے نزدیک غلط۔ مدبر کے نزدیک مفید، ہر نوع فکر وعمل کے انسان کے نزدیک کہ وہ ہر فکر وعمل سے خالی ہوتا ہے اس رواداری کی ہر شکل گوارا ہے۔ اسی طرح ایک کمزور آدمی کی رواداری ہے جو اپنے محبوب اشیاء اور بنیادی عقائد کی ذلت و رسوائی چپ چاپ سہے جاتا ہے۔

میرزائیوں کا وظیفہ حیات

اپنے معرض وجود میں آنے سے لیکر اب تک میرزائیوں نے بتدریج جو نقشہ قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ

ا۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے (بالخصوص وہ لوگ جو انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اور بوجوہ دین میں اخلاص نہیں رکھتے یا اس کو انسان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں) کو اس غلط دین پر لا کھڑا کیا کہ قادیانی بھی گویا مسلمانوں کے فرقوں ہی میں سے ایک فرقہ ہیں اور ان کی مخالفت بھی ملا ازم ہی کے برگ وبار میں سے ہے۔

ب۔ میرزائی من حیث الجماعت مسلمانوں کا ہر دینی و معاشرتی میدان میں مقاطعہ کرتے اور انہیں کافر تک سمجھتے ہیں مثلاً مسلمانوں کے ساتھ نماز تک نہیں پڑھتے ان کے جنازوں میں شریک نہیں ہوتے جیسا کہ چودھری ظفر اللہ خاں نے منیر انکوائری کمیشن کے روبرو قائداعظم کا جنازہ نہ پڑھنے کا اعتراف کیا لیکن سیاسی طور پر مسلمانوں سے الگ نہیں ہوتے صرف اس لیے کہ اس طرح سیاسی فوائد حاصل کرنے اور ملکی اقتدار حاصل کرنیکے مدۃ العمر سے آرزومند ہیں۔

پاکستان کے بعد

پاکستان بن جانے سے پہلے جب تک برعظیم آزاد نہیں ہوا ان کا جماعتی وظیفہ انگریزوں کی تائید اعانت کرنا رہا، پھر جب قومی تحریکیں مضبوط و مستحکم ہوگئیں تو یہ سیاسی پینترے بدلتے رہے۔ لیکن اپنی حیثیت کو لمحہ بھر کے لئے بھی ترک نہ کیا کہ ان کا وجود برطانوی حکومت کے آلہ کار کا ہے۔ ایک مرحلہ میں انہوں نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی استقبال کیا۔ مقصود بہ قول اقبال یہ تھا کہ بشیر الدین محمود اس انداز میں حکومت کے ہاں ٹنڈر داخل کر رہا تھا میں ناراض ہوں مجھے راضی کرو۔ اسی زمانہ میں ایک ہندو کانگری نے اس مطلب کا مضمون لکھا کہ قادیانی جماعت عام مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوستان کی زیادہ وفادار ہے کہ وہ پیغمبر عرب کی بجائے ایک ہندوستانی پیغمبر کی پیروکار ہے۔ غرض ان احوال وافکار اور واقعات وحالات کی گرتی ہوئی دیوار کے ملبہ سے اپنے سیاسی اقتدار کا قصر اٹھانے کی خواہش پیدا کی۔ میرزا غلام احمد نے جو خلیفہ سے زیادہ شاطر تھے۔ اس امت میں عصبیت پیدا کر کے حصول اقتدار کا ایک طویل منصوبہ تیار کیا، جس کی پشت پناہی کے لئے اپنے والد کے الہام اور اپنے القاء اور خواب وضع کیے۔

ہوا کیا؟

غور کیجیے کہ قادیانی جماعت جس نے کبھی تحریک استخلاص وطن کا ساتھ نہیں دیا۔ خلافت عثمانیہ کی تاراجی پر چراغاں کیا اور انگریزی حکومت کی اطاعت وجاسوسی اپنا جز وایمان سمجھا۔ ایکا ایکی اور اپنی زندگی میں پہلی دفعہ ۱۹۳۱ء میں کشمیری مسلمانوں کی آزادی کی علمبردار ہوگئی۔ برٹش میوزیم سے کبھی اس زمانہ کی سیاسی دستاویز ہاتھ آئیں تو یہ عقدہ کھلے گا کہ میرزا بشیر الدین محمود نے کن اغراض ومقاصد کے تحت یہ قدم اٹھایا تھا۔ ان کی پشت پر کون تھا اور یہ سارا ناٹک کس لئے رچایا گیا۔ کشمیر اور مسلمانوں کا ذہن کس طرف جا رہا تھا میرزا

بشیر الدین محمود کس مخفی اشارے پر مہرہ بن کر آگے آئے تھے؟ یہ ساری کہانی ایک طاقتور قلم کے انکشاف کی منتظر ہے۔

میرزا کی زبانی

تاریخ احمدیت جلد ششم مولفہ دوست محمد شاہد کے صفحہ ۴۳۵ اور ۶۷۹ پر بروایت میرزا بشیر الدین محمود مرقوم ہے کہ جماعت احمدی کو کشمیر سے دلچسپی کیوں ہے؟

اولاً:۔ کشمیر اس لئے پیارا ہے کہ وہاں تقریباً اسی ہزار احمدی ہیں۔

ثانیاً:۔ وہاں مسیح اول دفن ہیں اور مسیح ثانی (میرزا غلام احمد ناقل) کی بڑی بھاری جماعت اس میں موجود ہے۔

ثالثاً:۔ جس ملک میں دو مسیحوں کا دخل ہے وہ ملک بہر حال مسلمانوں کا ہے اور میرزا صاحب کے نزدیک مسلمان ان کے پیروکار ہیں۔ (ص ۶۷۹)

رابعاً:۔ نواب امام دین، جنہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گورنر بنا کر کشمیر بھجوایا تھا وہ اپنے ساتھ بطور مددگاران کے دادا (میرزا بشیر الدین محمود کے الفاظ میں) یعنی میرزا غلام مرتضیٰ کو باجازت مہاراجہ رنجیت سنگھ ساتھ لے گئے تھے۔

خامساً:۔ ان کے استاد جماعت احمدیہ کے پہلے خلیفہ اور ان کے خسر حضرت مولوی حکیم نور الدین کشمیر میں بطور شاہی حکیم کے ملازم رہے تھے۔ (صفحہ ۴۳۵)

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے

چنانچہ میرزا بشیر الدین نے 28 دسمبر 1956ء کے سالانہ جلسہ میں بروائت تاریخ احمدیت خدائی تصرف والقا کے تحت ایک عظیم الشان آسمانی انکشاف کرتے ہوئے فرمایا۔

"مایوس نہ ہوں اور خدا تعالی پر توکل کرو اللہ تعالی کچھ عرصہ کے اندر ایسے سامان پیدا کر دے گا۔ آخر دیکھو یہودیوں نے تیرہ سو سال انتظار کیا اور پھر فلسطین میں آگئے۔ مگر آپ لوگوں کو تیرہ سو سال انتظار نہیں کرنا پڑیگا۔ ممکن ہے تیرہ بھی نہ کرنا پڑے، ممکن ہے دس بھی نہ کرنا پڑے اور اللہ تعالی اپنی برکتوں کے نمونے تمہیں دکھائے گا"۔

(ص ۶۷۸) ماخوذ الفضل ۱۵ مارچ ۱۹۵۷ء

آغا صاحب نے نہایت شرح وبسط سے اس کا تجزیہ کیا کہ

قادیانی خلیفہ اس طرح گویا ریاست اسرائیل کے قیام کو انعام خداوندی سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے

پیروکاروں کو ان سے نسبت پیدا کر کے امید خوش لاتا ہے آغا صاحب نے علامہ اقبال کی اس دور اندیشی کا بھی ذکر کیا کہ آج سے تیس برس پہلے انہوں نے فرمایا تھا کہ

''احمدیت یہودیت سے قریب تر ہے''

آغا صاحب نے اس ضمن میں میرزائیوں کے مختلف الہاموں اور بشارتوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس ضمن میں بتایا کہ تاریخ احمدیت کی اسی جلد کے صفحہ ۳۹۵ پر خلیفہ اول کا انکشاف درج ہے کہ

ریاست کشمیر اور ہمالیہ کے دامن میں آباد مسلم آبادی کا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے کوہ ہمالیہ سے شروع کرتے ہوئے بلوچستان اور ڈیرہ غازی خان کے سب پہاڑی سلسلے گئے۔۔۔!

آغا صاحب نے اس حوالہ کے ساتھ اس امر کی وضاحت کی کہ کشمیر میں مسیح ''ربوہ کا انتخاب ''بلوچستان میں اراضی کی وسیع خریداری اور بشیر الدین محمود کے اس ضمن میں ایک اسٹیٹ قائم کرنے سے متعلق خطبات کو باہم گرملا کر پڑھیں اور سوچیں، تو بہت سی پہیلیاں خود بخود کھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ہمارے امراء وفضلا

آغا صاحب نے افسوس ظاہر کیا کہ جس ''نبوت'' کو اقبال نے سٹہ بازی سے تعبیر کیا تھا، ہمارے امراء وفضلا اس کے نتائج وعواقب پر غور نہیں کرتے۔ بلکہ بلاواسطہ اس کی معاونت کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس ''نبوت'' کی بدولت نہ صرف آخرت کی متاع ضائع ہو رہی ہے بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی ذہنی وحدت میں پاکستان اس لحاظ سے مشتبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا انحصار احمدیت کی سیاسی پخت وپز کے نتائج پر ہے۔ آغا صاحب نے اس ضمن میں ایک خاص نکتہ پر زور دیا کہ **عرب دنیا کو قادیانیت کا پورا پتہ چل جائے تو پاکستان کی** دینی آبرو کو گزند پہنچے گا اور اگر احمدیت **سیاسی اقتدار حاصل کر لے تو عرب یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ** اس نبوت، اس امت اور ان کی وساطت سے اس مملکت کو اسلام سے کیا نسبت ہے؟ جن عربوں نے عجمی فقہا کو تسلیم نہیں کیا وہ ایک ہندوستانی یا پاکستانی نبی پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں جس سے اسلام کے تصور حیات، اسلام کے تصور سیاست اور اسلام کے تصور وحدت کا پورا کارخانہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

آغا صاحب نے کہا قادیانی غیر عرب مسلمان ریاستوں کے مابین اپنے وجود سے ایک دوسری اسرائیلی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے حکومت کی اہم کلیدی اسامیوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ملک کی صنعتی ترقی پر اپنے تناسب سے بڑھ کر قابض ہیں۔ اکثر مالیاتی اداروں پر ان کا تصرف ہے اور ان

شعبوں میں کثرت سے داخل ہو چکے اور ہو رہے ہیں جن کے ہاتھ میں ملک کی حفاظت اور مدافعت ہوتی ہے۔

صدر ایوب سے گذارش

آغا صاحب نے فرمایا!

میں صدر مملکت سے گزارش کرتا ہوں کہ اس جماعت کی کڑی نگرانی رکھیں اور اس امر کی تحقیق کرائیں کہ

۱۔ کیا میرزائی اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں؟

۲۔ کیا یہ دوسرا اسرائیل اپنے وجود سے قائم کرنے کے متمنی ہیں؟

۳۔ ان کا علاقہ مغرب کی استعماری طاقتوں کے ساتھ تو نہیں؟ ان کے مشن مختلف ملکوں میں تبلیغ کرتے ہیں یا کچھ اور فرائض واحکام بجالاتے ہیں؟

۴۔ ان صراحتوں اور وضاحتوں کی موجودگی میں کیا یہ بات غور طلب نہیں کہ کشمیر سے ان کی دلچسپی اپنی ریاست قائم کرنے کے مفروضہ پر ہے۔

۵۔ جنرل گریسی نے کشمیر کے جہاد میں اولاً پس وپیش کیا۔ ثانیاً قائداعظم کے احکام سے اختلاف کیا۔ ثالثاً لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا لیکن تعجب ہے کہ کمانڈر انچیف افواج پاکستان کی حیثیت میں قادیانیوں کی فرقان بٹالین کو خوشنودی اور سپاس کا خط لکھا۔ یہ خط اس تاریخ احمدیت کے صفحہ ۴۷۶ پر درج ہے۔ کیا پاکستان میں مسلمانوں کی کسی بھی دوسری جماعت کی رضاکارانہ تنظیم کو آج تک یہ خصوصیت حاصل ہوئی ہے؟

۶۔ کیا یہ صحیح ہے کہ جولائی اگست ۱۹۶۵ء میں قادیانی جماعت کی طرف سے اس مفہوم کا پمفلٹ تقسیم کیا گیا کہ مسیح موعود کے پیروکار ہی کشمیر فتح کریں گے۔ یہ ان کے نبی اور مرزا بشیر الدین محمود کی پیش گوئی کو سچا کرنے کی ایک جسارت تھی؟

۷۔ کیا شاستری کی موت بھی میرزا غلام احمد کے الہامات کا حصہ قرار دی گئی اور اس ضمن میں پمفلٹ شائع کیا گیا۔ اس پمفلٹ کو خود دیکھا اور پڑھا ہے۔

۸۔ کیا یہ صحیح ہے کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے اپنی پیش گوئیوں کی اصل پر ڈاکٹر جاوید اقبال کی معرفت بیرون پاکستان سے ایک پیغام بھیجا تھا۔

آغا صاحب نے ان اشارات کو بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ جن لوگوں کی نمائندگی کرتے

ہیں ان کی طرف سے پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اور بھی کچھ ہو سکتا ہے لیکن میرزائی اپنی حکومت کسی علاقے پر قائم نہیں کر سکتے اور ہم نہ ان کی عیاریوں کو پنپنے کا موقع دے سکتے ہیں، البتہ صدر مملکت سے یہ التماس ضرور ہے کہ وہ اس فرقہ ضالہ کے سیاسی ہتھکنڈوں سے باخبر رہیں۔ جس جماعت کے پیرو کار محمد ﷺ عربی ﷺ کے مقابلہ میں ایک ''فرضی نبوت'' کے داعی ہو سکتے ہیں اور انہیں مسلمانوں کی قومی وحدت یا دینی عمارت کو نقب لگاتے ہوئے عار محسوس نہیں ہوتی وہ ان شواہد و نظائر کی موجودگی میں حکومت پاکستان اور صدر مملکت کے کب اور کہاں وفادار رہ سکتے ہیں۔ ان کی موجودہ شعار صدر مملکت کو جمہور المسلمین سے برگشتہ کرنا اور ان کے فعال عنصر کے خلاف ہتھیں جڑے کے مخبریاں گھڑنا ہے انہیں جو تحفظات اس وقت حاصل ہیں وہ ایک ایسا حصار ہے جس میں وہ محفوظ ہیں لیکن مسلمانوں پر اپنے ترکش کے زہر میں بجھے تیر چھوڑتے رہتے ہیں تا کہ کسی دن منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۸ مئی ۱۹۶۷ء)

اسلام ہی وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں

لائل پور میں یوم اقبال ـــــ

آغا شورش کاشمیری کا خطبہ

"علامہ اقبال کے نام پر جو کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ بالاستیعاب مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یار لوگوں نے اقبال کو اپنے مقاصد و اغراض کا محور بنا لیا ہے۔ سرکاری امداد خاص دوستوں کی جیب میں جاری ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو خواہ مخواہ اہل علم کے زمرہ میں شریک کر رکھا ہے۔ ان کی انجمن ہائے ستائش باہمی کے ارکان اقبالیات کے نام پر نہ صرف اپنی اپنی دوکانیں سجا کے بیٹھے ہیں۔ بلکہ اپنے افکار اقبال کے نام پر پیش کر رہے ہیں۔

پاکستان میں ابھی تک اقبال کے نام پر کوئی ایسی ثقہ کتاب نہیں چھپی ہے جس معیار کی کتابیں ہندوستان کے اہل علم و نظر کے قلم سے نکلی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر یوسف حسین کی ''روح اقبال''، مولانا عبد السلام ندوی کی ''اقبال کامل''، خواجہ غلام السیدین کی ''اقبال کا تعلیمی فلسفہ'' اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اقبال کے افکار و سوانح پر عربی تالیف جو دمشق میں طبع ہوئی ہے، ان کے مقابلہ میں جو کچھ ہمارے اہل قلم نے لکھا ہے وہ ادھورا ہے یا غیر مکمل یا پھر رطب و یابس۔

جن لوگوں نے یہاں اپنے آپ کو اقبال کا اجارہ دار بنانا چاہا اور ان سے رشتہ جوڑنے میں جانے کیا کیا راستے نکالے ہیں۔ ان کی اکثریت جھوٹی ہے۔ یہ لوگ اقبال کا مطالعہ کئے بغیر اقبال پر گفتگو کرتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اقبال کے موضوع پر بسا اوقات اقبال پڑھے بغیر تقاریر کی جاتی ہیں اور ان کے نام سے وہ افکار منسوب کئے جاتے ہیں جن کا ان کے افکار و نظریات میں سراغ تک نہیں ملتا ہے۔۔۔!''

یہ تھے وہ خیالات جو آغا شورش کاشمیری مدیر چٹان نے لائل پور کے اجتماع عام میں تقریر کرتے ہوئے ظاہر کئے۔ اس جلسہ عام کا انعقاد قاری محمد اکبر کی زیر صدارت ۲۸ اپریل کو حلقہ افکار اسلامی کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال میں ہوا۔ آغا صاحب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی اور پروفیسر عثمان غنی نے فکر اقبال کے مختلف پہلو بیان کئے مولانا حنیف ندوی نے اقبال کے تاریخی نظریے پر تقریر فرمائی، پروفیسر عثمان غنی نے ''اقبال کیا چاہتے تھے'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔

آغا صاحب نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کلام اقبال کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس عمارت کی بنیاد ان پانچ ستونوں پر ہے۔

(۱) خودی (۲) مشرق کی نشاۃ ثانیہ (۳) مغرب پر تنقید (۴) توحید و رسالت (۵) عشق کی پختگی اور عقل کی خامکاری، یہی کلام اقبال کے عناصر ترکیبی ہیں اور انہی پر ان کے فکر و نظر کی عمارت استوار ہے۔ افسوس کہ یوم اقبال ہو یا بزم اقبال مجلس اقبال ہو یا ذکر اقبال، اس وساطت سے جو کچھ سامنے آتا ہے، اس کا بہت بڑا حصہ کسی اہمیت یا افادیت کے قابل نہیں۔

چاہئے تو یہ تھا کہ علامہ اقبال اپنے افکار کا جو سرمایہ دے گئے ہیں ہم ان کی اساس پر فکر و نظر کی نئی نئی راہیں دریافت کرتے اور ان کے کام کو آگے بڑھاتے، انہوں نے بے شمار، موضوع تجویز کئے اور اکثر افکار و نظریات پر غور و فکر کی دعوت دیتے رہے لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ جو لوگ علم و نظر کے مدعی تھے وہ اس باب میں ناکام رہے ہیں اور اس کے وجوہ وہ خود ہی جانتے ہیں۔

آغا صاحب نے اس ضمن کے بعض تشنہ گوشوں کو بالصراحت پیش کرتے ہوئے کلام اقبال کے ان عناصر کی ترتیب وار شرح کی، آپ نے کہا یہ پانچوں جز ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں گویا کلام اقبال کے حواس خمسہ ہیں۔ ان میں سے کوئی عنصر بھی دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے فرمایا اقبال کے مجموعہ ہائے کلام میں جن اشعار کو انہوں نے باقی رکھا، وہ کل ۱۳۲۴۴ اشعار ہیں ان میں پراے اشعار جن پر گردلگائی ۸۲ ہیں۔ فارسی کے ۸۵۳۰ اور اردو کے ۴۶۱۵ اشعار ہیں، انہیں حسب فکر تقسیم کیا جائے تو خودی پر ۲۴۳۲ مغرب پر ۳۵۵۳ مشرق کی نشاۃ ثانیہ پر ۲۱۱۲ عشق و عقل پر ۲۰۴۲ اور توحید و رسالت و اسلام کے بارے میں ۳۰۰۲ اشعار ہیں۔ جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ان موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

خودی

آغا صاحب نے ترتیب وار تجزیہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ خودی کلام اقبال کی روح ہے۔ مراد ہے خودنگری، خودشناسی، عرفان نفس، اور تکمیل ذات اخودی جب افراد سے جماعت کو منتقل ہوتی ہے تو یہی چیز اناہو جاتی ہے۔ آغا صاحب نے اس ضمن میں اس شعر کی شرح کی۔

تری آبرو اسی میں تری زندگی اسی میں
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

مشرق کی نشاۃ ثانیہ

اس ضمن میں بیان کیا کہ اقبال کا سارا پیغام اصلاً مشرق کے لئے تھا اس لئے کہ وہ ایشیا کے انتشار اور مشرق کے انحطاط سے دل افسردہ تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مشرق کی سرزمین پر مغرب کا استیلاء واستیصال اس کی روح کو کچل چکا ہے اب یہ سرزمین جو پیغمبروں کا گہوارہ رہی ہے۔ اسی صورت میں نشاۃ ثانیہ حاصل کر سکتی ہے کہ اس کی خودی بیدار ہو کر جدوجہد و عمل کی راہ پر آجائے اور ذہنوں کا انقلاب جسموں کا انقلاب بن جائے وہ اسی بیداری کو اسلام کی ہمہ گیری کے لئے ناگزیر خیال کرتے ہیں۔

مغرب پر تنقید

آغا صاحب نے کہا کہ علامہ اقبال کے کلام کی روح میں سب سے زیادہ غیظ و غضب مغرب کے بارے میں تھا ان کا خیال تھا کہ مغرب کے مادی نظریوں نے انسان کو معنوی طور پر ہلاک کر ڈالا ہے۔ فرماتے تھے کہ تہذیب حاضر کو تباہ کر دینے ہی میں نوع انسانی بالخصوص مسلمانوں کی بھلائی ہے، چنانچہ اپنے کلام اور اپنے خطبات میں، مغرب کی دانش، مغرب کی تہذیب، مغرب کے علم، مغرب کی حکمت، مغرب کے اقتدار، مغرب کی تعلیم اور مغربی مفکرین کی شخصیتوں کے فکری تار و پود پر زبردست تنقیدیں کی ہیں وہ مسلمانوں کی قرآنی عصبیت کو مضبوط و مستحکم دیکھنے کے متمنی اور اس کے علاوہ ہر رطب و یابس کے شدید مخالف تھے۔

عشق و عقل

اس باب میں اقبال نے جو کچھ لکھا، وہ ڈھکا چھپا نہیں وہ عقل کی عیاری کے دشمن، اور عشق کی دلگدازی کے شیدائی تھے انہوں نے عشق کو عقل پر ہمیشہ فوقیت دی، ان کا عقیدہ تھا کہ عشق کے بغیر انسان مکمل ہی نہیں ہوتا ہے۔ عشق ہی وہ آگ ہے جو عقل کے خار و خش کو جلا سکتی ہے۔ ہر اعلیٰ نصب العین عشق اور صرف عشق کی طاقت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ عشق انسان میں شرف و مجد کی خصوصیتیں پیدا کرتا اور جادہ حیات پر منزل کی دھن کو تیز کرتا ہے ان کے نزدیک عشق سوز و ساز اور عقل پیچ و تاب ہے۔ بال جبریل میں انہوں نے مسجد قرطبہ کے عنوان سے جو طویل نظم کہی ہے اس میں عشق کا تذکرہ جس سوز و گداز سے کیا ہے۔ اس سے عشق کا پر جمال اور پر جلال چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ ان کے نزدیک عشق اصل حیات ہے اور موت اس کے لئے

حرام ہے، عشق ہر سیل کو تھام لیتا ہے۔ کیونکہ وہ خود ایک سیل ہے عشق کی تقویم ایک عصر رواں ہی نہیں، کئی بے نام زمانے بھی ہیں۔ عشق دم جبریل، دل مصطفیٰ، خدا کا رسول اور خدا کا کلام ہے۔ غرض عشق خلاصہ کائنات اور ساز حیات ہونے کے علاوہ مشیت ایزدی اور امر ربی ہے جس سے انسان کو لذت تسخیر حاصل ہوتی ہے۔ نتیجہ عشق آتش نمرود میں کود پڑتا اور عقل محو تماشائے لب بام رہ جاتی ہے۔

توحید رسالت اور اسلام

اقبال کو اسلام سے غیر متزلزل وابستگی ہے وہ توحید رسالت کی روح سے سرشار ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ توحید کے تصور اور رسالت کی راہنمائی ہی میں انسانی وحدت قائم ہو کر دوام حاصل کر سکتی ہے۔ وہ توحید میں شرکت اور رسالت میں مداخلت کو نا قابل معافی جرم سمجھتا ہے۔ اس اساس ہی پر اس نے ختم نبوت کے مسئلہ پر محکم دلائل قائم کئے ہیں، اس کے خیال میں نظریہ ختم المرسلین سے انکار یا بغاوت ایک خوفناک جسارت ہے، جس سے اسلامی وحدت فنا ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کو من حیث الجماعت دینی خسران کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

وہ عقل اور ایمان کو علم ہی کے دو پہلو خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک فکر کو حق کی آرزو، علم کو یقین کی آرزو اور عمل کو محکم اساس کی آرزو رہے تو معاشرہ صحت مند رہتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ کوئی نہیں۔ ان کے فکر و خیال کی جولاں گاہ میں یہ عقیدہ نقش ہو چکا تھا کہ شریعت کو امام شاطبی کے الفاظ میں پانچ چیزوں کی حفاظت مطلوب ہے۔

(۱) دین (۲) عقل (۳) نفس (۴) مال (۵) نسل اور یہ حفاظت صرف توحید و رسالت ہی کے ماخذ سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کے کلام کا لب ولہجہ یہ تھا کہ قومیں اپنی ہی روایات سے نشو و نما پاتی ہیں اور اسلام ہی وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں۔

آغا صاحب نے آخر میں اقبال کے ان اشعار و افکار کا جائزہ لیا جن پر ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار ہے اور جو مدۃ العمر سے مسلمانوں کی ذہنی سرگزشت کے خطوط کا عکس پیش کر رہے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان ۸۔ مئی ۱۹۶۷ء)

اقبال کے نام پر قائم شدہ اکادمیوں میں زیادہ تر وہ لوگ چھائے ہوئے ہیں

جن کا اپنا کوئی علمی وجود نہیں

جنہیں جاوید منزل کے بیرونی دروازے تک جانے کا یارا نہیں تھا!

وہ آج علامہ اقبال کے وارث کہلا رہے ہیں!

تاریخی مجلس نے لاہور کے پانچ بزرگ شہریوں کے ساتھ ہفتہ ۱۳ جنوری کی شام کو جو تقریب الفلاح بلڈنگ میں منعقد کی اس کی روداد خواجہ صادق کاشمیری کے قلم سے چٹان کے اسی شمارے میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔

حمید امکی سیکرٹری مجلس مذکور نے بہ اصرار آغا شورش کاشمیری کو مدعو کیا کہ مجلس کی طرف سے ان شخصیتوں کا شکریہ ادا کریں۔ شورش صاحب پہلے تو انکار کرتے رہے، آخر حاضرین کا اصرار انہیں پنڈال تک لے گیا۔

شورش صاحب نے کچھ تو کہنے کے تحت بہت کچھ کہہ ڈالا لیکن ایک چیز جو عجیب طرح محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ بعض چہرے لٹک گئے۔ ادھر شورش کاشمیری کا نام لیا گیا، ادھر دانشوروں کا رنگ فق ہو گیا۔ بالخصوص دو صورتیں اس طرح اتر گئیں جس طرح کوئی سہما ہوا کوا ہوتا ہے۔

ہم نے بہت چاہا، اترے ہوئے چہروں کی غایت معلوم ہو لیکن نہ ان چہروں ہی سے معلوم ہو سکا نہ شورش صاحب ہی بتا سکے۔ حالانکہ ہم نے اصرار بھی کیا اور کرید ابھی۔ نہ کسی اور گوشہ سے پتہ چلا کہ ابوالفضل کا چہرہ کس خوف سے ڈھیلا ہے اور فیض کے سینہ میں کون سا خنجر ترازو ہوا ہے۔ دونوں گویا ا جونق کا پودا تھے کہ شورش کاشمیری کے نام کی صدا سے مرجھا گئے۔ یوں بیٹھے رہے جس طرح محفل میں نہ ہوں یا کسی مسجع و مقفع عبارت میں ایکا ایکی جھول آ گیا ہو۔

شورش صاحب نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا!

یہ صحیح ہے کہ میں تاریخی مجلس کے بانی ارکان میں سے ہوں لیکن جو فرض حمید امکی نے میرے ذمہ لگایا ہے، ان کا ہے۔ وہ مجلس کے سیکرٹری ہیں اور اس قسم کے شکریے سیکرٹری ہی ادا کیا کرتے ہیں۔ بہر حال ان پانچ شخصیتوں کا جو یہاں پرانے لاہور کی نمائندہ ہیں اور جنہوں نے ہمیں گئے دنوں کی کہانی سنائی ہے انہی مختلف

خوبیوں اور اپنے طرز بود و ماند کی وجہ سے لائق تکریم ہیں۔

نعمت کدہ کے مہربنتا، ایک جیتی جاگتی شخصیت ہیں انکی وضعداری ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ مرحوم لاہور کی تاریخ ہیں۔ شیخ محمد اشرف نے جو کچھ بیان کیا ہمارے سیاسی و شخصی احوال و افکار کی جواہر مالا ہے۔ اس سے پہلے ہم، انکی بعض گوشوں سے واقف نہ تھے۔ بچا شمس الدین نے جو کچھ کہا ان کی نزہت سے بالا ہو گیا۔ اس میں بعض پہلو ایسے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ شیخ عبدالشکور باغ و بہار شخصیت ہیں۔ انہوں نے ہمیں ثقافتی اور ادبی میراث سے آگاہ کیا۔ میاں امیر الدین لاہور کی بزرگ ترین شخصیت اور شرافت و نجابت کی تصویر ہیں۔ جس ماضی کو بیان کیا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا اور نہ رخ زیبا لے کر ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں پچاس سال بلکہ ساٹھ ستر سال پہلے کے لاہور کی سیر کرائی۔ اس کے حدود سے آگاہ کیا، اس کی تاریخ سے واقف کرایا، اس کے نامور لوگوں کی روداد سنائی۔ غرض ان کی امروزہ صحبت کے باعث ہم دو اڑھائی گھنٹہ کی اس صحبت میں برسوں پہلے چلے گئے۔

ایک چیز جو مشترکہ طور پر کہی گئی وہ علامہ اقبال کے متعلق بعض روایتیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اس علامہ اقبال کو جانتے ہیں جس سے ہم ناواقف ہیں۔ ان میں دو بزرگ تو علامہ اقبال کے قرابت دار ہیں۔

آغا صاحب نے کہا۔ ان بزرگوں نے علامہ اقبال کے متعلق جو کچھ کہا اس سے میرا ذہن معاً ان لوگوں کی طرف منتقل ہو گیا جو آج اقبال کے نام پر اکادمیاں قائم کر کے سرکاری خزانے کی رقمیں اپنے ذوق یا اپنے دوستوں کی معاش پر صرف کر رہے ہیں۔ یہ اس مرد درویش کے نام پر ہو رہا ہے جس نے عمر بھر بارگاہ سلطانی کے طواف سے اجتناب کیا، دریوزہ گری کے رزق کو پرواز کی کوتاہی جانا۔ دارا و سکندر سے اس مرد فقیر کو اولیٰ سمجھا جس مرد فقیر کی ساری متاع بوئے اسد اللٰہی ہو۔ جس کا مطمح نظر یہ تھا کہ ؎

جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی

جس نے مرگھٹ کے کوے کو اس شاہین پر فضیلت دی جو "دست آموز شاہ" ہو۔

آغا صاحب نے اقبال کے نام پر ان اکادمیوں کے بزرجمہروں کی تصنیفات و تالیفات، مقالات و تجزیات کا اشارۃً ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"جن لوگوں کا اپنا کوئی علمی وجود نہیں، وہ آج اقبال کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا اقبال کے لنگوٹیے ہیں۔ مقصود ان کا یہ ہے کہ اقبال کے نام سے خود زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض جاوید منزل کے دروازے تک نہیں جا سکتے تھے لیکن اب اقبال کے صلاح کار اور مشیر خاص بنے ہوئے

ہیں۔ ان میں سے بعض یہ تاثر دیتے ہیں گویا وہ اقبال کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے رہے ہیں۔ کچھ فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کو انہوں نے فلاں فلاں مسئلہ میں فلاں فلاں مشورہ دیا تھا۔ ان نمک خوارانِ ذکر اقبال میں ایک صاحب یہی کہتے کہتے اٹھ گئے کہ جرمن زبان کے افکار عالیہ کا ترجمہ انگریزی زبان میں کر کے وہ اقبال کے حوالے کرتے تھے اور اقبال ان کا فارسی ترجمہ کر دیتے تھے، ایک صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ اقبال ان سے فارسی زبان کے آداب معلوم کرتے اور وہ ان کے فارسی کلام کی نوک پلک سنوارا کرتے تھے۔ کچھ لوگ اس خوشی میں مگن رہے کہ اقبال کا شین قاف درست نہیں تھا لہٰذا وہ درست کیا کرتے تھے۔ کئی ایک خلوت خانوں میں فرماتے ہیں کہ علامہ ان سے اردو محاورہ اور اردو روزمرہ میں راہنمائی حاصل کرتے رہے۔ بعض کا خیال ہے کہ لاہور کی پنجابی اردو کا جامہ سنوارنے میں وہ حضرت علامہ کے مشیر تھے۔ علی گڑھ کی زبان وہ لا کر دیا کرتے تھے دہلی کا لوچ وہ سکھاتے اور لکھنؤ کا حسن ان کی معرفت آتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو لوگ آج یہ باتیں کرتے ہیں۔ ان بزرگوں سے پوچھئے علامہ اقبال کے ہاں انہیں کبھی دیکھا گیا؟ جب تک علامہ حیات رہے ان دانشوروں کا کسی کتاب، خط یا تحریر میں بالواسطہ ذکر بھی موجود ہے؟ اور جو لوگ اقبال سے جتنا قریب تر تھے، آج ذکرِ اقبال سے اسی قدر محروم ہیں۔ اور یہ باتیں عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں اقبال سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ اس کے نام پر ان کی روٹیاں لگ گئی ہیں۔

اقبال نے خود فقر و فاقہ میں گزار دی لیکن آج ان کے نام پر ہر سال کئی لاکھ روپیہ انجمن ہائے ستائش باہمی کے ارکان اڑا رہے ہیں۔ انہیں اقبال سے نہیں، اس روپے سے محبت ہے جو اقبال کے نام پر ملتا ہے۔ اس طائفہ سے علم کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی جو دستر خوانِ حکومت کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں چبا کر عمر طبعی گزار رہا ہے۔

نعمت کدہ کے مالک مہربنتا کے خیالات کی تائید و تعریف کرتے ہوئے آغا صاحب نے کہا۔

داخلی امن کا مسئلہ ناگزیر ہو چکا ہے جس شوخ چشمی اور دیدہ دلیری سے غنڈہ عناصر لاہور کے نظم و امن کو خراب کر رہے ہیں۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ مسئلہ انتظامیہ کے لئے لمحہ فکریہ مہیا کرتا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ حالات کی خرابی اس طرح بڑھتی جا رہی ہے؟ غرض آغا صاحب کے رواں دواں تبصرے کے ساتھ یہ محفل برخاست ہو گئی۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء)

مظفر آباد میں یوم اقبال رحمۃ اللہ علیہ

خدا، انسان اور کائنات فکر اقبال کے موضوع ہیں — ڈاکٹر رضی الدین

ہندوستان کی تاریخ میں اقبال سے بڑا فلسفی شاعر کوئی نہیں، — ماہر القادری

اقبال کا فلسفہ خودی حکمتِ قرآنی سے استوار ہے — پروفیسر لطیف

اقبال مسلمانوں کی ذہنی سرگزشت مرتب کرنے کے خواہاں تھے — آغا شورش کاشمیری

۱۳ ماہ حال کو آزاد کشمیر کے صدر مقام میں بیادِ اقبال ایک اجتماع عظیم کو خطاب کرتے ہوئے آغا شورش کاشمیری مدیر چٹان نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ کلام اقبال کے ہر گوشہ کو محیط تھے، یہ اجتماع مظفر آباد گورنمنٹ کالج کی گراؤنڈ میں بزم فکر و دانش کے زیر اہتمام اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کراچی سے مدیر فاران جناب ماہر القادری اور راولپنڈی سے عبداللہ اورنٹیل کالج کے پرنسپل جناب لطیف الفت بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جناب لطیف الفت نے فلسفہ خودی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے قرآنی آیات سے خودی کے مفہوم و منشا کو نہایت دلکش پیرائیہ میں واضح کیا۔ حضرت ماہر القادری نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو خراج ادا کرتے ہوئے مختلف اشعار کی تشریح و تعبیر سے اس نکتہ کو نمایاں کیا کہ اقبال نے ہماری شاعری کو نیا آہنگ، نئی فکر، نیا ولولہ، نئی تحریک اور نیا نسب ہی عطا نہیں کیا، بلکہ اس کی ہیئت ہی بدل ڈالی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اقبال سے بڑا فلسفی شاعر کوئی نہیں اور ان کا فلسفہ صرف اور صرف اسلام ہے۔

آغا شورش کاشمیری نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا کہ جناب لطیف الفت اور حضرت ماہر القادری کو بزم فکر و دانش نے موضوع تجویز کیے تھے۔ لیکن مجھے کسی موضوع پر تقریر کے لیے نہیں کہا گیا۔ میرے لئے گویا اقبال کا ہر موضوع عنوان ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صحبت میں اقبال کے ہر پہلو پر بکمال و

تمام اظہار خیال ناممکن ہے۔ وہ ایک ناپید کنار سمندر ہیں۔ ان کے فکر کا واقعۂ کوئی کنارہ نہیں۔ وہ بے کنار ہیں۔ ان کی ہر موج ایک دریا ہے اور یہ میرے بس سے باہر ہے کہ میں اقبال کے فکر یا ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر ایک ہی صحبت میں اظہار خیال کروں۔ میں نے اقبال کے تمام پہلوؤں کا سیر حاصل مطالعہ ضرور کیا ہے لیکن کسی ایک موضوع پر تو اس ایک صحبت میں کماحقہ بات نہیں ہو سکتی ہے۔ تمام گوشوں پر سر اختا کچھ کہنا دشوار ہے۔

آغا صاحب کی تقریر اتنی متنوع تھی کہ خیالات کے مختلف دھارے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے بہے چلے جا رہے تھے۔ ان کی طبیعت علیل تھی۔ لیکن آن واحد میں انہوں نے آورد سے آمد کا نقشہ جما لیا تھا۔ اقبال کے ہر پہلو پر اشارات و کنایات سے روشنی ڈالتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ انہوں نے اقبال کے بہت سے موضوعات اور ان کی شخصیت کے ارتقا پر اپنے خاص انداز میں تبصرہ کیا اور سوا دو گھنٹے بے تکان بولتے رہے۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے صدارتی تبصرہ میں فرمایا کہ جو کچھ مجھے کہنا تھا اس کا بڑا حصہ شورش صاحب نے اپنی مرصع تقریر میں کہہ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ شورش صاحب کو شکایت تھی کہ ان کے لیے موضوع تجویز نہیں کیا گیا لیکن جو کچھ انہوں نے کہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک دریا ہیں الفاظ و معانی کے شناور!

ڈاکٹر صاحب نے خودی کے فلسفہ کی علامہ ہی کے اشعار سے شرح کی اور بتایا کہ ان کا کلام، ان کا پیام بھی ہے اور اس کی تشریح بھی۔ شورش صاحب نے عقل کی نارسائی اور عشق کی پختگی پر جو تبصرہ کیا ڈاکٹر صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اقبال عقل کے مخالف نہیں تھے۔ لیکن جس عقل کے وہ قائل تھے، وہ انسانی دماغ پر غور و فکر کے راستے کھولتی اور فہم و تدبر کی راہیں اجالتی ہے۔ البتہ عقل مستعار کی بہ نسبت کہ اس سے دماغ گمراہ ہوتے ہیں، وہ ایمان کامل کی دعوت دیتے تھے۔ کہ ان کے نزدیک عقل کی معراج یہی ہے۔ عقل کی معراج صداقت سے ہے۔ صداقت کا منتہٰی عشق ہے۔ کہ فرد و جماعت میں جد و جہد کی لگن پیدا ہوتی اور انسان، خدا، کائنات کے مابین جو دیواریں عقل محض نے کھڑی کی ہیں اس سے ٹوٹتی ہیں۔

آغا صاحب کی تقریر کے بنیادی نکات یہ تھے۔

ا۔ علامہ اقبال نے شاعری کے روپ کو اپنا پیام قرار دیا لیکن یہ اس لئے کہ ان کی لے کا آغاز اس سے ہوا تھا۔ دوسرے قوم کے مزاج کو اجتماعاً مخاطب کرنے کے لیے اس مرحلہ میں اس سے بہتر کوئی طریق و اسلوب نہیں تھا۔ جو لوگ داعی ہوتے ہیں، وہ قوم کے مزاج، زبان اور قلب کے محرکات و موثرات کو ضرور ملحوظ رکھتے ہیں۔ جہاں تک محض شاعری کا تعلق ہے، اقبال بانگ درا کے بعد اس سے انکار ہی کرتے رہے ہیں۔

حتی کہ میر امم علیہ الرحمۃ سے فریاد کرتے ہیں۔

من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

۲۔ علامہ اقبالؒ فرماتے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی سرگزشت کے احوال و آثار اور نتائج و افکار معلوم کرنے کے لئے ہمیں بادشاہوں میں سلطان ٹیپوؒ، شعر میں مرزا عبدالقادر بیدل، صوفیاء میں حضرت مجدد الف ثانی اور علماء میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سوانح اور تعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ آغا صاحب نے اسکا تاریخی تجزیہ کیا اور بتایا کہ اس برعظیم کے مسلمانوں کی پوری سرگزشت ان کے مطالعہ سے سامنے آجاتی ہے۔

۳۔ آغا صاحب نے تیسرا اہم نکتہ جو بیان کیا۔ اقبالیین کا وہ رویہ ہے جس کے تحت وہ افکار اقبال کے اس حصہ پر گفتگو کرتے ہیں جو ان کے حسب منشا ہے لیکن جس سے ملت اور دین نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔ آغا صاحب نے کہا کلام اقبالؒ میں سے کسی حصے کو کسی بھی شخص کو منسوخ کرنے کا حق و اختیار نہیں۔ جو لوگ کلام اقبال میں اس خیانت مجرمانہ کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ اقبال سے مخلص نہیں۔ بلکہ اپنے اغراض کے تابع گویا مخلص منافق ہیں۔

۴۔ آغا صاحب نے کلام اقبال کی بنیادوں پر شگفتہ لہجہ میں تفصیلی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا (۱) خودی اور (۲) عشق دو ایسے عنصر ہیں جس سے (۳) اتحاد ایشیا کی راہ کھلتی ہے اور اس راہ کو کھولنے کے لیے (۴) تنقید مغرب لازم عنصر ہے اور یہ عناصر اربعہ اس وقت ایک جسم واحد ہو سکتے ہیں جب اسلام کو ایک راہنما دین کی حیثیت سے من وعن قبول کر لیا جائے۔

۵۔ آغا صاحب نے اقبال کی شاعرانہ خصوصیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض دوسرے شعراء کا بھی ذکر کیا۔ بالخصوص جگر، فانی، اصغر، اختر شیرانی وغیرہ کے متعلق بعض دلچسپ وضاحتیں کیں۔ غرض! آغا صاحب کی یہ تقریر افکار کی بوقلمونی اور خیالات کی روانی کا ایک رتع تھی۔ کہ خود راقم الحروف اس میں کھو گیا تھا۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۲ مئی ۱۹۶۷ء)

مختصرات

امانت اللہ بیگ

مسٹر اے کے بروہی ڈاکٹر سید حسین نصر کے متعلق تعارفی تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے زور دیا کہ اردو میں بولیں، انہوں نے عذر کیا، لوگوں نے اصرار اور تیز کیا۔ ادھر بروہی، ادھر عوام۔ آخر مرکزیہ مجلس اقبال کے سیکرٹری آغا شورش کاشمیری نے کھڑے ہو کر اعلان کیا:

حضرات! مہمانِ عزیز کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنے کے لئے بروہی صاحب انگریزی بول رہے ہیں تا کہ صدرِ تقریب کو معلوم ہو کہ ان کے بارے میں ہمارے جذبات کیا ہیں اور ایران کے متعلق پاکستان کس قدر دوستانہ و مخلصانہ خیالات رکھتا ہے۔ لہذا انگریزی تقریر سن لیں۔

حاضرین مطمئن ہو گئے۔ بروہی صاحب نے تعارف کے علاوہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جانے کس موڈ میں آپ نے فرمایا!

۱۔ مجھے سندھی ہونے کی وجہ سے سندھی زبان پر اسی طرح فخر ہے جس طرح آپ کو اپنی زبان اردو پر۔

۲۔ اقبال نے پاکستان کا نقشہ تیار کیا اور یہی اصل کام تھا۔ جہاں تک عمارت کا تعلق ہے وہ تو کوئی معمار بھی تیار کر سکتا تھا۔

خیریت گزری کہ صرف اردو جاننے والے سمجھ نہ سکے اور انگریزی پڑھے لکھے حضرات مضبوط قوت ہاضمہ رکھتے تھے۔ ورنہ بروہی صاحب کو ایک اور مقدمہ پیش آجاتا۔ بہر حال ایک زبردست احتجاج کو محسوس کرتے ہوئے آغا شورش کاشمیری نے جلسہ کے اختتام پر کہا!

۱۔ بروہی صاحب نے سندھی کو اردو کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ سندھی اور اردو ہم پایہ ہیں یا انہیں سندھی پر اسی طرح فخر ہے، جس طرح ہمیں اردو پر فخر ہے۔ پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔ اس فخر کے مقابلہ میں سندھ والے سندھی پر فخر کر سکتے ہیں لیکن اردو ہماری قومی زبان ہے اور سارے پاکستان کا سرمایہ فخر ہے۔ پھر یہ محض پاکستان ہی کی ملی زبان نہیں، بلکہ آج اسلام کی دوسری بڑی زبان ہے۔ عربی کے بعد اسلام کا بہت بڑا ادبی، علمی، اور تہذیبی سرمایہ اس میں منتقل ہو چکا ہے۔ علاقائی زبانوں کا فتنہ بھی سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کا پیدا کردہ ہے جو پاکستان کے ذریعہ اظہار و ابلاغ کو تاراج کر کے مسلمانوں کی ملی

وحدت کو علاقائی تعصبات سے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ تا کہ جس زبان کے لٹریچر نے مسلمانوں کے ملی وجود کو سہارا دے رکھا ہے وہ علاقائی زبانوں کے دشنہ و خنجر سے ہلاک ہو جائے۔ آخر میں آغا صاحب نے بروہی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے داغ کا یہ شعر پڑھا۔

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن بھی آتا بزبانِ اردو

۲۔ اقبال نے نقشہ تیار کیا۔

آغا صاحب نے کہا!

اس میں کیسے شک ہو سکتا ہے جب تک پاکستان اور اسلام اس کرہ ارضی پر باقی ہیں، اقبال کا نام جگمگاتا رہے گا۔ لیکن اس حقیقت کو بھی ابدالآباد تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے پاکستان بنایا۔ وہی اس کے موسس ہیں اور تاریخ کی جبیں ہمیشہ ان کی محرابِ عظمت میں جھکی رہے گی۔

اقبال نے نقشہ بنایا۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ لیکن قائد نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ قوم ان کی مرہونِ احسان ہے۔ (تالیاں اور مسلسل تالیاں)

پارسال آنجہانی وزارت کے ایں جہانی وزیر نے یوم اقبال کو اپنے گماشتوں کی معرفت سبوتاژ کرنا چاہا تھا۔ اس کے بعد آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان کا دورِ ابتلا شروع ہوا۔ وہ کوئی دس ماہ تک ڈیرہ اسمٰعیل خان سنٹرل جیل اور کراچی سنٹرل جیل میں محبوس رہے۔ ہفتہ وار چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا۔ چٹان پریس پر تالے لگا دیے گئے۔ وغیرہ۔۔۔

آغا صاحب نے اشارۃً اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا!

وزیر ہمیشہ کے لیے اسنا غفیل ہو گیا۔ فقیر جہاں پارسال کھڑا تھا، آج بھی وہیں کھڑا ہے۔۔

اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال سے پہلے عبدالشکور بیدل نے کلامِ اقبال سنایا۔ آغا صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو دعوت دیتے ہوئے برجستہ کہا!

''حدی خوانی ہو چکی، اب مرکزیہ مجلس اقبال کے سرخیل، ناقۂ نگارش لے کر آ رہے ہیں۔ تا کہ آپ محمل خطابت سے لیلائے تخیل کے حسنِ بے محابا کو دیکھ سکیں۔ (تالیوں کی گونج)

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ء)

اقبال اور میر کے تصورِ عشق کا بنیادی فاصلہ

بزمِ ادب انجینئرنگ یونیورسٹی کے اجلاس میں آغا شورش کاشمیری کی تقریر

تحریر:۔ مشیر کاظمی

آغا شورش کاشمیری نے ۲۷۔ اپریل کو ساڑھے آٹھ بجے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کی بزمِ ادب کے اجلاس سے خطاب کیا۔ ایک تماشائی کی حیثیت سے میں بھی شریک اجلاس تھا۔ انجینئرنگ کالج اور بزم ادب میرے ذہن کے مطابق اجتماع ضدین تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔۔۔۔ ایں چیست؟ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ طلبہ میں ادبی ولولہ اور دینی امنگ ضرور ہے۔ کیونکہ جن طلبہ نے اقبال کی شاعری پر مقالات پڑھے۔ ان مقالات میں اسلامی فکر کا اثباتی پرتو ضرور تھا۔ اجلاس میں بھی بعض طالبات اور کئی ایک طلبہ نے مقالات نظم ونثر پڑھے، ایک دو مہمانوں نے تقریریں کیں۔ طلبہ کا مذاق وہی تھا جو ہمیشہ اس عمر میں ان کا روایتی شعار ہو چکا ہے۔ مثلاً

(۱)۔ آوازے کسنا اپنا تعلیمی حق سمجھتے ہیں۔ (۲)۔ کوئی فقرہ چست ہو یا نہ ہو لیکن شاعر یا مقرر کو طلبہ پھبتیوں سے ضرور نوازتے ہیں۔ (۳)۔ طلبہ کی جزاک اللہ بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ (۴)۔ طلبہ مقرر یا شاعر کو تالیاں پیٹ کر اشارہ یا انتباہ کرتے ہیں کہ بیٹھ جاؤ۔ (۵)۔ ان کے لیے کبھی کبھار رکاکت وابتذال ہی فصاحت وثقاہت ہوتے ہیں۔ طلبہ کی ایک ٹکڑی نے ہر شاعر اور ہر مقرر کو نوازا لیکن مقرر و شاعر بے نیازانہ اپنی بات کرتے رہے اور جب تک ان کا مقالہ، تقریر یا نظم ختم نہ ہوئی، اسٹیج نہ چھوڑا۔۔۔۔ آغا شورش کاشمیری تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک سناٹا چھا گیا۔ میں اس سوچ میں تھا کہ طلبہ ان سے بھی فیاضی طبع کا سلوک کرتے ہیں یا اپنی لے بدل کر گوش بر آواز ہو جاتے ہیں۔ میں نے آغا صاحب کو بڑے بڑے مجمعوں کو اکائی میں بدلتے اور ان کے شور و شغب پر قابو پاتے بلکہ حریفان فرومایہ تک کو زیر کرتے دیکھا ہے۔ لیکن یہ مجمع نوجوان طلبہ کا تھا جو عمر کے اعتبار سے خوش طبیعت ہوتے ہیں اور منچلا پن ان کے سن و سال کا خاصا ہوتا ہے۔ وہ کسی کی ہتک کرنے سے زیادہ اپنا دل بہلاتے ہیں۔ آغا صاحب نے اس خوبصورت انداز سے آغاز کیا کہ طلبہ سراپا گوش ہو گئے۔ آغا صاحب کی تقریر تعلیم و تربیت، اخلاق و ادب اور احترام کے موضوع پر تھی اور یہ موضوع طلبہ کی

روش سے پیدا ہوا تھا۔ آغا صاحب نے کہا طالب علمی کا زمانہ تجربے کے اعتبار سے پختگی کا زمانہ نہیں ہوتا لیکن یہی زمانہ ہوتا ہے جب نئی پود سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ اور ان سانچوں میں ڈھلے ہوئے انسان بقدرِ استعداد مستقبل کے وارث ہوتے ہیں۔

آغا صاحب نے کہا یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ طلبہ ضرورت سے زیادہ آزاد ہو گئے ہیں۔ اور ان کی آزاد خیالی کا نتیجہ تفرقہ و انتشار ہے۔ وہ آپس میں کئی دھڑوں کا شکار ہیں۔ اس فضا کا بہر حال احترام نہیں کیا جا سکتا کہ طلبہ تعلیمی اداروں کو تو تکار کا گھر بنائیں۔ تعلیم کی عظمت، تربیت کی رفعت، اخلاق کا علو اور ادب کے حدود طلبہ کے عناصر اربعہ ہیں۔ اگر ان کا وجود ان سے خالی ہے اور وہ متانت سے محروم ہیں یعنی ہر چیز کو ہنسی مذاق میں لیتے اور اقدارِ زندگی سے ٹھٹھول کرتے ہیں۔ تو اس میں نہ صرف ان کا ذاتی نقصان ہے۔ بلکہ ملک و ملت کا مستقبل خراب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک غیر سنجیدہ پود کبھی توانا مستقبل پیدا نہیں کر سکتی۔ آغا صاحب نے طلبہ سے کہا، مجھ سے پہلے آپ مہمان مقرروں یا شاعروں کے ساتھ جو لطیفہ بازی کر رہے تھے وہ کسی لحاظ سے بھی آپ کے شایانِ شان نہ تھی۔ مہمانوں کو بلاتے تو ان کی عزت کرتے ہیں نہ کہ انہیں تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔

آپ نوجوان اس ملک کے وارث اور اس قوم کا مستقبل ہیں۔ اگر خام مال عمدہ نہ ہو تو اس سے کوئی پختہ چیز تیار ہو سکتی ہے۔

ایک طالبہ نے اقبال کے **تصور عشق** پر مقالہ پڑھا تھا۔ آغا صاحب نے طالبہ کے عمدہ تلفظ، شستہ لہجے اور مقالہ کے برجستہ ہونے کی تعریف کرتے ہوئے اقبال کے موضوع عشق اور دوسرے شعراء کے موضوع عشق کا فرق بیان کیا اور عزیز طالبہ سے کہا کہ آپ نے اقبال کے تصور عشق میں غالب و میر اور داغ و جگر وغیرہ کے جو اشعار سمیٹ کر مقالہ کی بنیاد اٹھائی اور اپنے نظریہ پر استدلال قائم کیا ہے اس میں یکسانی نہیں اقبال کا تصور عشق ان شعراء کے تصور عشق سے مختلف ہے۔

ان کا عشق جسم کے لمس پر ہے۔ اقبال کا عشق عرفان ذات، معرفت حق اور احساس نفس پر ہے جو ان کے نزدیک خودی کا ہیولیٰ ہے۔

آغا صاحب نے ۴۵ منٹ کی تقریر میں تقریباً ڈیڑھ سو اشعار سنائے جو زیادہ تر غزل کے اشعار تھے۔ طلبہ لوٹ پوٹ ہو گئے اور سامعین آغا صاحب کی خوبیٔ گفتار کے سحر میں کھو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب کی تقریر خطابت کا شاہکار تھی۔ انہوں نے روانی و جولانی ظرافت و سلاست، تجربہ و تمثیل، آواز و

طریق، استدلال و اشارات، اسلوب و رعایت اور تخلیق و فن کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا کہ مجھے ان کے ساحر ہونے کا یقین ہو گیا۔

بلاشبہ آغا شورش کاشمیری اس گئے گزرے دور میں اقبال کی آرزو، ابوالکلام کی جستجو، عطاء اللہ شاہ کی امنگ اور ظفر علی خاں کی ترنگ کی ایک متحرک یادگار ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان سے گو بعض لوگ حسد کرتے ہیں لیکن بے شمار محبت کرتے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان ۶ مئی ۱۹۷۴ء)

پانچواں باب: اقبال اور قادیانیت

- ☆ علامہ اقبال کے نام پر جھوٹ
- ☆ ختم نبوت زندہ باد
- ☆ پانچ ہزار روپیہ
- ☆ دانش گاہ پنجاب میں مسند اقبال
- ☆ جب علامہ اقبال نے مرزائیوں کو انجمن حمایت اسلام سے نکالا
- ☆ قاضی محمد اسلم اور مسند اقبال
- ☆ یونیورسٹی کی شاہکار معذرت
- ☆ الفضل کی اچھوتی بازی
- ☆ اقبال کے بگلا بھگت
- ☆ قلم برداشتہ
- ☆ سالک اور ابن سالک
- ☆ اقبال سے بغض کی بنا پر نہرو کا استقبال
- ☆ الفضل کے جواب میں
- ☆ روح اقبال بنام ممتاز حسن
- ☆ ظفر اللہ اور علامہ اقبال
- ☆ اقبال کے پیرو جواب دیں

علامہ اقبالؒ کے نام پر جھوٹ

ہم سے ایک ذمہ دار دوست نے بعض ایسے کتابچوں کا ذکر کیا ہے، جو قادیانی مشن لندن کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ اور جن میں یہ درج ہے کہ علامہ اقبال نے مرزا غلام احمد کے علم و فضیلت پر صاد کیا تھا۔ وہ ان سے بیعت ہوئے، آخر احراریوں کے ورغلانے سے منحرف ہو گئے تھے، وغیرہ۔۔۔۔۔

نیاز صاحب کے تاثرات کا ایک خاص پس منظر ہے، جسے ہم یہاں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ اتنا سطحی ہے، کہ ایک ادبی شخصیت کا سماعی روایات پر اس طرح انحصار کرنا کسی طرح بھی ایک سانحہ سے کم نہیں۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان سے جو خطوط انہیں لکھے گئے، وہ لازماً ان کی ممدوح جماعت ہی نے لکھے یا لکھوائے ہوں گے، تاکہ اپنے حق میں بیرونی شہادتیں حاصل کی جا سکیں۔ بہر حال یہ ایک دوسری بحث ہے اور اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ احرار کا سوال بھی ہمارے سامنے نہیں، جو جماعت حکماً کالعدم قرار دی جا چکی ہو۔ اور ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح اس کا وجود بھی غائب ہو۔ اس کے بارے میں کسی گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا سوال خالص علمی ہے، یا پھر دینی، کہ جب قادیانی جماعت کی مزاحمت یا مدافعت کرنے والوں کی مجالس اپنے سیاسی کردار کے باعث معطل پڑی ہیں، تو قادیانی جماعت کو یہ حق کیونکر پہنچتا ہے کہ اپنے "مذہبی وجود" کی آڑ میں ان سیاسی حربوں کو استعمال کرے، جن کا استعمال دوسروں کے لئے ممنوع ہو چکا ہے۔ کیا وہ اپنے نفس کو دھوکا دے رہی ہے۔ یا مسلمانوں کو مغالطے میں رکھنا چاہتی ہے۔ یا پھر اس کے دماغ میں یہ واہمہ سما گیا ہے۔ کہ حکومت کی احتسابی مصروفیتوں کا راستہ دوسرا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ منیر انکوائری کمیشن کے روبرو قادیانی وکلاء نے علامہ اقبال سے متعلق اسی قسم کا الزام عائد کیا تھا، تو مرکزیہ مجلس اقبال نے فوراً ہی تردید کر دی تھی۔ بعض موانعات کے باعث تردید کا مضمون عام نہ ہو سکا۔ مگر جوابی تصریحات، کمیشن کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اب پھر اقبال کا نام استعمال کرنے اور ملک سے باہر اس مطلب کے کتابچے چھاپنے کی ضرورت محسوس کی گئی؟ ہم اس پس منظر کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے لیکن اگر ہم یہ عرض کریں، تو ملکی استحکام کی منشا کے عین مطابق ہوگا۔ کہ قادیانی جماعت کے مبلغوں کو اس امر کا قطعاً حق نہیں پہنچتا ہے، کہ وہ میدان خالی پا کر علامہ اقبال سے متعلق بین الاقوامی دنیا کو تاثر دیں کہ اقبال ان سے متاثر تھے، اور جب انہوں نے قادیانی جماعت کا جائزہ لیا، تو خدانخواستہ احرار کے دام تزویر کا شکار ہو گئے تھے۔ جس کا مطلب ہے کہ پاکستان کے فکری موسس کی معرفت وہ اپنا نام اور کام بیرونی دنیا کے سامنے

لانا چاہتے، اور اس طرح عہد حاضر کی تعلیم یافتہ نسل پر ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں، کہ اقبال جیسا نابغہ عصر بھی ان کے بانی کی عقیدت کا طوق گلے میں باندھے ہوئے تھا، پھر وہ احرار کے داؤں میں آ گیا۔ گویا وہ متزلزل عقائد کا انسان تھا اور اس کے اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور نظر و فکر کی عمارتیں کمزور تھیں۔

احرار کا نام لینا محض ذہنی عیاری ہے، تا کہ احرار سے متعلق اونچے طبقے کا ماضی مرحوم میں جو سیاسی ذہن رہا ہے، وہ ان کے لئے حفاظتی قلعہ ثابت ہو اور احرار کے خلاف خفیہ رپورٹوں کا جو انبار لگا ہوا ہے۔ وہ ان کی حفاظت کے کام آ تا رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ تبلیغ اسلام کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ یا مرزا غلام احمد کی ''صداقتوں'' کا ناد پھونکنے کے لئے۔ ہمیں یقین ہے کہ انہیں زر مبادلہ اس مقصد کے لئے نہیں ملتا کہ وہ اپنی جماعت کا چرچا کریں، اور اس واسطے سے بیرونی دنیا میں اپنی جماعت کے نام کا نقش بٹھا کر داخلی طور پر اپنی مختصری جماعت کے لئے بین الاقوامی تحفظ حاصل کریں۔ یہ صریحاً سیاسی ہتھکنڈا ہے، اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ قادیانی اپنے فن میں بڑے منفرد ہیں، اندرون ملک جہاں بیٹھے ہیں، اپنی تنظیم اور مخالفوں کی تنقیص سے ایک لحظہ بھی غافل نہیں رہتے۔ ان کی مشین کا ایک ایک پرزہ صحیح صحیح کام کرتا ہے۔ ہمارے سامنے بعض دلچسپ اور سنگین مثالیں موجود ہیں، لیکن ہم زیر نظر سوال کو طول دینا نہیں چاہتے، ہماری استدعا یہ ہے کہ ان حالات میں جب تمام سیاسی جماعتیں ختم ہو چکی ہیں، انہیں بھی لازم ہے کہ اپنا سیاسی مزاج بدلیں اور ان افراد و عقائد کے بارے میں محتاط رہیں، جنہیں جمہور المسلمین بطور خاص عزیز رکھتے ہیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال ان کے بارے میں جو نظریات رکھتے تھے ان کا جوابی چرچا ہو، اگر وہ یہ نہیں چاہتے، تو پھر اس صورتحال سے فائدہ کیوں اٹھاتے ہیں؟

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

ختمِ نبوت زندہ باد

مسلم لیگ اول یا ثانی (اس کا فیصلہ وقت کرے گا) کا جلسہ عام چوہدری خلیق الزمان صاحب کی تشریف آوری پر موچی دروازہ کے باغ پر ہوا، لیکن گڑبڑ کی نذر ہو گیا۔ اخبارات نے لکھا نہیں اور ہمارے روزناموں کی اکثریت کا یہ وتیرہ ہو گیا ہے کہ عوام کی نبض پر ہاتھ رکھنے کی بجائے وہ اپنی خواہشات کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے پنجابی اضلاع میں ختمِ نبوت کا مسئلہ ایک زندہ حقیقت ہے اور لاہور کے لوگ خصوصیت کے ساتھ مارشل لاء کی اس یاد کو بھولے نہیں، جب انہیں ختمِ نبوت کے سلسلے میں گولیوں کا نشانہ بننا پڑا، اور لاہور کی سب سے بڑی سڑک مال روڈ پر محمد رسول اللہ ﷺ کی ختم المرسلینی کا اعلان کرنے پر اس وقت کے سیاست دانوں نے حلقہ بگوشانِ رسالت کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے ہر عوامی جلسہ میں ختمِ نبوت زندہ باد کا نعرہ حاضرین کی پوری طاقت کے ساتھ ہمیشہ گونجا ہے، اور بڑے سے بڑا مقرر اس کی ہمنوائی کے بغیر آگے نہیں چل سکتا ہے۔ مسٹر منظر عالم نے جو کنونشن کے معتمد ہیں، لاہور کے جلسہ عام میں اس ختمِ نبوت ہی کا سہارا لیا اور جب انہوں نے یہ کہا کہ لیگ کونسل والے ہی تھے جنہوں نے تحریک ختمِ نبوت میں گولیاں چلائیں۔ تو لوگ چلا اٹھے کہ آپ بھی ان میں شریک تھے، وغیرہ

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سرکاری اطلاعات اس بارے میں کیا ہیں، اور حکومت کیونکر سوچتی ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ مسلمانوں کے دل و دماغ کا مسئلہ ہے، وہ مسلمانوں کے لئے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان سب کچھ گوارا کر سکتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کی ختم المرسلینی اور ختم النبیینی میں مداخلات یا سرقہ نہیں گوارا کر سکتے وہ ایک ساعت کے لئے بھی یہ چوٹ نہیں سہہ سکتے ہیں اور یہ عظیم ترین حادثہ ہے کہ پاکستان میں ختمِ نبوت کے سارقین موجود ہیں ان کے بعض افراد کو مسلمانوں کے حقوق میں سے حقوق ملتے ہیں اور وہ بین الاقوامی اداروں میں بھی مسلمانوں کے نمائندہ کہلاتے ہیں۔

منیر انکوائری رپورٹ بڑے ہی فاضل ججوں نے لکھی ہے، لیکن اس رپورٹ پر دشمنانِ اسلام و نبوت کے سوا کسی نے صاد نہیں کیا۔ حقیقت یہی ہے اور جیسا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یہ رپورٹ تیرہ سو برس میں مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں ہی کے قلم سے سب سے بڑی دستاویز لکھی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال بار ایٹ لاء نے اپنی ایک تالیف میں اس رپورٹ کی اشاعت روک

دینے کا مطالبہ کیا ہے، اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس رپورٹ نے کوئی سا مقصد بھی حل نہیں کیا ہے۔

دماغی بد دیانتیوں کی حد ہے کہ جو لوگ علامہ اقبالؒ کے نام سے مختلف قسم کی روایتیں بیان کرتے ہیں، اور جن کی زبان انہیں ترجمان اسلام کہتے ہوئے بھی نہیں تھکتی ہے وہ علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ سے فرضی خطوط اور خانہ ساز بیان منسوب کرتے ہوئے بزعم خویش بڑے کروفر کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جن چیزوں کو حضرت علامہ قدس سرہ العزیز نے اسلام اور نفس اسلام کے لئے خطرہ قرار دیا ہے، ان سے نہ صرف علامہ اقبالؒ کے یہ ''ترجمان'' چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ علامہ اقبال کی ان تحریروں اور افکار ہی کو ختم کر دیا جائے اور یا ان کی ایسی تعبیر کی جائے کہ مطالب کا اصل چہرہ مسخ ہو جائے۔

علامہ اقبالؒ نے ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کے اسٹیٹسمین میں لکھا تھا کہ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے، اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گذرے گا، کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے، افسوس کہ جس محمد عربی ﷺ کے نام پر پاکستان معرض وجود میں آیا، وہاں قادیانیوں کی علیحدگی کا سوال تو شدت سے موجود ہے لیکن جواب انگریزوں کی حکومت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری لیڈر شپ نے اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا، وہ لوگ جو انگریزوں کے وقت سے سول سروس کے ستون تھے، ملک کی آزادی کے ستون ہی نہ رہے، بلکہ پوری بنیاد اور عمارت ہو گئے، اور بہمہ وجوہ انہوں نے قادیانی مسئلہ کو عنقا بود کر دیا، بلکہ اس مسئلہ کے نام لیواؤں کو جنونی سے لے کر غدار تک کہا، حالانکہ وہ ان الفاظ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہیں، ان کے نزدیک ہر وہ بات حق ہے جو انگریزی حکومت کے نزدیک حق رہی ہے، اور ہر وہ بات باطل ہے، جسے وہ باطل کہہ گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان رسول عربی ﷺ (فداہ امی وابی) کے ننگ و ناموس کی حفاظت کے معاملہ میں جنونی ہے۔ اور جنون ہی وہ دولت ہے جو موقف یا نصب العین کو پروان چڑھاتی ہے یا جس سے عشق و مذہب کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ رہا غدار کا لفظ تو جب اس کا استعمال انگریزی عہد کے ستون کرتے ہیں، تو اس وقت تاریخ کی شرافت کا چہرہ داغدار ہو جاتا ہے۔

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے جو دنیا کے بعض بڑے

آدمیوں نے ان کے نام وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، اس میں ۲۱ جون ۱۹۳۶ء کا ایک خط ہے، اس میں حضرت علامہ لکھتے ہیں۔

(قادیانی مذہب کے خلاف) میں نے یہ مقالہ اسلام اور ہندوستان کے ساتھ بہترین نیتوں اور نیک ترین ارادوں میں ڈوب کر لکھا تھا، میں اس باب میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا، کہ یہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔''

کسی دعویدار پاکستانی محب الوطن کو یہ توفیق نہیں ہوئی، کہ اس خط کو حضرت علامہ کے مجموعہ مکاتیب میں شامل کرتا۔ تاہم اقبال کے الفاظ میں

''یہ حکایت دراز ایک طاقتور قلم کی منتظر ہے''

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۱ جنوری ۱۹۶۳ء)

پانچ ہزار روپیہ

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ نے فرمایا تھا کہ قادیانی مذہب کا تجزیہ و تاریخ ایک طاقت ور قلم کے منتظر ہیں۔ ۱۷۹۹ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے اس کی روشنی ہی میں احمدیت کے اصل مظروف تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ سال وہ تھا جب ٹیپو کو شکست ہوئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی نفوذ کی آخری امید منقطع ہوگئی۔ علامہ اقبال نے اپنے پہلے بیان میں اس امر کی ضرورت کو محسوس کر کے اظہار کیا تھا کہ قادیانیت سے مذہبی بحث میں الجھنا عبث ہے۔ اصلی چیز تحریک احمدیت کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ ان کے نزدیک یہ تمام تر سیاسی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے لئے نبوت کے نام پر برطانوی غلامی کے طوق مہیا کئے اور الہام کی بنیاد پر مسلمانوں میں فسخ جہاد کا نظریہ رائج کرنا چاہا۔۔۔۔۔۔۔۔ جب تک ہم اس عہد کے سیاسی حالات پر نگاہ نہ رکھیں اور ان احوال وظروف کو معلوم نہ کرلیں جو اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی ملی زندگی کا جزو غیر منفک ہو رہے تھے۔ اس وقت تک ہم قادیانی جماعت کی تاریخ اور اس کا تجزیہ نہیں کرسکتے ہیں۔ قادیانی جماعت پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی یہ سوال بھی کسی طاقت ور قلم کے تجزیہ وتحلیل کا منتظر ہے۔ اور انشاء اللہ کسی دور میں یہ نقاب اٹھ کے رہے گا۔ تاہم یہ امور یا نکات اب ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ کہ قادیانی جماعت نے انگریزوں کے بہترین خدمت گزار پیدا کئے اس فرقے نے نہ صرف انگریزوں کے وثیقہ غلامی کا جواز پیدا کیا بلکہ اپنی جماعت سے باہر کے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر اخوت اسلام کے اس تصور کو ہلاک کرنا چاہا جو محمد عربی ﷺ کے کاشانہ نبوت سے پیدا ہوا تھا۔ اس امر کے شواہد و نظائر بھی موجود ہیں کہ قادیانی جماعت کے ارکان غیر ملکوں میں جاسوسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اور مسلمانوں کی بعض قومی تحریکوں کو داخلی طور پر ختم کرنے یا رسوا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ایسا شخص جو مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا طالب علم ہو۔ اور اس کی نگاہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر ان کے اخراج تک کے حالات پر ہو، نیز اس کو اس امر کی تحقیق کا بھی شوق ہو کہ اس عرصہ میں انگریزوں کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری۔۔۔۔۔۔۔۔ غرض علامہ اقبال کی مہیا کردہ بنیادوں پر قادیانیت کے سیاسی تجزیہ و تاریخ کو مرتب کرنے والا شخص نہ صرف اپنے اس عظیم کارنامہ کے لیے تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہوگا بلکہ اس کے لیے اللہ اور اس کے حضور ﷺ کی بارگاہ میں بڑا اجر ہے۔ اور

یہ کتاب تاریخ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگی۔ ایڈیٹر چٹان کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ وہ اس کتاب کے مرتب و مصنف کو کتاب کے معیاری و مستند ہونے پر اپنی جیب سے پانچ ہزار روپیہ نقد دیں گے۔ ہم چندہ فراہم کرنے کے عادی نہیں اور نہ ہم اس عنوان سے عطیات کے قائل ہیں۔ ورنہ اس رقم میں دوگنا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک کتاب کے انتخاب کا تعلق ہے یہ کتاب چار مختلف ججوں کے پاس بھیجی جائے گی اور وہ اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ کتاب واقعی تاریخ و تجزیہ کے اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ جس کی نشان دہی حضرت علامہ اقبال نے کی ہے۔ ان چاروں ججوں کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور شیخ حسام الدین یہ فرض انجام دیں گے۔ تو ہر لحاظ سے وہ اس منصب کے اہل ہیں۔ ایڈیٹر چٹان کتاب کا فیصلہ ہوتے ہی یہ رقم ان کے حوالہ کر دے گا۔ اس غرض سے دو سال د۔ ت کافی ہوگی۔ او اخر اپریل ۱۹۶۷ء تک جو صاحب قلم اٹھائیں اپنے رشحات وکاوشات ایڈیٹر چٹان کی وساطت سے ان ججوں کو پیش کرسکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان ججوں کو عذر وانکار نہ ہو، عذر وانکار کی صورت میں کسی دوسرے ۔ رک کا انتخاب ہوجائیگا۔ اللہ کرے یہ تاریخ تیار ہوجائے۔

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۱۲۔ اپریل ۱۹۶۵ء)

دانش گاہ پنجاب میں مسندِ اقبال

ایک قادیانی پروفیسر کے حوالے

انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ خبر آئی اور نکل گئی کہ پنجاب یونیورسٹی کے ''دانش مندوں'' نے علامہ اقبال کے نام پر جو Chair قائم کی ہے۔ اس کو شعبہ فلسفہ کے رئیس پروفیسر قاضی محمد اسلم کی تحویل میں دے دیا گیا ہے پروفیسر موصوف ظاہر و باطن قادیانی ہیں۔ ان میں وہ تمام عصبیتیں بدرجہ آخر موجود ہیں۔ جو ایک قادیانی کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح گردش کرتی ہیں۔ قاضی صاحب قادیان + ربوہ کی نبوت اور مرزا بشیر الدین محمود کی خلافت پر حاضر و غائب ایمان رکھتے ہیں، بلکہ ان کے فکر و نظر کا تار و پود بھی اس سے تیار ہوا ہے۔ اپنے اس عقیدہ کو وہ چھپاتے نہیں ہیں۔ انہیں اس کا اقرار و اعتراف ہے۔ اس کے باوجود مسندِ اقبال کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔

کیا یہ بے خبری میں ہوا ہے؟

یا جن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے وہ اس سے بھی آگاہ تھے کہ علامہ اقبال کے نظریات اور قاضی محمد اسلم کے معتقدات میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمتوں کے راہرو ہیں۔

اگر یہ فیصلہ بے خبری میں ہوا ہے تو اس سے زیادہ افسوسناک بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے کارپرداز ملک کے سب سے بڑے مفکر کے افکار و نظریات سے اتنے بے خبر ہیں یا جس شخص کے حوالہ اس کے افکار و نظریات کی تعلیم و تدریس کی جا رہی ہے یونیورسٹی اس کے دینی حدود اربعہ سے ناواقف ہے۔

اور اگر ان کارپردازوں کے علم میں تھا کہ علامہ اقبال اور قاضی محمد اسلم کے معتقدات میں کوئی میل نہیں۔ صبح و شام کا فاصلہ ہے۔ تو انہوں نے یہ مذاق کیوں روا رکھا ہے؟ مقصد فکرِ اقبال کو سبوتاژ کرنا ہے یا اسے عام کرنا ہے۔ کیا یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو قاضی محمد اسلم سے بڑھ کر پورے ملک میں ایک شخص بھی اقبال کا اداشناس نظر نہیں آیا؟ قاضی محمد اسلم کی نگرانی میں فکرِ اقبال کا مطلب ہے، حسینؓ کی شہ رگ پر یزید کا خنجر۔ قاضی محمد اسلم ہی سے دریافت کر لیا ہوتا، کہ وہ اقبالؒ کی تعلیمات سے بکمال و تمام متفق ہیں؟ حضرت

علامہ کو فکری اعتبار سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا رہنما تسلیم کرتے ہیں؟ ان کے نزدیک اقبال کے فکر و نظر کا مقام کیا ہے؟ اقبال کے خطبات بہ عنوان تشکیل جدید الٰہیات کے مندرجات کی روح سے انہیں کس حد تک اتفاق ہے۔ مرزائیوں کے بارے میں حضرت علامہ نے جو بیانات دئے تھے، اور جن مقالات کو حوالہ قلم کیا، قاضی صاحب محترم کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ قاضی صاحب کے نزدیک شاہراہ اسلام پر اقبال کا درجہ کیا ہے؟ ''احمدیوں'' کو اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی صاحب کا اقبال کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ اقبال کو مسلمان بھی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ان کے نزدیک اقبال اور غلام احمد میں سے کونسی شخصیت اس صدی میں اسلام کی راہنما ہے؟ اس قسم کے بیسیوں سوالات موجود ہیں، اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ قاضی صاحب مرزا غلام احمد کی نبوت اور میرزا بشیر الدین محمود کی خلافت کو خارج کر کے ان سوالات پر سوچ ہی نہیں سکتے ہیں۔ جب اتنی واضح اور واشگاف صورتحال موجود ہو، تو اقبال کی فکر کو ان کے حوالے کرنا حادثہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جیسا کہ انگریزی میں ضرب المثل ہے کہ ''شیطان بائبل کا حافظ ہو گیا ہے؟'' ہم نہیں کہہ سکتے کہ قاضی صاحب نے یہ منصب کیونکر قبول کیا؟ اور اس کے تہِ منظر کونسے مقاصد کارفرما ہیں۔ کل کلاں کوئی شخص یہ تجویز کرے، اور علم و دانش کے وہ پتلے جو اس ملک میں عام پائے جاتے ہیں، اس پر صاد کر دیں کہ قائد اعظم کی سوانح عمری، مولانا مظہر علی اظہر لکھیں، یا انجمن ترقی اردو کی باگ دوڑ بھارت کی ہندی پرچارنی سبھا کے حوالے کر دی جائے، یا اسلام کی تعبیر و تفسیر کا کام پرشوتم داس ٹنڈن کی نگرانی میں ہو، یا کعبہ اور اس کی عظمت پر ماسٹر تارا سنگھ مقالہ (Thesis) لکھیں، تو کیا عقل سلیم کے نزدیک یہ صحیح ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ہر شخص جو حواس خمسہ سے بہرہ یاب ہے اس کو مضحک المیہ قرار دے گا۔

معلوم ہوتا ہے یونیورسٹی کے کارپردازوں کی اکثریت حسیات دین اور روح اسلام سے نابلد ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلام صرف ان کے اسلامی ناموں اور معاشرتی رواجوں کے اظہار و اقرار کا نام ہے، اور دین و دانش کا جوہر، فہم و فراست کے اس مغز کا نام ہے جو اس کھیپ کی کھوپڑیوں میں اپنا ایک خاص طول و عرض رکھتا ہے۔

علامہ اقبال نے عمر بھر یورپی دانش و علم کی کارفرمائیوں کا ماتم کیا، اور جو لوگ اسی کے ہو گئے ہیں یعنی جن کا پیکر خاکی یورپی عمارت گروں کا تیار کردہ ہے، ان کے خلاف ہمیشہ نالۂ احتجاج بلند کیا، ان کی نظمیں، ان کی تحریریں، ان کے بیان، ان کے خطوط آخر دم تک یورپی تصویروں اور مصوروں کا ماتم کرتے رہے۔ سید سلیمان ندوی کو انہوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء کے ایک خط میں لکھا کہ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت

یہ ... بت ہے۔ ("اقبال نامہ" صفحہ ۱۶۸) یہی نہیں بلکہ ان کے بیشمار خطوط میں بار بار یہ خطرہ ... جو
... نمانوں کے وہ "دانشوران بے دین" جن کی تربیت یورپی دانش وحکمت کے گہوارہ میں ہوئی ہے اور
جن کے علم ونظر کی معراج یورپی فلسفہ وفکر پر ہے، نہ صرف روح اسلام سے بے بہرہ ہیں۔ بلکہ عملاً اسلام سے
صرف سیاسی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس کے دینی فرائض کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوسری جگہ علامہ اقبال نے
اس طبقہ کو بے حمیت اور بے غیرت لکھا ہے کیونکہ یورپی عقل ودانش سے مرعوب ہو کر یہ اسلام کے معاملہ میں ہر
نئی تعبیر سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار رہتے، اور اس کے مقابلہ میں سپر انداز ہونے میں لذت محسوس کرتے
ہیں۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ اقبال کی بعض چیزوں کو تو اپنے ... حال پا کر قومی تقاضوں کا جزو قرار دیا گیا
ہے، اور بعض ایسی چیزیں جو اقبال کے نزدیک اسلام کی حیات ... ور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے لازم و
ملزوم تھیں، انہیں طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال کی بدنصیبی ہے یا مسلمانوں یا پھر اسلام کے دورِ انحطاط
کے برگ و بر کہ اقبال کی فکر عنقا ہے۔ پوست موجود ہے مغز غائب ہے ہڈیوں سے رشتہ باندھا جا رہا ہے۔ یہ
لوگ اقبال اور اس کی فکر سے نہیں بلکہ اپنے کسی مدعو پور ... نے کیلئے اقبال کا نام لے رہے ہیں۔

قادیانیوں کے بارے میں اقبال نے جو کچھ کہا، وہ کسی اہم دینی مسئلہ پر ان کی سب سے بڑی تحریر
ہے۔ یہ تحریر اس وقت قلمبند ہوئی، اور سامنے آئی۔ جب وہ اپنی عمر عزیز گزار چکے تھے، بڑے غور وخوض کے بعد
انہوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا تھا۔ ان کی یہ تحریر ہمہ جہت مکمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت یہ ملک غلام تھا، اور
پاکستان بھی معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ پاکستان کا تصور وہ پیش کر چکے تھے، لیکن ابھی مسلم لیگ نے بھی اس کو
اپنا نصب العین قرار نہیں دیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے گول میز کانفرنس کے ضمنی
اجلاس میں اس تصور کو احمقانہ تخیل قرار دیا تھا۔

جواہر لال نہرو قادیانی جماعت کی حمایت میں کمربستہ ہو کر سامنے آئے، تو علامہ نے بصیرت افروز
مقالہ میں قادیانی جماعت کا تار و پود بکھیر دیا، اور اس حقیقت کو اچھی طرح افشاء کیا کہ اس جماعت کو مسلمانوں
سے الگ رکھنا کیوں ضروری ہے۔ یہ تحریریں ڈھکی چھپی نہیں عام ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی
کے آخری سالوں میں ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا، جو ان کے نام بعض اکابر نے لکھے تھے ان خطوط میں علامہ
اقبال کا بھی ایک خط ہے۔ جس میں انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ قادیانی اسلام ہی کے نہیں بلکہ ... ان
نے ... ر ہیں، یہ خط ان کے مرض الموت میں مبتلا ہونے سے کچھ ہی دن پہلے کا ہے۔

اقبال نے جب اس فرقہ ضالہ کے احوال وظروف معلوم کر لئے، تو سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ
انہیں خارج از اسلام قرار دے کر انجمن حمایت اسلام سے نکلوا ڈالا۔ اس ضمن میں انہوں نے لاہوری اور
قادیانی گروہوں کی تفریق کو بھی تسلیم نہ کیا۔ دونو کو ایک ہی تھنی کا پتہ سمجھا۔

۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو انہوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دیدیا، اور ایک
زبردست بیان میں قادیانی جماعت کے اغراض ومقاصد کا پردہ چاک کیا۔ پھر ۲/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے بیان میں
قادیانی حضرت کی دو ذہنی اور دو عملی کی چھتاڑ کی۔ ۱۹۳۵ء میں قادیانی جماعت کے چہرے سے ہر نقاب اٹھا
دی۔ اور کھلے بندوں اعلان کیا کہ دینی اور سیاسی دونوں بنیادیں اس امر کی مقتضی ہیں، کہ قادیانیوں کو مسلمانوں
سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ علامہ نے جو کچھ سپرد قلم کیا، وہ علم وفکر کی بنیاد پر تھا، اور آج تک کسی
اسلامی گوشے سے بھی اس کے خلاف کوئی کلمہ نہیں نکلا ہے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں:۔

۱۔ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نئی نبوت پر رکھے۔ اور
بزعم خود ان تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، جو اس کے الہامات پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں۔ ایسی جماعت کو مسلمان
اسلام کی وحدت کے لئے ایک خطرہ تصور کریں گے، کیونکہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

۲۔ مسیح موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے۔ اور نہ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دور اول
کے تاریخی اور مذہبی ادب میں ملتی ہے۔ بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام
سے باغی ہے۔ لیکن قادیانیت اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر
اسلام کی روح اور مقاصد کیلئے مہلک ہے۔

۳۔ نام نہاد تعلیمیافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ مغربیت کی ہوا نے انہیں
حفظ نفس کے جذبے سے عاری کر دیا ہے۔

۴۔ ہندوستان میں کوئی سانڈ ہبی ٹے باز اپنی اغراض کی خاطر اس طرح ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے۔

۵۔ جو لوگ مسلمانوں کو اس معاملے میں رواداری کا سبق دیتے ہیں ان کے بارے میں حضرت علامہ کا
ارشاد ہے کہ یہ کیونکر مناسب ہے کہ اصل جماعت کو تو رواداری کی تلقین کی جائے، حالانکہ اس کی وحدت خطرے
میں ہو، باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو۔ اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو، جس قوم کی وحدت
خطرہ میں ہو تو اس کے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ معاند قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے۔

۶۔ میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا، کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت

تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا۔ اور مسلمان اس سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا۔ جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔

(ماخوذ از قادیانی اور جمہور مسلمان صفحہ ۱۲۱ تا ۱۳۴ حرف اقبال مطبوعہ المنار اکادمی۔ لاہور)

حضرت علامہ کے اس بیان پر "سٹیٹسمین" کے انگریز ایڈیٹر نے اپنے اداریے میں تنقید کی۔ اس تنقید پر حضرت علامہ نے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا جو ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں طبع ہوا۔ اس خط میں حضرت علامہ نے اپنے مطالبہ کا اعادہ کیا۔

فرمایا کہ:۔۔۔۔۔۔۔۔

(۱) حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے، اور اس امر کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب یہ مطالبہ کرتے ہیں۔

(۲) ختم نبوت کے مفہوم کی تاویلیں اور تعبیریں قادیانی اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہو۔ تاکہ انہیں اس طرح سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لئے کیوں مضطرب ہیں؟

(۳) ملت اسلامیہ کو اس مطالبے کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے، اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا، تو مسلمانوں کو شک گزرے گا، کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔

اس تحریک میں قادیانیوں کو سب سے پہلے اس وقت کے انگریز گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کی حمایت حاصل ہوئی، پھر "اسٹیٹسمین" کے انگریز ایڈیٹر نے پشت پناہی کی۔ آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو مدافع کے طور پر سامنے آئے۔ انہوں نے ماڈرن ریویو کلکتہ میں تین مضامین لکھے۔ جن میں بزعم خود مسلمانوں کے مذہبی افکار کا تجزیہ کرنا چاہا۔ اور اس تجزیے میں اس اصل کے پیش نظر قادیانی جماعت کی مدافعت کی کہ پیغمبر عرب کے مقابلے میں غلام احمد بہر حال ایک ہندوستانی پیغمبر ہے۔ حضرت علامہ نے جواب میں ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ جس کے بعض ضروری اجزا حسب ذیل ہیں۔

۱: پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانان ہندستان کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

۲: قادیانی جماعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ پیغمبر عرب ﷺ کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کرنا چاہتی ہے۔

۳: جب کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظام اجتماعی خطرے میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزادانہ اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔ یہ اس کا فرض ہو جاتا ہے۔

۴: آجکل کے تعلیمیافتہ مسلمان جو مسلمان کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو ملت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

۵: وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں۔ مکمل اور ابدی ہے۔ محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے۔ جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔

۶: ۱۷۹۹ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے۔ اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔

۷: مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے۔

۸: وہ تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا ہے زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

۹: یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے۔ لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے۔ جو اسلام کو مضبوط کرنا چاہتی ہے۔

۱۰: اسلامی وحدت مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت متزلزل ہوتی ہے۔ جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔

(ماخوذ از حرف اقبال صفحہ ۱۳۸ مطبوعہ المنار اکادمی۔ لاہور)

پروفیسر قاضی محمد اسلم کا تقرر ان ثقہ حوالوں اور واضح نظریوں کے بعد بالکل ہی بے محل ہو جاتا ہے۔ شروع میں جو سوال ہم نے قائم کئے تھے۔ ایک ایک کر کے جواب کے خواہاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ قاضی صاحب جس جماعت کے صحابی یا تابعی ہیں اس کی نفی نہیں کر سکتے اور نہ اس کے خلاف کسی ایسے شخص کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ جو ان کے مذہب، نبی، گروہ اور عقیدہ پر مندرجہ بالا الفاظ میں تجزیہ کر چکا ہو۔ اور آخری

ت تک مصر رہا ہو کہ اس جماعت کو اسلام کا باغی سمجھا جائے اور اس بغاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ایک علیحدہ
[illegible] قرار دیا جائے اور اگر انگریزی حکومت کو یہ تسلیم کرنے میں بہ مصلحت ہچکچاہٹ ہو تو آنیوالی اسلامی
ریاست مجبور ہوگی کہ اس فرض سے عہدہ برآ ہو کیونکہ اسلام اپنے دائرے میں ایسے کسی باغی کو تسلیم نہیں کرتا
ہے۔ جو اس کے گھر میں نقب زنی کا مرتکب ہو۔

اس ضمن میں کچھ نئے سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) قاضی صاحب کے ایک خلافتی عزیز مرزا بشیر الدین محمود کے پوتے اور میرزا ناصر محمود کے بیٹے یونیورسٹی میں فلسفہ کی تکمیل کر رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ دن ہوئے ہیں اپنی ساتھی طلبہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ اقبال کا شہرہ [illegible]، [illegible] تک ہے۔ اس کے بعد اقبال کے لئے زوال ہے۔ اور جو، ان کے نزدیک شروع ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قاضی محمد اسلم نے شائد اسی مفروضہ پر یہ فرض اپنے فرائض میں شامل کیا ہے۔ ہمارے اپنے علم و آگاہی کے مطابق قاضی محمد اسلم صاحب اقبال کے نظر و فکر سے مطلقاً آشنا نہیں۔ انہیں اقبال کے اشعار بھی صحیح پڑھنے نہیں آتے ہیں۔ نہ وہ ان صداقتوں اور نزاکتوں سے آگاہ ہیں جو اقبال کے کلام کی روح ہیں۔ اور ان کی تحریروں کے مطالب کی پیشانی کا جھومر ہیں۔ ان کی نظر سے شاید اقبال کے کلام و پیام کا پورا حصہ نہیں گزرا۔ وہ اقبال کی مصطلحات کے مفہوم ہی سے بے بہرہ ہیں۔ اپنے عقائد کی بوقلمونی (اور ہمارے نزدیک خرابی) کے باعث اقبال کے ذوق وشوق کو سمجھنے کی استطاعت سے محروم ہیں۔ وہ یورپی فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ انہیں اس کا احساس ہی نہیں کہ اقبال مغربی فلسفہ کا نقاد ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں جن اسلامی شخصیتوں اور دینی مصطلحات کو بے تکلف استعمال کیا ہے۔ اور اس سے جن نتائج کا استخراج کیا ہے۔ قاضی صاحب اپنے عقیدہ کی رو سے اس کے مخالف ہیں۔ اور اپنے دماغی نشو کی وجہ سے اس کا فہم نہیں رکھتے۔ پھر جس عقیدہ و فکر کو اقبال جس ایمان آگہی سے مانتا ہے۔ قاضی صاحب اس عقیدہ و فکر کو اس انداز و اسلوب سے نہیں مانتے۔ یہ اختلاف و تضاد بنیادی ہے۔ قاضی صاحب کا ضمیر تو اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہو گا۔ لیکن یونیورسٹی کے جن دانشوروں نے انہیں اس خدمت پر مامور کیا ہے افسوس ہے کہ وہ اولاً اس کے فہم ہی سے قاصر ہیں۔ ثانیاً اس کی نزاکت و اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ثالثاً اپنی ذات کے سوا ہر معاملہ میں روادار واقع ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے جب اسلام کیمرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں سے سیکھا ہے۔ تو اقبال کو ایک قادیانی کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ انہیں مطلقاً خبر نہیں کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی۔ اور آتی ہے تو ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہ دانشور اسی گمراہی کا شکار ہیں۔

[illegible] ک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے۔ جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح [illegible]
[illegible] کی ہے۔ جس کے نزدیک تمام یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے۔ جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے۔ جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ۔۔۔۔۔۔۔ (معلوم ہوتا ہے، دانش گاہ پنجاب کے بیشتر کارپرداز اسی قبیلہ کے فرد ہیں) ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت جو اکی محبوب اشیا، یا اشخاص پر روا رکھی جاتی ہے "برداشت کر لیتا ہے" (گبن)

اس آخری رواداری کا ہدف ان دنوں مسلمانوں کا سواد اعظم ہے۔ فی الجملہ اس تقریر پر ہم کے مخاطب کریں۔ یونیورسٹی کے ان کارپردازوں کو جو اس تقریر کا باعث ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کے بھائی پروفیسر حمید احمد خاں کو جو اقبال سے معنوی، اور ظفر علی خاں سے خونی رشتہ رکھنے کے باوجود اس فتنہ پر غور نہیں کر سکے ہیں، یا پھر ہم صوبہ کے راسخ العقیدہ مسلمان گورنر ملک امیر محمد خاں سے درخواست کریں کہ وہ بحیثیت چانسلر اسلام اور اقبال کو یونیورسٹی کے ان بردہ فروشوں سے بچائیں۔ جن کی نیام میں کوئی تلوار نہیں ہے مگر اسلام کو اپنے الللے تللوں کی میراث سمجھتے ہیں۔ جن کی فکر مستعار پر بیرنگی مصلحتوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۶۵-۴-۹)

علامہ اقبالؒ نے میرزائیوں کو انجمن حمایت اسلام سے [illegible]

“تب صدارت کروں گا، جب ان کو اجلاس سے نکال دو گے”

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اس صدمہ کی تاب نہ لاکر رحلت کر گئے

اور اب پنجاب یونیورسٹی کے دانش ور کیا کر رہے ہیں؟

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ نے میرزائیوں کی دونو شاخوں کو خارج از اسلام قرار دے کر انجمن حمایت اسلام کے دروازے ان پر بند کر دیئے تھے۔ میرزائی لاہوری ہو، یا قادیانی، انجمن کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیلات انجمن کے تحریری ریکارڈ میں موجود ہیں۔ اس کے ایک عینی گواہ لاہور کے سب سے بڑے شہری میاں امیر الدین بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ یونیورسٹی کی ہیئت انتظامیہ کے بھی رکن ہیں ان سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کہ علامہ اقبالؒ انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاس عام کی صدارت فرمانے لگے تو آپ نے سب سے پہلے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ مسلمانوں کی اس انجمن کا کوئی میرزائی (لاہوری یا قادیانی) ممبر نہیں ہو سکتا ہے۔ میرزا غلام احمد کے متبعین کی یہ دونوں جماعتیں خارج از اسلام ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کرسئ صدارت کے عین سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہی میاں امیر الدین فروکش تھے۔ حضرت علامہ نے ڈاکٹر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے صدر رکھنا ہے تو اس شخص کو نکال دو .... میرزا صاحب لاہوری جماعت کے بیچ و تھے۔ حضرت علامہؒ کے اس اعلان سے تھرا گئے، کانپ اٹھے، جزبز ہوئے، کچھ کہنا چاہا حتیٰ کہ ان کا رنگ فق ہو گیا۔ حضرت علامہ ”مصر رہے کہ اس شخص کو یہاں سے جانا ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر میرزا یعقوب بیگ، بیک بینی و دو گوش نکال دیئے گئے ان کی طبیعت پر اس اخراج کا یہ اثر ہوا کہ بے حواس ہو گئے دو چار دن ہی میں مرض الموت نے آلیا اور اس صدمہ کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے ....!

پنجاب یونیورسٹی کے دانشور (؟) بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے مسند اقبال کس بناء پر ایک قادیانی کے حوالے کی ہے۔ علامہ اقبال کی عظمت مقصود ہے یا اہانت؟ جس انسان نے اپنی صدارت میں ایک میرزائی کا وجود گوارا نہ کیا ہو اس کے فکر کی صدارت کسی قادیانی کے حوالے کر دینا ہمارے نزدیک ایک خوفناک جسارت ہے، کم از کم ناطرح بھی کم نہیں ہے۔

ہفت روزہ چٹان۔ ۱۹ اپریل ۱۹۶۵ء

قاضی محمد اسلم اور مسندِ اقبالؒ

یہ انتخاب ایسا ہی ہے جیسا کہ یورپ کے کسی مستشرق کو سیرت و قرآن کی تعبیرات اور توضیحات کے کام پر مامور کر کے موثر نتائج کی توقع کی جائے

روزنامہ ”نوائے وقت“ کا اداریہ، بہ عنوان ”غلط بخشی“ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۶۵ء

پنجاب یونیوسٹی میں مسند اقبال کے اہتمام کا فیصلہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نظریہ پاکستان کے خالق اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے راہ نما ہیں چنانچہ فکری افلاس کے اس دور میں ان کے پیغام اور افکار کو عام کرنے کا عزم وقت کی اہم ترین ضرورت ہی نہیں ملک و قوم اور اسلام کی بہت بڑی خدمت بھی ہے۔ ہمیں یہ حسن ظن تھا کہ جن ارباب اختیار نے ایک انتہائی مستحسن فیصلہ کرنے کا لازوال اعزاز حاصل کیا ہے وہ نئے منصب پر کسی موزوں شخصیت کو فائز کرنے کی سعادت بھی حاصل کریں گے یہ کام چنداں دشوار بھی نہیں تھا کیونکہ اس گئے گزرے دور میں بھی ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کوئی کمی نہیں تھی جو نہ صرف تعلیمات اقبال کی حقیقی روح سے پوری طرح آگاہ ہیں بلکہ انہیں خود بھی اسلام کے فلسفی شاعر کی صحبتوں سے استفادہ کے مواقع حاصل ہوئے لیکن اس انکشاف نے اقبال کے ہر شیدائی اور دردمند مسلمان کو اذیت ناک مایوسی اور اضطراب میں مبتلا کر دیا کہ حکیم الامت کے پیغام اور فلسفہ کو فروغ دینے کی ذمہ داری جن صاحب کو تفویض کی گئی ہے انہوں نے یونیورسٹی میں یورپی فلسفہ پر تو سینکڑوں لیکچر دیئے ہوں گے اور بیسوں کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ لیکن وہ عقیدتاً اسلام کے اس فلسفہ سے یقیناً بے بہرہ ہونگے جو پیغام اقبال کی روح اور اساس ہے۔ یہ انتخاب ایسا ہی ہے جیسا کہ یورپ کے کسی مستشرق کو سیرت و قرآن کی تعبیرات اور توضیحات کے کام پر مامور کر کے موثر نتائج کی توقع کی جائے بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ مسند اقبال سنبھالنے والے پروفیسر قاضی محمد اسلم سے بھی اگر یہ دریافت کیا جائے کہ آیا کوئی مستشرق قادیانیت کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کر سکتا ہے؟ تو ان کا جواب بھی نفی میں ہوگا۔ قاضی صاحب کے فرقہ کے متعلق حکیم الامت کا جو موقف رہا کیا اس کے پیش نظر آپ کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ اپنے نئے منصب سے انصاف کر سکیں؟ اقبال علیہ الرحمۃ سب مسلمانوں کی طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو خاتم النبیین خیال کرتے تھے ان کے نزدیک نبوت کی کوئی نوع نہیں چنانچہ انہوں نے فرمایا............

اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایام کرد

اس نظرِ انتخاب سے تو اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ یونیورسٹی کے حل و عقد نے ایک قومی تقاضہ پورا کرنے کی بجائے محض ایک آسامی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونیورسٹی حکام سے کوئی اپیل اب عبث معلوم ہوتی ہے البتہ ہم قاضی صاحب سے یہ کہیں گے کہ انہوں نے مسند اقبال کی سربراہی قبول کر کے اپنے آپ کو بھی بڑی الجھن میں ڈالدیا ہے۔ لہذا مناسب یہی ہوگا کہ وہ خود ہی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۹ اپریل ۱۹۶۵ء)

یونیورسٹی کی شاہکار معذرت

پنجاب یونیورسٹی میں مسند اقبال کو ایک قادیانی پروفیسر کے حوالے کرنے پر ہم نے جو کچھ عرض کیا تھا، "نوائے وقت" نے اپنے الفاظ میں ہمنوائی کی، یونیورسٹی کے دانشوروں نے دوسرے ہی دن ایک وضاحتی بیان ارسال کیا، جو روزناموں میں چھپ چکا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بیان عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے رنگ و روغن کی ایک اچھوتی بانگی ہے۔ آج "کوہستان" اور "امروز" نے بھی ہمارے خیال کی توثیق کی ہے۔

اگر مسندِ اقبال قائم کرنے کا مقصد فلسفہ کے نگار خانے میں محض ان کے نام کی عظمت کا اقرار و اعتراف ہے۔ اور تعلیماتِ اقبال کی تعلیم و تشریح سے اس کا کوئی تعلق نہیں، تو یہ امر اور بھی افسوسناک ہے۔ اقبال اس اقرار و اعتراف کے محتاج نہیں۔ کوئی سا شخص اس عنوان سے اشکبار نہ تھا، کہ یونیورسٹی اس انداز میں اشک شوئی کرتی ہے۔ اقبال کے نام پر مسند محض کا قیام کوئی چیز نہیں۔

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یونیورسٹی کے اربابِ انتظام نے وضاحتی بیان دے کر خود اپنے چہرے سے نقاب اٹھادی ہے کہ مسندِ اقبال صرف مسندِ اقبال ہے، فکرِ اقبال نہیں اور ظاہر ہے کہ عوام و خواص میں سے کوئی فرد بھی اس سے مطمئن نہیں۔

اور اگر مسندِ اقبال قائم کرنے کا مقصد واقعی اقبال کے افکار و سوانح اور تعلیمات و نظریات کی تعلیم و تدریس ہے تو پھر یونیورسٹی کا وضاحتی بیان خود اپنے مطالب کی رو سے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو شخص حکمتِ اقبال کی نگرانی پر مامور ہوا ہے، وہ اس منصب کیلئے سب سے زیادہ ناموزوں شخص ہے۔ ہم نے قادیانی جماعت کے بارے میں علامہ اقبال کے جو نظریات پیش کیے ہیں، سوال یہ ہے کہ یونیورسٹی کے کارپردازوں اور قاضی محمد اسلم کے اعوان و انصار کا اس بارے میں مسلک کیا ہے؟

کیا یونیورسٹی علامہ اقبال نوراللہ مرقدہٗ کے ان افکار کو غلط سمجھتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ یہ حوصلہ نہیں کر سکتی اور اگر صحیح سمجھتی ہے، تو اس نے ایک قادیانی پروفیسر کو اس منصب پر فائز کیوں کیا؟ اور اگر اس نے مداہنت کی ہے تو یہ اقبال و اسلام کی روح کے ساتھ بزدلانہ مذاق ہے۔ آخر قاضی محمد اسلم خود ہی مستعفی کیوں نہیں ہو جاتے، جبکہ وہ اس بات سے کماحقہٗ واقف ہیں، کہ علامہ اقبال ان کے نبی کو متنبی اور ان کی جماعت کو خارج از اسلام سمجھتے تھے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء)

”الفضل“ کی اچھوتی بانکی

ہم نے گذشتہ سے پیوستہ شمارے میں اعلان کیا تھا جو اہل قلم علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے فرمودات کی روشنی میں قادیانی جماعت کے احوال وظروف پر مقالہ (Thesis) تیار کرے گا جس سے اس جماعت کی ایجاد کے اسباب و وجوہ معلوم ہوں، اور اس امر کی تصدیق ہوتی ہو کہ اس جماعت کو خاص مقاصد ومصالح کے تحت برطانوی سرکار نے پروان چڑھایا تھا۔ ایڈیٹر ”چٹان بہترین مقالہ کے مصنف کو مقررہ ججوں کے فیصلہ پر اپنی جیب سے پانچ ہزار روپیہ نقد انعام دیں گے۔ ”الفضل“ کے لئے ”چٹان“ کا نام سوہان روح ہے چونکہ ”چٹان“ کے اسی شمارے میں قادیانی پروفیسر کے تقرر پر بھی احتجاج کیا گیا تھا۔ اس لیے ”الفضل“ مضطرب تھا کہ پنجہ آزما ہو، چنانچہ بھیگی بلی کی طرح اس نے غرانا چاہا ہے۔ لیکن اب کے تنہا نہیں آیا اپنا پورا قبیلہ ساتھ لایا ہے۔ ”پیغام صلح“ چیخا ہے، ”الفرقان“ چلایا ہے۔ لاہور کا ایک ادبی ہفت روزہ بھی اس لشکر کے ہراول دستہ میں ہے۔ ہم ان میں سے کسی کو قابل التفات نہیں سمجھتے، یہ مسئلہ ان کے حدود سے باہر ہے، البتہ ”الفضل“ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا جواب دینا ضروری ہوگیا ہے۔

”الفضل“ کی تجویز یہ ہے کہ

”احمدیوں اور مخالفین کے درمیان متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق ایک تحریری مباحثہ برپا کیا جائے۔ سات سات پرچے دونوں طرف سے ہوں۔ پھر ان جواب اور جواب الجوابوں کو تین زبانوں اردو، عربی، انگریزی میں مشترکہ خرچ سے چھپوا کر لائبریریوں اور خاص افراد کو مفت بھیجا جائے۔ اس طرح ایک دفعہ فیصلہ ہو جائے گا۔“

دیکھا آپ نے، اسے کہتے ہیں ”ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ“۔ سوال گندم جواب ریسماں، یہ کمال صرف قادیانی نبوت کو حاصل ہے، کہ وہ ہر معاملہ میں جوا اور سٹہ کھیلتی ہے اور اس کی نبوت کا دارومدار قمار بازی پر ہے۔

قادیانی مسئلہ پر علامہ اقبال کے بیانات موجود ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کے علاوہ کئی اکابر کی تحریریں موجود ہیں۔ ان کا جواب کہاں ہے؟ کہ فرار وگریز کی نئی راہیں تیار کی جارہی ہیں۔

”الفضل“ نے اپنے اس اداریہ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ایڈیٹر ”چٹان“ کی ارادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرحوم مولانا نوراللہ مرقدہٗ کو سخت قسم کی گالی دی ہے۔ یہ صرف مدیر ”الفضل“ نے پاکستان کی سیاسی فضا سے فائدہ اٹھانا چاہا ہے۔ ورنہ وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ مرزا غلام احمد کی تمام تحریریں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک آوارہ جملہ کی سی قدر و قیمت بھی نہیں رکھتی ہیں۔ اور ایک نہیں ہزاروں خانہ ساز نبی، مولانا ابوالکلام آزاد کی جوتی پر قربان کئے جاسکتے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۶ اپریل ۱۹۶۵ء)

اقبال کے بگلا بھگت

علامہ اقبال نے عمر بھر شاہینوں کی آرزو کی، اور نوجوانوں کو مرد کامل کے اوصاف پیدا کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ انہیں عقاب اس لیے عزیز رہا کہ آزاد فضا میں اڑتا ہے، بلند پرواز ہوتا ہے، مردہ شکار نہیں کھاتا، آشیاں نہیں بناتا اور پرندوں میں سب سے زیادہ غیرت مند ہے، لیکن اقبال کے نام پر جن لوگوں نے اکیڈیمیاں بنالی ہیں۔ ان میں بگلا بھگت زیادہ ہیں۔۔۔۔۔۔ بلکہ یوں کہیے کہ اقبال ان بگلا بھگتوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ ہمارے سامنے کراچی کی مجلس اقبال کا وہ مطبوعہ کتابچہ ہے۔ جس میں تین چوتھائی اشتہارات، باقی رطب ویابس ہے۔ یا پھر خاص دوستوں کا چرچا کرنے کے لیے اقبال کے ملفوظات، دو تین پرانے خطوط اور ایک کتاب سے اقتباس۔ اس میں ہے کیا؟

علامہ اقبال کھاتے کیا تھے؟ پہنتے کیا تھے؟ انہوں نے ساری زندگی میں تین دفعہ کوٹ پہنا۔ علی بخش ان کے لیے موٹا جھوٹا خرید لاتا تھا وغیرہ۔ علامہ اقبال کے حقیقی دوستوں کا بیان ہے کہ اس کا نوے فیصد حصہ غلط ہے اور جن صاحب نے علامہ اقبال کے کوٹ کی روایت بیان کی ہے۔ وہ علامہ اقبال کے ہاں جا ہی نہیں سکتے تھے کبھی ایک آدھ پھیرا ڈالا ہو تو الگ بات ہے۔ اور اگر یہ درست بھی ہو تو رطب ویابس پر روپیہ ضائع کرنے سے فائدہ؟ آرٹ پیپر کا بے ڈھنگا مصرف ہے۔ صحیح مصرف تو اقبال کے افکار کی ترویج واشاعت ہے۔ جس سے بگلا بھگت بھاگتے ہیں کیا ان لوگوں کو علم ہے کہ مرزائی امت کی دونوں شاخیں علامہ اقبال کے خلاف یاوہ گوئی میں منہمک ہیں اور بگلا بھگت اپنے گریز و فرار سے ان کی تقویت کا باعث ہو رہے ہیں۔

لاہوری پارٹی کے ایک ماہنامہ "روح اسلام" نے مئی کے شمارے میں مرزا غلام احمد کے دفاع میں علامہ اقبال کے زمانہ طالب علمی کی ایک نظم شائع کی ہے۔ یہ نظم خود ساختہ ہی نہیں بلکہ پھسپھسی ہونے کے علاوہ لغو بھی ہے۔ اس قسم کے شوشے چھوڑنا۔۔۔۔ میرزائیوں نے اپنا وظیفہ حیات بنالیا ہے۔ لیکن بگلا بھگتوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کوئی صاحب دل اس پر روشنی ڈالیں گے کہ اس گریز و فرار اور اعراض واجتناب کی [illegible] ہے؟

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۹ مئی [illegible])

قلم برداشتہ

مدیر چٹان نے چنیوٹ میں جو تقریر کی ہے۔ معلوم ہوا ہے اس سے مرزا کی امت حد درجہ پریشان ہے۔ سب سے پہلے لاہور کا ایک ہفتہ وار قادیانی، مسلم ٹاؤن کے عبدالسلام خورشید کی شہ پر سامنے آیا۔ اس نے مغلظات بکنا شروع کیں، اصل بحث سے گریز کیا اور ناپنے لگا چونکہ اس سے ہمکلامی ہمارے منصب سے فروتر ہے۔ لہذا ہم نے پہلے دن ہی سے اس کو مخاطب کرنا یا اس کی ژاژخائی کا جواب دینا اپنی توہین سمجھا۔ الفضل نے دیکھا کہ اس کالاہوری پچھالائق اعتنا ہی نہیں تو عجمی اسرائیل کا یہ ٹینک فورا میدان میں آ گیا۔ اس نے اپنے ایشلول مرزا ناصر کے خوان استدلال کی خوشہ چینی کرتے ہوئے چار دن تک اپنی نبوت کے حق میں وہی کھڑاک رچایا جو استعماری طاقتوں نے اسرائیل کے حق میں رچا رکھا ہے۔ اس کی ہمنوائی کو تل ابیب یعنی ربوہ کا الفرقان دیان بن کر نکلا ہے۔ جناب ابوالعطاء جالندھری نے آٹھ صفحات میں زہر فشانی کی ہے۔

مدیر چٹان نے جو کچھ کہا۔ اس کی اساس علامہ اقبالؒ کے افکار پر تھی بلکہ جن حوالوں کو ان تینوں نے اپنے "جوابی حملے" کی اساس بنایا ہے، وہ تمام تر علامہ اقبال کی تحریروں سے ماخوذ ہیں، لیکن خانہ ساز نبوت کے ان خوشہ چینوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ علامہ اقبال کا نام نہیں لیتے اس لئے کہ مسلمانوں کے احتساب سے ڈرتے ہیں لیکن ان کی بنیاد پر شورش کاشمیری پر گالی گفتار کرتے ہیں؟ کیا اس کا نام دیانت ہے؟

شورش کاشمیری نے جو کچھ کہا وہ تمام علامہ اقبال کے ارشادات ہیں مثلاً

(۱) قادیانی، برطانیہ کے جاسوس اور اسلام کے غدار ہیں۔

(۲) ان کی تحریک اسلام کے خلاف بغاوت ہی نہیں بلکہ ان کا وجود یہودیت کا مثنیٰ ہے۔

(۳) مسلمانوں میں سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے شریک ہوتے ہیں لیکن مذہباً ان سے الگ رہتے اور تمام دنیائے اسلام کو مرزا غلام احمد کے انکار کی بنیاد پر کافر سمجھتے ہیں

(۴) حکومت کا فرض ہے کہ انہیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دے۔

شورش کاشمیری نے علامہ کے ان نکات کی وضاحت میں تقریر کی، کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جو محض

یادشنام ہو۔ لیکن سارا قادیانی پریس اس پر چلا اٹھا اور لگاتار چلا رہا ہے کہ

''ان دنوں گزرے ہوئے احرار کی نمائندگی ہفت روزہ چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری کر رہے ہیں۔''

ابوالفضل نے ایڈیٹر چٹان کو پسماندگان احرار کا سرخیل لکھا ہے۔ لاہوری ہفتہ وار کے توشہ خانے میں بھی بول و براز ہے۔

سوال گندم جواب ریسماں ایڈیٹر چٹان کو پسماندگان احرار ہونے پر فخر ہے۔ سوال یہ ہے کہ مرزائی پسماندگان انگریز میں سے ہیں یا نہیں؟ مرزا غلام احمد کی تحریریں اس پر شاہد ہیں؟ پھر مرزائی اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟

پہلے اپنے ''پیغمبر'' کے فرمودات کی تردید کریں پھر احرار پر تعریضاً قلم اٹھائیں۔ اپنے عیب کو چھپانے کی انوکھی منطق ہے کہ دوسروں کو گالی دی جائے۔ کیا اس نبوت اور اس خلافت پر مرزائی امت کا دارومدار ہے؟

علامہ اقبال کے بارے میں فرمایئے کہ ان کے ارشادات پر آپ کے جوابات کیا ہیں؟

شورش کاشمیری اس وقت احراری نہیں، اقبال کی نمائندگی کر رہا ہے۔

جواب مرحمت فرمایئے! جواب میں گالی دینا شیوۂ شرفا نہیں۔ ذرا تاریخ محمودیت پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے پھر سوچئے کہ آپ میں کسی شخص کو گالی دینے کا حوصلہ ہے؟

ابوالعطاء صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ہم اس کا مکمل جواب تو شمارہ آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ اس شمارے میں عربوں پر فتنہ اسرائیل کی یلغار کا تذکرہ تفصیل سے ہو گیا ہے لیکن دو چار باتیں زیر قلم تحریر میں عرض کرنی ضروری ہیں۔

اولاً۔ میرزائی قلمکار جو سلطان القلم کے تلامذہ ارشد ہیں تحریر میں شرافت پیدا کریں ورنہ جس لہجہ میں انہوں نے گفتگو شروع کی ہے اس کا جواب دیا گیا تو بہشتی مقبرے کی ہڈیاں چٹخنی شروع ہو جائیں گی اور چوہدری ظفر اللہ خان کی سیرت سے گلستان کا باب پنجم نکال کر شیزان ہوٹل کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

عزت کے خواہاں ہو تو عزت کرنا سیکھو

ثانیاً۔ عاجزی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جن میں انکسار ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میرزا غلام احمد کی دینی بصیرت ایک خود ساختہ عمارت ہے جس میں نہ فہم قرآن کی گہرائی ہے اور نہ ادب و انشاء کی گیرائی۔ ان کا مجموعہ شعر درثمین شاعرانہ عیوب کا مرقع ہے۔ جو شخص شاعرانہ محاسن نہیں رکھتا اس میں ''پیغمبرانہ محاسن'' کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ آج تک ایک میرزائی بھی ایسا نہیں جس کو قدرت نے شاعری کا صحیح ذوق دیا ہو یا جس کو انشاء پر قدرت ہو یا جو اردو، عربی، فارسی کی چند سطریں صحیح لکھ سکتا ہو۔ بفضلہٖ تعالیٰ ایڈیٹر چٹان ہر میرزائی مصنف، شاعر اور مبلغ کی تحریر و تقریر میں زبان و بیان کے اعتبار سے کئی پشتوں تک اصلاح دے سکتا ہے۔

ثالثاً۔ ہمیں معلوم ہے کہ میرزائی افسروں کی لادین کھیپ سے رابطہ پیدا کر کے خفی و جلی بنیادوں پر جھوٹی رپورٹیں اور بے مقصد تبصرے کرانے کے عادی ہیں۔ نیز انکوائری رپورٹ میں سی آئی ڈی کے مراسلے اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ ہماری گرفتاری میں بھی بروایت ان میرزائی افسروں کی ذریت کا ہاتھ تھا۔ اب بھی ان کی تگ و دو کا سارا انحصار اس پر ہے کہ اپنے مذہبی پاکھنڈ کو سیاسی ہتھکنڈوں سے جاری رکھیں اور ان عناصر کے خلاف ژاژ خائی کر کے پہلو بچاتے رہیں جو ان کی طرح برطانوی سرکار کے گماشتے نہیں تھے جنہوں نے سامراج سے ٹکر لی اور آزادی کی جدوجہد میں قربانی اور استقامت کی شمعیں جلاتے رہے۔ میرزائیوں کا شعار ان شمعوں کو گل کرنا اور برطانوی سامراج کی خدمت بجا لانا تھا۔ انہیں اب یہ ہتھکنڈے جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔

رابعاً۔ میرزائی اصل سے انحراف کر کے نقل پر اتر آئے ہیں۔ انہیں کذب و افتراء سے عار نہیں۔ احرار کے معاملہ میں لاہوری لے پالک اور اس کے چچیرے و خلیرے بھائی اس ڈھٹائی سے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جھوٹ کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹوں پر لعنت بھیجی ہے اور فی زمانہ اس کا صحیح اطلاق غلام احمد کی امت پر ہوتا ہے۔

خامساً۔ ابوالعطا صاحب نے اپنے ویاکھیان کے آخر میں ہمیں تحریری مناظرہ کا چیلنج دیا ہے۔ اول تو یہ تحریری مناظرہ خوب ہے۔ آمنے سامنے کیوں نہیں؟ کھل کر آیئے مسلمانوں کے شہروں میں نہیں تو ہم ربوہ میں آنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ عام مسلمانوں کو بھی اس میں شریک ہونے کی اجازت ہو۔ اس کے باوجود ہم تحریری مناظرہ کیلئے بھی تیار ہیں اور جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس کی صحت پر اصرار کرتے ہیں۔ اصل مسئلہ چند نکات کا نہیں پوری میرزائیت اور اس کے خدوخال کا ہے۔ بحث اس پر ہونی چاہئے کہ

(۱) مرزا غلام احمد برطانوی حکومت کے خود کاشتہ تھے یا نہیں؟

(۲) انہوں نے برطانوی حکومت کی وفاداری پر مذہباً صاد کیا اور چاپلوسی کی حد تک چلے گئے۔

(۳) میرزائیت کے مشن صرف ان علاقوں میں قائم ہیں۔ جہاں برطانوی نوآبادیاں رہی ہیں یا برطانوی اثرات موجود ہیں۔

(۴) میرزائیت نے اصل اسلام سے بغاوت کر کے مسلمانوں کی دینی وحدت کو تاراج کیا۔

(۵) میرزائی ایک مدت سے اپنی الگ ریاست قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

(۶) میرزائیت مسلمانوں کے سواد اعظم سے خارج ہے۔

اب ایک اور بات بھی سن لیجئے یہ دو چار سوال ہیں، فرمائیے! کیا جواب ہے؟

(۱) اسرائیل کی عربوں سے جنگ میں آپ کا کردار کیا رہا؟

(۲) آپ کا جو مشن اسرائیل میں تھا اسلام کی اس مصیبتِ عظمیٰ پر اس کا رول کیا تھا؟

(۳) کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے مشن نے اسرائیل کی فتح پر اسرائیل کے صدر کو مبارک باد دی؟

(۴) کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ بیت المقدس میں اسرائیل کے داخلہ پر اس مشن نے عربوں کی اذیت میں اضافہ کیا اور انہیں گمراہ کرنا چاہا؟

(۵) کیا سبب ہے کہ صرف آپ کے مشن کو اسرائیل میں رہنے کی اجازت ہے؟ یہ مسلمانوں سے انقطاع کا باعث ہے یا مغلوب مسلمانوں میں برطانوی مقاصد اور اسرائیلی اغراض کی آبیاری کا حیلہ ہے؟

(۶) اس سے آپ انکار کر سکتے ہیں کہ آپ مسلمانوں کی شکلیں بنا کر مسلمان ملکوں میں استعماری قوتوں کیلئے جاسوسی کرتے ہیں۔

(ہفت روزہ چٹان ۱۹۔ جون ۱۹۶۷ء)

سالک اور ابن سالک

سیاسی اختلاف کے باوجود مولانا عبدالمجید سالک سے ہمارے تعلقات نہ صرف مخلصانہ تھے بلکہ نیازمندی کا رشتہ انکی وفات تک قائم رہا اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن ہمارا دل ان کی محبت و اخلاص سے معمور ہے اس کا بین ثبوت ایڈیٹر چٹان کی زیر طبع کتاب نورتن ہے جس میں لاہور کے نو صحافیوں کے سوانح و افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلا خاکہ سالک صاحب کے متعلق ہے۔ اتنی خوبصورت تصویر کسی اور اہل قلم نے اب تک پیش نہیں کی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ان جامع صفات سالک کے فرزند ارجمند جناب عبدالسلام خورشید یا تو اپنی کسی بیماری کے باعث اچھال چھکا واقع ہوئے ہیں۔ یا پھر ان کی فطرت ہی کچھ ایسی ڈھلی ہوئی ہے کہ قلم سے شوشے چھوڑنا ان کی طبیعت کا جزو لاینفک ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے قسم کھالی ہے کہ ہر وہ شخص جو ان کے والد مرحوم کا دوست تھا یا جن سے ان کے والد مرحوم کے نیازمندانہ تعلقات تھے۔ یا جن اکابر کو سالک مرحوم اپنا بزرگ سمجھتے تھے خورشید صاحب انکے معاملہ میں کوئی نہ کوئی بات اپنے قلم سے ایسی ضرور نکالیں گے جو تلخی زہر رکھتی ہو۔ ان کے قلم سے مولانا ظفر علی خاں بچے نہ مولانا ابوالکلام، نہ حمید نظامی حتی کہ اب علامہ اقبال کی تربت پر بھی ''پھول'' بکھیر رہے ہیں۔

حمید نظامی کے متعلق جو کچھ لکھا وہ ان کی نیش زنی کا نمونہ تھا۔ علامہ اقبال پر توجہ فرمائی تو ان کی سیرت پر رنگ رلیوں کا غلاف چڑھا دیا۔ نوائے وقت نے اس کا نوٹس لیا۔ معاملہ معمولی تھا۔ خورشید صاحب اپنے جی میں عہد کر لیتے کہ آئندہ قلم کو احتیاط سکھائیں گے مگر انہوں نے لاہور کے ایک ہفتہ وار کا دامن تھاما ہے۔ اس ہفتہ وار کے قادیانی مسلک مدیر سے ہمیں دوستانہ تعارف ہے تاہم انہوں نے بھی اس مضمون کو غنیمت سمجھا اور قادیانیت کے متعلق اقبال کے محاسبہ کا انتقام بزعم خویش اس مضمون کی مکرر اشاعت کے ساتھ اپنے اس نوٹ سے لیا ہے۔ یہ نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔

''ہماری شروع ہی سے یہ رائے رہی ہے کہ جو جذباتیت پرست علامہ اقبال کو ایک عظیم ملت پرست شاعر کے علاوہ کچھ اور بنانے یا ثابت کرنے کی فکر میں ہیں وہ تاریخ ہی سے نہیں خود علامہ موصوف سے بھی دشمنی فرما رہے ہیں کہ اپنے نقطہ عروج کو پہنچ کر جب ان کا یہ مفروضہ حقائق کی کسوٹی پر باون تولے پورا

نہ اترے گا قلب و ذہن علامہ کے اصل اوصاف و خصائل کے بارے میں بھی شک میں پڑ جائیں گے۔ اس حقیقت سے انکار کب ممکن ہے کہ علامہ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بڑا رنگین گزرا، اور ایک عمر تک گانا سننا، ستار بجانا اور پینا پلانا آپ کے شب و روز کے معمولات کا حصہ رہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تو اپنے اس مقالہ میں (جو پچھلے دنوں روزنامہ مشرق میں شائع ہوا اور جس پر انہی جذباتیت پرستوں نے ایک حد تک لے دے بھی کی) صرف یہ لکھا ہے کہ "مرحوم کی زندگی کے اواخر میں ایک ایسا موڑ آیا۔ جس کے بعد انہوں نے کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور ساری رنگ رلیاں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔" اس پر لے دے کا مطلب؟ اور حاصل؟ یہ یقیناً اس غیر مئوثر لے دے ہی کا ردعمل ہے کہ ہم اس حقیقت آفریں مقالہ کو روزنامہ "مشرق" کے شکریے کے ساتھ "لاہور" کی اشاعت (زیر مطالعہ) میں شامل کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر لاہور۔ ۱۵ مئی)

خط کشیدہ الفاظ کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔ مدیر ہفت وار کی خدمت میں تو یہ التماس ہے کہ اقبال کو کوئی شخص بھی یہاں کچھ اور بنانے یا ثابت کرنے کی فکر میں نہیں۔ نہ وہ ظلی و بروزی نبی تھے نہ کوئی انہیں پیغمبر بنانے کی فکر میں ہے ان سے مسلمانوں کی عقیدت کا ایک ہی سبب ہے کہ وہ سرور کائنات ﷺ کے حلقہ بگوش تھے۔ جن لوگوں نے نبوت کا سرقہ کرنا چاہا۔ اقبال نے ان کا سختی سے محاسبہ کیا۔ آپ اگر اقبال کے دامن میں الزامات کی یہ خاک ڈالیں اور عیب بینی کا شوق آپ کو یہاں تک پہنچا دے تو عقیدۃً آپ کو اس کا حق پہنچتا ہے کیونکہ علامہ اقبال قادیانیت کے اس دور میں سب سے بڑے محاسب تھے انہوں نے "احمدیت" کو خاک نامرادی میں سلا کردم لیا۔ لیکن خورشید صاحب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس انداز میں ژاژ خائی کریں۔ سیرت نگاری کا یہ انداز یورپ کی نقالی ضرور ہے لیکن بھونڈی نقالی۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ خورشید صاحب اپنی فطرت کو روک نہیں سکتے تو اپنے والد محترم مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے گور و کفن پر رحم کریں۔

کیا انہیں معلوم نہیں کہ ان کے اس مضمون نے اقبالئین کو نعل در آتش کر رکھا ہے۔ مرکزیہ مجلس اقبال کی مجلس عاملہ میں اس غصہ کو روکنے کا باعث ہم ہوئے ہیں۔ خورشید صاحب شاید اس سے بے خبر ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کو جواب ملا تو ان کے لئے قلم کی سرزمین میں ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۲ مئی ۱۹۶۷ء)

اقبال سے بغض کی بناء پر نہرو کا استقبال

قادیانیت کا ایک لاہوری متنبی آج کل ہمارے خلاف خانہ ساز نبوت کی ٹکسالی زبان کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ بزعم خویش اس نے ہمیں نہرو کا پیشہ ور ایجنٹ لکھ کر مصلح موعود کی قبر پر فاتحہ پڑھی ہے۔

حقیقت حال کیا ہے۔۔۔۔؟

روزنامہ الفضل کا اقتباس ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال سے عناد انہیں کہاں کہاں نہیں لے گیا۔ اور ان کے شوقِ جبہ سائی پر کس آستانہ کی خاک نہیں ہے۔ اگر یہ حوالہ غلط ثابت ہو تو ہم ہر سزا و صعوبت کے حقدار ہیں۔ بلکہ جناب ابوالعطاء جالندھری کو دس ہزار نقد چہرہ شاہی پیش کرنے کے لئے تیار۔ (ادارہ)

فخر وطن پنڈت جواہر لال نہرو کا لاہور میں شاندار استقبال

آل انڈیا نیشنل لیگ کورز کی طرف سے

(الفضل کے خاص رپورٹر کے قلم سے)

لاہور۔ ۲۹ اپریل۔ آج حسب پروگرام پنڈت جواہر لال صاحب نہرو لاہور تشریف لائے۔ پنجاب پراونشل کانگرس کمیٹی کی خواہش پر (قادیانی جماعت کی) آل انڈیا نیشنل لیگ کورز کی طرف سے آپ کے استقبال کا انتظام کیا گیا تھا۔ چونکہ کانگرس نے صرف پانصد والنٹریوں کی خواہش کی تھی، اس لئے قادیان سے تین صد اور سیالکوٹ سے دو صد کے قریب والنٹر ۲۸ مئی کو لاہور پہنچ گئے۔ قادیان کی کور دس بجے پہنچی۔ ی کے آنے پر جناب صدر آل انڈیا نیشنل لیگ اور قائد اعظم آل انڈیا نیشنل لیگ کورز موجود تھے۔ پولیس کا بھی زبردست مظاہرہ تھا۔ کانسٹیبلوں کی بہت بڑی تعداد کے علاوہ پولیس کے بڑے بڑے افسر بھی موجود تھے۔ قادیان سے کار خاص کے سپاہی ساتھ آئے اور عصر تک ساتھ رہے۔ احمدیہ ہوسٹل میں جہاں قیام کا انتظام تھا۔ جناب شیخ بشیر احمد صاحب (قادیانی) ایڈووکیٹ لاہور صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے ایک مختصر مگر برمحل اور برجستہ تقریر کی جس میں بتایا کہ آج ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے کے لئے آئے ہیں کہ آزادی وطن کی خواہش میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اور ہم نے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا سے ظلم و ناانصافی کو مٹانا ہے

اور صحیح سیاسیات کی بنیاد رکھتی ہے۔ آپ لوگ اس موقعہ پر کسی صورت میں کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو سلسلہ کے لئے کسی طرح بدنامی کا موجب ہو۔

علی الصباح چھ بجے تمام باوردی والنٹر باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ یہ نظارہ حد درجہ جاذب توجہ اور روح پرور تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں اس طرف اٹھ رہی تھیں۔ استقبال کا تقریباً تمام انتظام کور ہی کر رہی تھی۔ اور کوئی آرگنائزیشن اس موقعہ پر نہ تھی۔ سوائے کانگرس کے ڈیڑھ دو درجن والنٹریوں کے۔ اسٹیشن سے لے کر جلسہ گاہ تک اور پلیٹ فارم پر انتظام کے لئے ہمارے والنٹرز موجود رہے۔ پلیٹ فارم پر جناب چودھری اسد اللہ خان صاحب (قادیانی) بیرسٹر ایم ایل سی قائد اعظم آل انڈیا نیشنل لیگ کور بہ نفس نفیس موجود تھے اور باہر جہاں آکر پنڈت جی نے کھڑا ہونا تھا شیخ صاحب موجود تھے۔ ہجوم میں بے حد اضافہ ہو گیا اور لوگوں نے صفوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ مگر ہمارے والنٹریوں نے قابلِ تعریف ضبط و نظم سے کام لیا اور حلقہ کو قائم رکھا۔ پنڈت جی کے اسٹیشن سے باہر آنے پر جناب شیخ بشیر احمد صاحب (قادیانی) ایڈووکیٹ صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے لیگ کی طرف سے آپ کے گلے میں ہار ڈالا۔ کور کی طرف سے حسب ذیل موٹو جھنڈیوں پر خوبصورتی سے آویزاں تھے۔

Beloved of the nation, Welcome you.

محبوب قوم خوش آمدید

We join in Civil Liberties Union

ہم شہری آزادیوں کی انجمن میں شامل ہوتے ہیں۔

Long Live Jawaher Lal.

جواہر لال نہرو زندہ باد

کور کا مظاہرہ ایسا شاندار تھا کہ ہر شخص اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور لوگ کہہ رہے تھے کہ ایسا شاندار نظارہ لاہور میں کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کانگریسی لیڈر، کور کے ضبط و ڈسپلن سے حد درجہ متاثر تھے اور بار بار اس کا اظہار کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک لیڈر نے جناب شیخ صاحب سے کہا اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں تو یقیناً ہماری فتح ہوگی۔ پنڈت جی کے قیام گاہ کی طرف تشریف لے جانے پر کورز باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے احمدیہ ہوسٹل میں آئیں اور وہاں جناب شیخ صاحب نے پھر ایک تقریر کی۔ جس میں کور والوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ آپ لوگ ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں انصاف

قائم کرنے اور ظلم و ناانصافی کو مٹانے کے لئے ہر قربانی کرنا آپ کا فرض ہے۔

احمدیہ ہوسٹل میں کھانے کا بہت اچھا انتظام تھا۔ جس کے مہتمم بابو غلام محمد صاحب تھے۔ ماسٹر نذیر احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ احمدیہ ہوسٹل نے بھی مہمانوں کی آسائش کے لئے بہت کوشش کی۔ قادیان کی کورز ۲۹ کو نو بجے کی گاڑی سے واپس پہنچ گئیں۔

اخبار الفضل قادیان جلد نمبر ۲۳ شمارہ نمبر ۲۷۸

مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۳۶ء

استقبال کی وجہ:

اگر پنڈت جواہر لال صاحب نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لئے وہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے۔ جیسا کہ احرار نے کیا ہوا ہے تو اس قسم کا استقبال بے غیرتی ہوتا لیکن اگر اس کے برخلاف یہ مثال موجود ہو کہ قریب کے زمانہ میں ہی پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال صاحب کے ان مضامین کا رد لکھا ہے جو انہوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیئے جانے کے لئے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گذشتہ رویہ کے خلاف ہے۔ تو ایسے شخص کا جب کہ وہ صوبے میں مہمان کی حیثیت سے آ رہا ہو ایک سیاسی انجمن کی طرف سے استقبال بہت اچھی بات ہے۔ (میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا خطبہ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد نمبر ۲۴ شمارہ ۲۸۷ مورخہ ۱۱ جون ۱۹۳۶ء)

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۶ جون ۱۹۶۷ء)

سلطان القلم کے جانشین

رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

"الفضل" کے جواب میں

پچھلے پانچ چھ ہفتوں میں قادیانی دانشوروں کے بحث ونظر کا اندازہ ومعیار معلوم ہوا ہے۔ سنا کرتے تھے بلکہ تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ اس جماعت کے مبلغ ومدیر ڈھٹائی میں لاجواب ہیں۔ لیکن چنیوٹ میں مدیر چٹان کی تقریر کے بعد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یا پھر چٹان نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کی گرفت سے عاجز آ کر قادیانی امت کے اہل قلم نے جو استدلال اختیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ سوال گندم جواب ریسماں کی بدترین خصوصیتیں ان کے دماغ میں جمع ہو گئی ہیں۔ قادیانی اہل قلم کا طرز استدلال ہی انہیں جھٹلانے کے لئے کافی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں فرمایئے علامہ اقبال نے جو کچھ آپ کے بارے میں تسلسل وتواتر سے کہا وہ درست ہے کہ غلط؟ غلط ہے تو آپکے پاس اس کا جواب کیا ہے؟ الفضل ربوہ لکھتا ہے کہ شورش صاحب کو خدا جانے کس نے علامہ اقبال کا نمائندہ بنا دیا ہے۔

"ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو"

یہ جواب ہے علامہ اقبال کے ان مقالات وخیالات کا جو قادیانی تابوت میں میخ کا کام دے گئے ہیں۔ کیا علامہ اقبال نے اپنے ان خیالات پر خط تنسیخ کھینچ دیا تھا؟ کیا ان کی موت کے بعد یہ حصہ منسوخ ہو گیا؟ منسوخ ہوا تو کس نے کیا؟ اور اس کا مجاز کون ہے؟ پھر یہ ممکن ہے کہ صاحب تصنیف کی رحلت کے بعد ورثاء اس کی تصنیف کو منسوخ یا متروک کریں اور ان کا یہ فعل صاحب تصنیف کا فعل سمجھا جائے۔ یہ تو صحیح ہے کہ جائداد کی وارث اولاد ہوتی ہے۔ لیکن اس کا جواز آج تک قائم نہیں ہوا کہ اولاد میں سے کوئی فرد، والد کے ان فرمودات پر قلم کھینچ دے جو علم کی میراث ہو کر قرطاس وقلم کو منتقل ہو چکے ہیں۔ صرف دو تحریفیں ساری تاریخ تحریر میں پائی جاتی ہیں۔

ایک عیسائی علما کی تحریف، جس سے بائبل مجروح ہوئی ہے۔

دوسری میرزا بشیر الدین محمود کی تحریف، کہ اپنے والد کی تحریروں کے عیب چھپانے کے لئے انہوں

نے عجیب وغریب جسارتیں کی ہیں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے قادیانی نبوت اور قادیانی امت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ان کے اسلامی فکر اور دینی شغف کی معراج ہے اور اس سے انکار کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں کا حاصل تھا۔

علامہ اقبال نے عمر بھر کے غور وفکر اور مطالعہ ومشاہدہ کے بعد قادیانی نبوت کا جس کمال علم سے محاسبہ کیا اسی کا نتیجہ ہے کہ اس امت کو انہوں نے نہ صرف ہندوستان کا غدار کہا بلکہ اسلام کا غدار بھی لکھا اور اس کو اپنی بصیرت کا حاصل قرار دیا (ملاحظہ ہو پنڈت جواہر لال نہرو کے نام علامہ اقبال کا خط) جواب علامہ اقبال کے ارشاد کا مرحمت فرمایئے۔ کوس آپ ایڈیٹر چٹان کو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ کیا موت کے بعد کسی شخص کی تحریریں ساقط ہو جاتی ہیں۔ ان کا حوالہ دینا اور اس پر بحث ونظر کی عمارت قائم کرنا غلط ہے؟ اگر یہ معیار ہے تو پھر آپ نے میرزا غلام احمد صاحب کی تحریریں کیوں منسوخ نہیں کی ہیں؟ آج تک کیوں نقل ہو رہی یا چھاپی جا رہی ہیں سیدھا سادا سوال ہے کہ علامہ اقبال نے جو کچھ فرمایا اس کا جواب کیا ہے؟ آپ چونکہ مسلمانوں سے ڈرتے ہیں محض لئے اقبال کا جواب نہیں دیتے لیکن ایڈیٹر چٹان کے خلاف غرا رہے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے۔

(۱) علامہ اقبال نے آپ کو مسلمانوں میں سے خارج کر دینے کا مطالبہ کیا یا نہیں؟

(۲) انہوں نے آپکو یہودیت کا ثنیٰ قرار دیا۔

(۳) انہوں نے آپ کو اسلام اور ہندوستان کا غدار لکھا اور اس کی صحت پر اصرار کیا۔

(۴) انہوں نے آپ کو ایک سیاسی جماعت قرار دیکر مسلمانوں کی دینی وحدت میں نقب لگانے کا مجرم گردانا۔

(۵) انہوں نے آپ کو شاتم رسول ﷺ قرار دیا۔

ان کا جواب دیجئے یا فرمایئے کہ علامہ اقبال نے ان مطالبات کو واپس لے لیا تھا۔ اس سے مراجعت کر لی تھی۔ کسی خط، کسی تحریر، کسی بیان میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی فرمائی تھی۔ اگر یہ نہیں ہے اور بالشبہ نہیں ہے۔ تو پھر ان کے خیالات پر ایڈیٹر چٹان کے خلاف سب وشتم کے معنی کیا ہیں؟

حد ہو گئی کہ ان سوالات کے جواب میں علامہ اقبال کی ۱۹۱۰ء کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ جب کبھی میرزائی علامہ اقبال کے ارشادات سے عاجز اور محصور ہوتے ہیں اسی تقریر کو پیش کرتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اسٹریچی ہال علی گڑھ میں جو خطبہ دیا تھا اس میں یہ الفاظ موجود تھے کہ

"پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں"

اول تو اس میں میرزا صاحب کی نبوت اور انکے جانشینوں کی خلافت کا جواز نہیں۔

دوم یہ اس زمانے کی بات ہے جب میرزا غلام احمد نے مناظر اسلام کی حیثیت سے جماعت سازی کی تھی اور ان کے باطنی دعاوی سامنے نہیں آئے تھے۔

اس زمانہ میں بہت سے لوگ ظاہری وجوہ سے ان کے معترف تھے جب انکی حقیقت کھلی اور میرزا بشیر الدین محمود نے خلافت کو ایک سیاسی کاروبار کی شکل دی تو ایک ایک ورق کھل گیا۔ نتیجۃً جو لوگ ایک عام شہرت کے باعث میرزا کو مناظر و مبلغ خیال کرتے تھے ظلی اور بروزی نبی کی اصطلاحوں سے چوکنا ہو گئے اور ان پر وقت کے ساتھ تمام حقیقتیں منکشف ہو گئیں کہ میرزا غلام احمد اور اس کے خلافتی جانشینوں کا مقام و منشا کیا ہے اور وہ مسلمانوں میں دینی ارتداد کی ایک سیاسی تحریک ہیں۔

یہ ایک شوخ چشمانہ استدلال ہے کہ ۱۹۱۰ء کی تحریر کو جواز بنالیا جائے اور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک کی تحریریں منسوخ قرار دی جائے۔ آخری بات پہلی ہوئی ہے یا آخری؟

قرآن مجید میں کئی آیتیں ہیں جنہیں بعد کی آیتوں نے منسوخ کیا مثلاً حرمت شراب، حکم ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو پھر شراب حرام ہوگئی اور ہر حالت میں حرام ہوگئی۔ اب اگر یہ اصرار کیا جائے کہ شراب صرف نماز میں حرام ہے اور قرآن پاک میں لکھا ہے تو اس کو صرف قادیانی منطق ہی کہا جاسکتا ہے۔ ایک ہی چیز کے بارے میں کسی شخص کی آخری رائے ہی قطعی رائے ہوتی ہے۔

اسی طرح کا ایک اور اقتباس ۲۹ ستمبر ۱۹۰۰ء کی تحریر سے کیا گیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کے ایک مضمون صوفی حضرت عبدالکریم جیلانی سے ماخوذ ہے۔ ہمارے سامنے وہ مضمون نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قادیانی حوالوں میں تلبیس کر جاتے ہیں تاہم ایک لحظہ کے لئے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ علامہ اقبال ہی کے الفاظ ہیں یعنی انہوں نے اس بحث میں ''میرزا غلام احمد کو جدید ہندی مسلمانوں کا اغلباً سب سے بڑا دینی مفکر لکھا ہے۔''

تو اس سے بھی یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا کہ وہ میرزا غلام احمد کو مسیح موعود یا ظلی و بروزی نبی مانتے تھے یہ تو ایک عمومی تاثر تھا جو اس وقت کے مباحث سے پیدا ہو گیا تھا۔ جب میرزا صاحب مار آستین نکلے یا اس وقت کی صورتحال سے ان کا دماغ خراب ہو گیا تو معترفین نے اپنی رائیں تبدیل کر لیں۔۔۔۔۔۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جس زمانہ کی یہ تحریریں پیش کی جارہی ہیں اولاً تو ان تحریروں کو علامہ اقبال نے اپنے فکری و نظری ارتقا کے بعد لائق اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ یہ ان کی ابتدائی تحریری مشقیں تھیں۔ جب ان کا اسلامی

شعور اور دینی تبحر پختہ ہو گیا تو ان کے خیالات روشن ہو کر قوم کیلئے سنگ میل ہو گئے اور یہی افکار و نظریات ہیں جن کی صداقت پر انہیں حکیم الامت، شاعر مشرق اور ترجمان اسلام کہا جاتا ہے۔ اور جس کی اساس پر انکے حکیمانہ وجود کا شہرہ ہے۔

۱۸۹۹ء میں حضرت علامہ نے ایم اے کیا۔ ۱۹۰۰ء میں انکی عمر صرف ۲۳ برس کی تھی۔ یہاں تک وہ ایک شاعر تھے اور انکی فکر کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس عہد کی تحریروں کے اقتباس تو قادیانی امت اپنی ''روایتی سچائی'' کے لئے بطور سند استعمال کرتی ہے۔ لیکن جس عمر میں وہ پختہ ہو کر مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے اس عمر کی متاع فکر سے فرار غایت درجہ کی بوالعجبی ہے کوئی سا طرز استدلال بھی انکی تصدیق نہیں کرسکتا ہے؟

اقبال کبھی طالبعلم بھی تھے تو کیا اس عمر کے اقوال کو حجت قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مشق سخن کے ابتدائی دور میں بہت سے اشعار لکھے جنہیں خیالات کی تبدیلی اور نظریات کی صحت کے بعد حذف کر دیا تو کیا ہم اس کلام کو بھی ان کے مستند کلام پر فوقیت دے سکتے ہیں۔

میرزائیوں کی منطق عجیب و غریب ہے کہ ایک طرف تو انہیں اپنے ''ربانی مشن'' ہونے پر اصرار ہے دوسری طرف وہ اپنی ۔۔۔۔۔ نبوت و خلافت کے جواز میں انہی لوگوں کی ابتدائی تحریریں لاتے ہیں جو ان کے سب سے بڑے محاسب ہیں اور جن کے سن شعور کی تحریروں نے ان کی عمارت کو بیخ و بن سے ہلا دیا ہے۔۔۔۔۔ اگر قادیانی نبوت اور اس کی خلافت کے سچا ہونے پر اصرار ہے تو اقبال کی انگلی تھام کر کھڑا ہونے کی کوشش بے معنی ہے۔ اس انگوٹھے کے متعلق فرمایئے جو اقبال نے آپ کی شہ رگ پر رکھا ہے۔

الفضل نے مولانا عبدالمجید سالک کے حوالے سے علامہ اقبال کی میرزا غلام احمد اور حکیم نور الدین سے ''والہانہ محبت'' کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ حضرت علامہ نے طلاق کی شرعی حیثیت دریافت کرنے کے لئے میرزا جلال الدین (بارایٹ لا) کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا تھا۔

سالک صاحب نے یاران کہن میں ایک شوشہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی چھوڑا تھا۔ مولانا نے سختی سے ڈانٹا تو سالک صاحب کو تردید و تصحیح کرنی پڑی۔ علامہ اقبال زندہ ہوتے تو سالک صاحب علامہ اقبال کے واضح خیالات جانتے ہوئے اولاً کبھی یہ حوصلہ نہ کرتے، ثانیاً حوصلہ کرتے تو تردید کرنی پڑتی، ثالثاً حضرت علامہ کی زندگی میں انہوں نے کبھی یہ نہیں لکھا اور نہ کسی سے ذکر کیا۔

سالک صاحب کا یہ رویہ اکثر معمہ رہا کہ مختلف اکابر کے تذکرے میں وہ میرزا صاحب کو ضرور

لاتے رہے جس سے مرزا صاحب کی صفائی یا بڑائی مقصود ہو، حالانکہ سوانح وافکار میں میرزا صاحب کا ذکر کامل بے جوڑ ہے۔ایک وجہ تو اس کی یہ ہے کہ مولانا سالک کے والد قادیانی تھے اور مسلمانوں نے انہیں اپنے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سالک صاحب کے چھوٹے بھائی آج تک قادیانی ہیں۔تیسرا سبب یہ ہے کہ میرزا بشیر الدین محمود کے ساتھ مولانا عبدالمجید سالک کے تعلقات کا ایک خاص سانچہ تھا۔خلیفہ صاحب اپنی تاریخ کا سروسامان بنانے کے لئے قلم سالک سے اس قسم کی روایتیں وضع کروالیتے تھے اس کے باوجود قادیانی امت کی سنگدلی ملاحظہ ہو کہ مولانا سالک کے انتقال پر ان کے سگے چھوٹے بھائی نے ان کا جنازہ نہیں پڑھا تھا اور یہ تماشہ مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں راقم الحروف نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔نبوت کی روایتیں ہمیشہ ثقہ راویوں سے چلتی ہیں۔کیا میرزا غلام احمد کے پیرو سالک صاحب کو ثقہ راوی سمجھتے ہیں؟ اس حد تک جس حد تک کہ ان کے متعلق تصدیقی پہلو نکلتا ہو، یا اس کے علاوہ دوسرے افکار وعقائد میں بھی۔ آدمی کے ثقہ ہونے کا معیار ہمیشہ اسکی ساری زندگی کے اعمال واقوال ہوتے ہیں نہ کہ ان اعمال واقوال کا کوئی ایسا جزو جو حسب حال ہو۔

الفضل نے ۲۴۔ جون کے زیر بحث اداریہ میں علامہ اقبال کے متذکرہ حوالوں سے اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کی احمقانہ جسارت کے بعد لکھا ہے کہ۔۔۔۔۔۔

ہم علامہ مرحوم کا بڑا احترام کرتے ہیں۔اس لئے صرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ۔۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اور وہ اشارہ کیا ہے؟

چوہدری ظفر اللہ خاں ایک خاص عہدہ پر نہ لئے جاتے تو یہ تحریریں بھی ہرگز وجود میں نہ آتیں
(الفضل صفحہ ۲۔ مورخہ ۲۴۔ جون ۱۹۶۷ء)

اناللہ وانا الیہ راجعون بغض سامنے آگیا۔اس سے بڑھ کر خود ساختہ نبوت کی مداہنت اور خود کاشتہ خلافت کی خیانت اور کیا ہو سکتی ہے؟ بہر حال الفضل نے اعتراف کر لیا کہ اس کے دل میں کھوٹ ہے اور اس کا نام اس نے احترام رکھا ہے۔

ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ذرا کھل کر بولیے۔

ربانی مشن ہونے کا دعویٰ اور مصلحتوں کی مینا کاری؟ اعتراف کیجئے کہ آپ کی جماعت اسرائیل کا عجمی پودا ہے۔اور آپ ربوہ کے تل ابیب میں بیٹھ کر مسلمانوں کی معنوی قوت پر اپنی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔علامہ اقبال کے فرمودات کو آپ ذاتیات میں نہیں لا سکتے کہ انہیں چوہدری ظفر اللہ خان کا عہدہ خاص ہونے کا صدمہ تھا۔سوال تو وہ ہیں جو حضرت علامہ نے اپنے مقالات میں اٹھائے ہیں جوابات یہ نہیں جو آپ کے نہاں خانہ دماغ سے نکلے ہیں؟

سوال یہ ہے کہ آپ کا مذہب برطانوی حکومت کے استعماری مقاصد کی پیداوار ہے یا نہیں؟

آپ فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کو چوہدری ظفر اللہ خاں کے خاص عہدے پر مقرر ہونے کا صدمہ تھا؟ آخر فہم وفراست کی کونسی شکل ہے جو اس جواب کو صحیح قرار دے سکتی ہے؟

ٹامک ٹوئیاں مارنا چھوڑیئے اور اس کا جواب عنایت فرمائیے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۳ جولائی ۱۹۶۷ء)

روح اقبال بنام ممتاز حسن

روزنامہ امروز لاہور کی اطلاع کے مطابق میرزائیوں نے ربوہ میں دوروزہ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کانفرنس وسط اکتوبر میں منعقد ہوگی۔ خبر میں کہا گیا ہے کہ اس کانفرنس کا افتتاح نیشنل بنک کے مینیجنگ ڈائریکٹر ممتاز حسن جو اقبال اکادمی کراچی کے چیئر مین بھی ہیں، فرمائیں گے۔ جو مقالات پڑھے جائیں گے ''ذکر اردو'' کے نام سے شائع ہوں گے۔ دو سو مندوبین کی شرکت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ محکمہ ریلوے نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لیے رعایتی ٹکٹ جاری کرنے کا اعلان کیا ہے۔

اعلان کے مطابق زبان اور اس کے مسائل کے لیے دو اجلاس، ادب اور اس کے مسائل کے لیے تین اجلاس، اردو کے محسنین کے لیے دو اجلاس منعقد ہوں گے۔ اردو صحافت کی مشکلات پر ایک مجلس مذاکرہ ہوگی۔ آخر میں ایک مشاعرہ ہوگا وغیرہ۔ (امروز ۱۸ جولائی صفحہ ۶ کالم ۴)

غور کیجئے۔۔۔۔۔

(۱) ہم نے کئی ماہ پہلے لکھا تھا کہ میرزائی اپنے مقاصد مشومہ کے لیے ادبی اور لسانی محاذ قائم کر رہے ہیں۔ یہ گویا ادیبوں، شاعروں کو کرپٹ Corrupt کرنے کی ایک حرکت ہے۔ ورنہ جس ربوہ میں کوئی غیر مرزائی آباد نہیں ہو سکتا حتی کہ وہاں کسی غیر مرزائی سب انسپکٹر اور اسٹیشن ماسٹر کو بھی ٹکنے نہیں دیا جاتا وہاں اردو کانفرنس کا انعقاد؟۔۔۔۔۔۔ خوب می شناسم

(۲) اس کانفرنس میں نوٹ کر لیجئے کہ میرزا غلام احمد کو سلطان القلم اور میرزا بشیر الدین محمود کو محسن اردو کے طور پر پیش کیا جائے گا کہ تاریخ اردو میں ان کا ذکر لا کر اس کے حوالوں کو اپنی نبوت کے جواز میں پیش کیا جائے گا۔

(۳) ہم اردو کے اہل قلم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس فتنہ سے خبردار ہو جائیں۔

(۴) اسلام پسند مصنفین کو ابھی سے اس کا تدارک کرنا چاہئے۔

(۵) ریلوے نے کس مفروضہ پر رعایتی ٹکٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟۔ اس کا یہ برتاؤ آج تک کسی ادبی اور لسانی کانفرنس کے ساتھ ہوا؟ اگر اس رعایت کی دلیل کیا ہے؟

(۶) مسٹر ممتاز حسن کو مفکر ادیب، نقاد بننے کا بیحد شوق سہی، سبکدوشی سے پہلے بعض افسروں کا یہ رجحان اب عام ہو چکا ہے۔

لیکن ممتاز حسن صاحب اس کانفرنس میں شریک ہونے سے پہلے علامہ اقبال کی روح سے استخارہ کر لیں مبادا انہیں اذیت ہو۔ انجمن حمایت اسلام کی کاروائی پڑھ لیجئے علامہ اقبال نے مرزائی ارکان کو جب تک اجلاس سے نکلوا نہیں دیا تھا وہ خود صدارت کی کرسی پر تشریف فرما نہیں ہوئے تھے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء)

ظفر اللہ اور علامہ اقبال

مجلس انتظامیہ یوم اقبال کراچی نے یوم اقبال ۱۹۶۷ء کے مقالات اور تصویریں بڑے تزک و اختشام سے شائع کی ہیں۔ آدھی تصویریں، آدھے مقالات، نصف انگریزی، نصف اردو، صدر ایوب کا پیغام سب سے زیادہ فکر انگیز ہے ناقص مقالہ پاکستان کے معمر دانشور جناب ممتاز حسن کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ممتاز صاحب اقبال کی روح ہی سے آشنا نہیں وہ چھلکے سے زیادہ اور مغز سے کم محبت کرتے ہیں۔

اصل اعتراض ہمیں اس پیغام پر ہے جو چودھری سر ظفر اللہ خاں سے حاصل کیا گیا ہے، چند سطری پیغام ہے ان کا آخری نکتہ یہ ہے۔ کہ "اقبال کی یاد ان لوگوں سے زیادہ عمر پائے گی جو سیاست اور قانون میں ان کے معاصر تھے۔"

اول:۔ تو کراچی کے ان بزرگوں کو معلوم نہیں اور اگر معلوم ہے تو تجاہل عارفانہ اختیار کئے ہوئے ہیں کہ علامہ اس جماعت کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے تھے۔ جس جماعت کے چودھری ظفر اللہ خاں روح القدس ہیں۔

دوم:۔ ان بزرگوں کو احساس ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان کے مسلمانوں نے ظفر اللہ خاں کے وجود کی ماضی مرحوم میں کیا قیمت ادا کی ہے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے اور موجودہ صدر میاں امیر الدین اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ حضرت علامہ نے اپنے زمانہ صدارت میں اپنے پرانے دوست ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو اس بنا پر انجمن کے اجلاس سے نکلوا دیا تھا کہ وہ مرزا غلام احمد کے متبع ہیں حالانکہ وہ لاہوری جماعت کے رکن تھے۔

ان واضح شواہد کے ہوتے ہوئے یوم اقبال پر سر ظفر اللہ خاں سے پیغام لینا حضرت علامہ کی روح کو دکھی کرنا ہے۔۔۔۔۔۔ ان لوگوں کو حضرت علامہ کی لحد پر حاضر ہو کر معافی مانگنی چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ یہ لغزش ان کے ادھورے علم کی وجہ سے ہوئی ہے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کا یہ ارشاد کہ اقبال کا نام سیاست اور قانون میں ان لوگوں کی بہ نسبت زیادہ عرصہ رہے گا۔ جو ان کے معاصر تھے تو ان کی خدمت میں عرض ہے اقبال کا نام مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں سب پر فائق رہیگا اور یہ سہرا بھی اقبال کے سر بندھے گا کہ انہوں نے وقت کے ایک سب سے بڑے فتنہ کا محاسبہ کیا تھا۔

(ہفت روزہ چٹان ۱۵۔ اپریل ۱۹۶۸ء)

اقبال کے پیرو جواب دیں

ہم اقبالؒ کے عقیدت مندوں، مفسروں اور پیروؤں کی اس روش کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ اقبالؒ کی اجارہ داری تو اپنی غیر منقولہ جائیداد سمجھتے ہیں، لیکن اقبالؒ کے حقیقی ارشادات سے انہیں اتنا تعلق بھی نہیں جتنی ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔ ہم مسئلہ کو طول نہ دیتے ہوئے یہ پوچھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ میرزائیوں سے متعلق جو کچھ اقبالؒ نے کہا، وہ غلط ہے یا صحیح؟ اگر غلط ہے تو پھر انہیں اقبالؒ کی وراثت سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اقبال سے بڑھ کر نہ ان کی فراست ہے، نہ ان کی عقل اور نہ تدبر۔ اقبالؒ نے میرزائیوں کو ملک و قوم اور دین و مذہب کا غدار لکھا ہے۔ وہ حکومت سے مطالبہ کرتے رہے کہ انہیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیا جائے۔ ہم بھی یہی مطالبہ کرتے ہیں۔ ہمیں میرزائیوں کے دین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ دین ہی نہیں۔ صرف مسخرہ پن ہے۔ جو لوگ اس مسخرے پن پر قائم رہنا چاہتے ہیں، شوق سے رہیں۔ علماء کا فرض ہے کہ وہ دینی طور پر ان کا تعاقب کریں۔ ہمارا سوال اقبال کے مدرسہ فکر سے ہے کہ وہ قادیانی امت کے متعلق مداہنت یا مصلحت اختیار کر کے نہ صرف اسلام کو ضعف پہنچا رہا ہے بلکہ خود اسلام سے غافل ہے۔ اس قسم کے عناصر ہمارے نزدیک قلم کے میدان میں اس آوارہ عصمت کی طرح ہیں جو آبرو کے سودے پر روپیہ کماتی ہے۔

چھٹا باب: تقریبات بیادِ اقبال

۱۹۵۶ء

یوم اقبال کی تقریبات

اس سال حکومت مغربی پاکستان نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا کہ پورے مغربی پاکستان میں ۲۱ اپریل کو یوم اقبال کی تعطیل قرار دیا۔ اس سے کم از کم ہوگا، ہمیں یہ احساس تو جاگزیں ہوگا کہ حکومت کے ارباب بست وکشاد اپنے محسنین اذہان کا احترام کرنے لگے ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ میں خواجہ شہاب الدین اعلیٰ اللہ مقامہ نے تو یہاں تک فرمادیا تھا۔

''صاحب اگر آج اقبال کے لئے چھٹی کی جائے تو کل کلاں کوئی صاحب جگر مراد آبادی کے لئے بھی زور دیں گے۔ اور اس طرح یہ ذہن بے قابو ہو جائے گا۔''

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ''یوم اقبال'' کا مقصد کیا ہے؟ کیا ایک دن کی چھٹی، چند رسمی تقریبات، حکومت کا اجلاس الگ، مجلس مرکزیہ کا اجلاس الگ، دو چار مقالے۔ چھ سات نظمیں، ایک آدھ قوالی، کچھ دوستوں کی خوا کہاتی تقریب اور مشاعرے پر اختتام یا اس کے علاوہ بھی یوم اقبال کے کچھ مقتضیات ہیں۔ اگر ہیں تو وہ کیا ہیں؟ ہمارے نزدیک یوم اقبال واضح شواہد وحالات کی بنا پر صرف ایک مقامی میلہ یا عرس ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت محض اس لئے اجلاس کا انعقاد کرتی ہے کہ اس کو سال میں کم سے کم ایک دفعہ پبلک میں جانے کی خواہش ہے۔ جو لوگ اس کی طرف سے سرکاری تقریب میں حصہ لیتے ہیں ان کے پیش نظر اقبال سے زیادہ معاوضہ ہوتا ہے۔

دوسری مجلس ۔۔۔ ''مجلس مرکزیہ اقبال'' ہے۔ خود ایڈیٹر چٹان اسکے سیکرٹری ہیں۔ لیکن انہیں خود اعتراف ہے کہ یہ مجلس بھی رسمی ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اس کے پیش نظر اقبال سے کہیں زیادہ ''یوم اقبال'' کی اجارہ داری ہے۔ اس کے کارکنوں میں نہ تو ولولہ ہے نہ سرگرمی۔ صرف سال کے سال ایک میلہ رچا لیتے اور اس طرح اپنے دوستوں سے ملاقات کا موقع پیدا کر لیتے ہیں۔

اقبال کو محض سال بہ سال ہدیہ عقیدت پیش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صحیح معنوں میں ٹھوس کام کی ضرورت ہے۔ اقبال کی فکر کے بہت سے پہلو ہیں جو ہنوز تشنہ ہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اقبال نے مسلمانوں کے ذہنی ارتقا کیلئے کیا کچھ کیا اور برصغیر ہند و پاک میں ان کے فکری خطوط کا رنگ و روغن کیا رہا۔ اس وقت تک اقبال زیادہ سے زیادہ ایک مورتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

سیاسیات سے ہاتھ اٹھا لینے چاہئیں۔

۲۔ کشمیر کے سوال پر سنجیدگی سے جرات مندانہ اقدام کی ضرورت ہے۔

۳۔ اگر معاہدۂ بغداد بعض ملکی وجوہ کی بنا پر ناگزیر ہے۔ تو اس میں سے برطانیہ کو ضرور حذف کر دینا چاہیے۔

۴۔ جاگیرداری نظام فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کی بقا کے لئے کوئی راہ باقی نہیں رہ گئی۔ جب تک پاکستان میں زمینی مسئلہ بہ حسن وخوبی حل نہیں ہوگا۔ اس وقت تک پاکستان کی معاشیات میں توازن پیدا ہونا محال ہے۔

یہ سب کچھ تحریری تھا۔ لیکن حاضرین نے مقالہ کی معنویت سے ہم آہنگ ہو کر اپنے آپ کو ہمہ تن گوش بنایا۔ جاوید کی ہم نوائی کے لئے کئی پہلو ایک ہو گئے تھے۔ ان کے مقالہ کی خصوصیت تحریر کی رنگینی مطالب کی گہرائی، لب ولہجہ کی تاثیر، اور سب سے بڑھ کر اقبال کی دعاؤں کا مجسم ہو کر جاوید کی صورت میں سامنے ہونا۔

علامہ علاؤالدین صدیقی نے اقبال کے آئینہ میں سیاسیات ملکی پر زنانے کی ایک تقریر کی۔ اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ دوڑ ہے۔ انہیں اپنے مخصوص انداز میں ٹوکا اور اعلان کیا کہ جب تک ہم اپنی سیرتیں اور ذہنیتیں اس سانچہ میں ڈھال نہیں لیتے جو اسلامیات کے آب وگل سے اقبال تیار کرتا ہے۔ اس وقت تک ہمارے ارتقا کی کوئی منزل متعین اور واضح نہیں ہوگی۔ آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان نے جو مجلس کے سیکرٹری بھی ہیں۔ ایک مختصر سا مقالہ پڑھا۔ جو اقبالؒ پر لکھی گئی کتابوں کا ایک جائزہ تھا۔ پھر ایک تقریر کی۔ بیان کیا کہ یہاں جن لوگوں نے اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے وہ نمایاں خدمت نہیں سرانجام دینے پائے ہیں۔ بلکہ سرکاری امداد حاصل کرنے کے لیے جن اداروں کو اقبالؒ سے منسوب کیا گیا ہے اور اقبالؒ کو جس طرح وہ پیش کر رہے ہیں اس سے ان کے کام وذہن کی تواضع کا سامان تو ہو جاتا ہے اور کما حقہ ہو رہا ہے۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ ان لوگوں کے پیٹ کا ایندھن انہیں دے دیا گیا ہے۔ اور ہر سال دیا جاتا ہے۔ مگر اقبال کا فہم خود ان میں نہیں ہے۔ اقبالؒ کو ہمیشہ ان کے افکار کی گرمی سے الگ رکھنے کی کوشش کی گئی اور لگاتار اس پر عمل ہو رہا ہے۔

جس طرح ہر مادی غرض کے لئے ہم نے اسلام سے فائدہ اٹھایا اور اب تک اٹھاتے چلے جا رہے ہیں اسی طرح اقبال بھی بعض ایسے لوگوں کی روزی کا وسیلہ بنا گیا ہے۔ جو اقبال کا جاننا تو ایک طرف رہا اسے پہچانتے بھی نہیں۔ جن چیزوں کی اقبال عمر بھر نفی کرتا رہا اور جن سے دامن بچاتا اس نے ہمیشہ زندگی کا اصل اصول سمجھا آج وہی چیزیں گن گن کر ان کے گرد جمع کی جا رہی ہیں۔ اور اس طرح ان کی شخصیت کے حقیقی [illegible] طور پر گم کیا جا رہا ہے۔

۱۹۵۸ء

آنکھیں میری باقی ان کا

ابکی لاہور میں یومِ اقبال ۲۱ اپریل کے بجائے ۲۸ اپریل کو منایا گیا۔ ۲۱ کو عید رہی۔ اس روز ہزارہا لوگوں نے مردِ قلندر کی تربت پر فاتحہ پڑھی عقیدت کے پھول پیش کئے اور عیدِ سعید کی خوشیوں میں کھو گئے۔

۲۸ اپریل کو ٹاؤن ہال میں یوم اقبال رچایا گیا۔ جناب سید اختر حسین گورنر مغربی پاکستان صدر تقریب تھے۔ فی الجملہ تمام سیاسی مکاتب کے لوگوں نے حصہ لیا۔ پہلے کی بہ نسبت ابکی مجمع میں ایک شکوہ پیدا ہو گیا تھا۔ اول اول چودھری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان نے جمہوریت اور اقبال کے موضوع پر ایک تقریر فرمائی۔ جو ان لوگوں کے رویے کا جواب تھا۔ جو اقبال پر غیر جمہوری ہونے کا طعن توڑتے ہیں۔ چودھری صاحب بعض نپی تلی باتیں کہہ کر چلے گئے۔ عبدالشکور بیدل نے حسب معمول کلام اقبال سنایا۔ ایک غزل پر انہیں خود رقت طاری ہونے لگی۔ فوراً ہی آنسو سمیٹتے ہوئے بیٹھ گئے۔

مسٹر اے کے بروہی نے اقبال کے موضوع پر انگریزی میں ایک برجستہ تقریر کی اور دلوں پر نقش جما گئے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے خطاب بہ اقبال کے زیرِ عنوان فارسی میں ایک نظم پڑھی اور خوب داد پائی۔ تقریب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ شرہ۔ اجلاس میں عرب، ایران اور ترکستان کے اہل قلم بھی شریک تھے۔ شیخ حماد المدنی نے عربی میں تعریفی اشعار پیش کیے۔ جناب آقائے گارقانی نے فارسی میں ایک قصیدہ بہ عنوان خطاب بہ شاعرِ مشرق پڑھا۔ ترکستان کے سابق ڈپٹی گورنر جنرل جو ان دنوں چین کے اشتمالی اقتدار سے راہ لے کر ترکی میں مقیم ہیں اپنی دلچسپ اردو میں خطاب کر گئے۔ اور لاہور کے شگفتہ مزاج لوگوں نے کامل سنجیدگی سے سنا۔

ایک روشن پہلو یہ تھا کہ اس تقریب میں علامہ اقبالؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد پہلی بار تشریف لائے تھے۔ آپ نے ''پاکستان کی سیاسیات کا جائزہ فکرِ اقبال کی روشنی میں'' کے زیرِ عنوان ایک طویل مقالہ پڑھا۔ اور مختلف الطبائع مجمع سے خوب خوب تحسین حاصل کی۔ آپ نے پاکستان کی حکمران قیادت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور واضح لفظوں میں کہا کہ:۔

۱۔ وہ لوگ جو پاکستان کے قصرِ اقتدار میں رہ چکے اور اب باہر ہیں۔ یا وہ لوگ جو قصرِ اقتدار [illegible] ہیں۔ اپنے ''اعمالِ حسنہ'' کی بدولت اتنے ناکارہ ثابت ہوئے ہیں کہ اب انہیں پاکستان کی

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کو بہت کچھ دیا۔ اتنا دیا کہ کوئی زندہ قوم ان کے ذہنی احسانات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ لیکن جن لوگوں نے اقبال کو ایکسپلائٹ کرنا شروع کر رکھا ہے وہ فکری سے زیادہ سیاسی ہیں۔ ان کے سامنے اقبال کا علمی یا تاریخی وجود نہیں۔ محض سیاسی اور وقتی مجسمہ ہے۔ جس کو وہ اپنے مصالح کے مندر میں سجا کر مورتی پوجا کرتے ہیں۔

۲۱ اپریل قریب آ رہا ہے۔ لازم ہے کہ یوم اقبال کے داعی اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں۔ اور وقتی مقرروں یا جذباتی نعروں کو اپنانے یا اٹھانے کے بجائے کوئی تعمیری مقصد سامنے رکھیں۔ اپنی تقریبات کو زیادہ سے زیادہ ثقہ بنائیں۔ اور کسی ایک موضوع کو لے کر اقبال پر وہ تمام مواد جمع کریں جس سے اقبال کے مطالعہ کی راہیں کھل سکیں۔ اور مسلمانوں کے علاوہ دوسری ایشیائی اقوام کو بھی معلوم ہو کہ اقبال جس نصب العین کو اپنا کر آگے بڑھ رہے تھے وہ کیا تھا۔ اور کیا نہیں۔۔۔ اس کے علاوہ ہر چیز بے کار ہے۔

(ہفت روزہ چٹان ۲۷ فروری ۱۹۵۶ء)

مولانا عبدالستار نیازی نے اپنے پرشکوہ انداز میں اقبال کی انفرادیت اور خصوصیت کو پیش کرتے ہوئے ان کے ماخذ پر پاکستانی دانشوروں کی مین میخ کا تجزیہ کیا۔ اور بتایا کہ جو لوگ اقبال کی فکر پر یورپ کے فلاسفہ اور عقلا کی چھاپ لگاتے ہیں۔ وہ حقائق وعلم کے نزدیک کس قدر بے بصر ہیں۔

گورنر صاحب نے تحریری خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ انہیں دل و دماغ کی جو صلاحیتیں قدرت نے ارزانی کی ہیں۔ ان کی تعمیر و استحکام میں ابتدائی ہاتھ اقبال کا ہے۔ وہ اقبال سے کماحقہ فیض اٹھا چکے ہیں۔

جناب توفیق حسین نے اقبال کے پیش کردہ معاشرہ کے خط وخال پیش کیے اور اس پر ایک فاضلانہ مقالہ پڑھا۔ جو لوگوں میں غور و فکر کے خطوط ابھارتا رہا۔

علامہ علاؤالدین صدیقی نے تجویز پیش کی کہ مرکزیہ مجلس اقبال کے کارپردازوں کو اقبال سٹڈی سرکل یا انسٹی ٹیوٹ (؟) کی بنیاد رکھنی چاہئے۔ جو ڈاکٹر جاوید اقبال کے طرز پر کلام اقبال کے ان پہلوؤں کا جائزہ لے جو ہماری روزمرہ سیاست کا جزو غیر منفک ہیں اور جن سے فکر اقبال کی صحیح علمی بنیادیں استعمار ہوتی ہیں۔ آپ نے تجویز پیش کی کہ اس انسٹی ٹیوٹ یا سرکل کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اس مقالہ کو جو جاوید اقبال نے امروزہ صحبت میں پڑھا ہے۔ ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کردے۔

القصہ تقریب ساڑھے نو سے کوئی ڈیڑھ بجے تک جاری رہی۔ اور ایک سنجیدہ ادبی محفل کے لئے یہ وقت بہت ہوتا ہے مگر لوگوں نے اپنے آپ کو کسی موڑ پر بھی بے صبر ثابت نہ کیا۔ شروع سے آخر تک ہمرکاب ہی رہے۔

(ہفت روزہ چٹان ۵ مئی ۱۹۵۸)

۱۹۶۳ء

اخباروں کے آئینہ میں یوم اقبال کی تقریبات

اس دفعہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد میں بہت سے جلسے منعقد کیے گئے۔ ان جلسوں میں اقبالؒ کی شخصیت کو بھی خراج ادا کیا گیا اور فکر کو بھی۔ کسی اخبار نے صحیح لکھا ہے، کہ لاہور میں ایک ہی جلسہ ہونا چاہیے تھا اور ایک ہی مجلس کے زیر اہتمام۔ مگر عقیدت مندوں نے اپنی اپنی انجمنوں کے زیر اہتمام کئی جلسے کر ڈالے اور آج تک یہ جلسے جاری ہیں۔ اب لطف کہہ لیجیے یا ستم کہ مختلف اخباروں نے مجلس مرکزیہ اقبالؒ کے زیر اہتمام منعقدہ یوم اقبالؒ کی کاروائی کو اپنے اپنے سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ باقی تمام جلسے مقابلتًا پھیکے تھے یا تھے ہی نہیں اور جو ۲۱ اپریل کے بعد یا پہلے منعقد کیے گئے یا اب تک کیے جا رہے ہیں ان کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ علامہ اقبالؒ اور ان کے پیغام سے لوگوں کی عقیدت اتنی گہری ہے کہ لوگ سرمست مئے سرشار ہو کر چلے آتے ہیں۔ سب سے بڑا جلسہ تو مرکزیہ مجلس اقبال ہی کا ہوتا ہے۔ ایک نہیں دو نشستیں۔ ۲۱ اپریل کو اور ۲۲ اپریل کو۔ پہلی نشست یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوئی۔ گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان نے افتتاح کیا۔ مغربی پاکستان کے وزیر قانون مسٹر اے۔ ٹی۔ ایم۔ مصطفےٰ نے صدارت فرمائی۔ یہ اجلاس انتہائی کامیاب رہا۔ بہ لحاظ تقریب، بہ لحاظ خطاب، اور بہ لحاظ سامعین، حال کچھا کچھ بھرا ہوا تھا بلکہ یونیورسٹی کے بیرونی لان تک لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مغربی جرمنی کی بون یونیورسٹی سے ڈاکٹر مس شمل، انقرہ یونیورسٹی کی ڈاکٹر ملیحہ، ایران کے قونصل ڈاکٹر مقتدی، عرب جمہوریہ کے ڈاکٹر مزید، ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ انگریزی ڈاکٹر سجاد حسین اور ان کے ساتھ کچھ اور اساتذہ جو مختلف شعبوں کے انچارج تھے حکیم مشرق کو خراج ادا کرنے تشریف لائے تھے۔ دوسری نشست سینٹ ہال میں ہوئی۔ ڈاکٹر ملیحہ صدر تھیں۔ یہ اجلاس بھی انتہائی پرسکون اور پر شکوہ رہا۔ بعض نامور اقبالین نے فکر اقبال کے مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے۔ ان دونوں نشستوں کو زیادہ تر مشرقی پاکستان کے زعماء نے خطاب کیا جن میں دو پارلیمانی سیکریٹری اور ایک انفرمیشن سیکرٹری بھی تھا۔ دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر شمل صدر شعبہ السنہ شرقیہ بون یونیورسٹی نے جرمنی کے نامور فلاسفر ڈاکٹر پان رنز کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ جس میں شاعر مشرق کو عظیم الفاظ میں خراج ادا کیا گیا تھا۔

ان کے علاوہ سابق وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے ایک پر مغز سیاسی تقریر کی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے معرکہ آراء مقالہ پڑھا۔ سید عبدالواحد ایم۔ اے۔ نے خراج پیش کیا اور پروفیسر نصیر احمد ناصر نے اپنا پر مغز مقالہ

سنایا۔ ان کے علاوہ دسیوں معززین نے حصہ لیا۔ مگر بعض اخبارات نے تمام کاروائی کو اپنے رخ سے پیش کیا۔ مثلاً کیانی مرحوم مجلس مرکزیہ اقبال کو ایک نیا راستہ دکھا گئے۔ انہوں نے پہلے مارشل لاء میں کلمہ حق بلند کیا۔ اور مارشل لاء ہٹ جانے کے بعد (سفر موت سے کچھ ہی پہلے) پارسال وہ اسی تقریب کے صدر تھے۔ ان کی یاد کو سب سے پہلے خراج ادا کیا گیا۔ آغا شورش کاشمیری نے آغاز ہی اس سے کیا۔ "نوائے وقت" کے سوا بعض دوسرے اخباروں کے ذہن ہی سے یہ خراج محو ہو گیا۔ "نوائے وقت" نے لکھا ہے۔

مرکزیہ مجلس اقبال کے اہتمام سے پنجاب یونیورسٹی میں آج قبل دوپہر جب یاد اقبال کے جلسہ عام کا آغاز ہوا۔ تو مرکزیہ مجلس اقبال کے سیکریٹری آغا شورش کاشمیری نے مسٹر جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ جب وہ کیانی صاحب کا ذکر کر رہے تھے۔ تو بھرے ہال میں سناٹا تھا۔ اور متعدد سامعین اشکبار ہو گئے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اپنے مقالے کا آغاز کیانی مرحوم کے ذکر سے کیا۔ یاد رہے کیانی مرحوم کو مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسہ میں "لسان پاکستان" کا خطاب عوام کی طرف سے دیا گیا تھا۔ انہوں نے لاہور میں اپنی خطابت کا آغاز بھی یوم اقبال کی ایک تقریب سے کیا تھا۔ یہ اجلاس ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا تھا۔ (نوائے وقت ۲۲۔ اپریل صفحہ اول)

جانے کیا حادثہ پیش آیا کہ امروز کے صفحہ اول پر اقبال کی جگہ اچھا پہلوان لے گیا۔ تاہم یہ لاہور ہے۔ کہ زیر عنوان ۲۴ اپریل کے شمارے میں بہ الفاظ ذیل ادارہ کے ایک عزیز نے اسی تقریب کا جائزہ لیا ہے۔

"صوبائی دارالحکومت میں حکیم الامت کی ۲۵ ویں برسی کے موقع پر جو تقریبات منعقد ہوئیں۔ ان کے دو پہلو نمایاں تھے۔ اول یوم اقبال کے جلسوں میں کئی ممتاز غیر ملکی مستشرق دکھائی دیے اور دوم ان جلسوں میں شدت سے اس امر کا احساس کیا گیا کہ ملک میں تعلیمات اقبال کا چرچا تو بہت ہے مگر ان پر عمل مفقود ہے۔

مشرق میں علوم سے بالخصوص علوم شرقیہ سے عورتوں کا کوئی واسطہ نہ کبھی پہلے دکھائی دیا ہے۔ اور نہ اب کوئی قابل ذکر روایت نظر آتی ہے۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ علوم شرقیہ کے واسطے سے یوم اقبال کی تقریبات میں حصہ لینے کے لیے مغرب سے جو مندوب آئے وہ عورتیں ہی تھیں۔ پروفیسر ان میری شمل بون (جرمنی) یونیورسٹی کے شعبہ علوم شرقیہ کی سربراہ تھیں۔ اور ڈاکٹر بیگم ملیحہ اوسارجی اوغلو انقرہ (ترکی) یونیورسٹی کے ادارہ السنہ شرقیہ کی ڈائرکٹر۔ ان دونوں خواتین نے علامہ اقبال کے فلسفہ اور پیغام پر بڑی جامع اور خیال افروز تقریریں کیں۔ اور پیشہ ور مقامی ذاکرین اقبال انگشت بدندان نظر آئے۔

مرکزیہ مجلس اقبال کے سلسلہ تقریبات کا افتتاحی جلسہ مشرقی پاکستان کے وزیر قانون مسٹر اے ٹی ایم مصطفٰے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ بنگالی بیرسٹر صاحب علی گڑھ کے گریجوایٹ ہیں۔ اس لیے اردو میں بے تکان بات چیت کر سکتے ہیں۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ پنجابی ہیں۔ اور ان پاکستانیوں میں سے ہیں جن کی خواہش ہے کہ مستقبل میں کوئی ایک زبان پورے ملک کی سرکاری زبان بنے۔ مجلس اقبال نے سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کو بھی تقریر کے لیے مدعو کیا تھا۔ سیاستدان مجلس سماع میں بھی کیوں نہ ہو وہ سیاست ضرور بگھارے گا۔ چودھری صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ مرنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

سیاسی لیڈر کا اقبال

چودھری صاحب ایک سیاسی تقریر کرنے آئے تھے۔ لیکن یار لوگوں نے ان کے شعر کو موجودہ سیاسی حالات کے سیاق وسباق میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی اور ایک اعلیٰ سرکاری افسر نے علامہ اقبال کا شعر سن کر فوراً چودھری صاحب کو داد دی۔ چودھری صاحب نے فوراً پینترا بدلا۔ اور ایک شعر کی بدولت اس اثر کو زائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو پہلے شعر نے قائم کیا تھا۔ دوسرا شعر یہ تھا۔

کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد
دستور نیا اور نئے دور کا آغاز!

صدر جلسہ کے گول مٹول چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ اور سیکرٹری مجلس اقبال آغا شورش کاشمیری اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگے۔ چودھری محمد علی کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ غلام بیدار ہوتے ہیں لیکن حکمران کی ساحری انہیں دوبارہ سلا دیتی ہے۔ تاہم ضربت پیہم سے حاکمیت کا بت بالآخر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ چودھری صاحب نے اپنی تقریر کی سلیٹ پر جمہوریت، سیاست اور حاکمیت سے متعلق بانگ درا اور بال جبریل کے تمام معروف اشعار رقموں کی طرح درج کیے۔ پھر جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے ذریعے ملک کے سیاسی سوال کا جواب پیش کر دیا۔ ''نظام اسلام پارٹی کے سٹیج پر بیٹھے ہوئے اصحاب نے داد دی۔ کہ چودھری صاحب واقعی بڑے حساب دان ہیں اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاونٹس سروس جس قدر چاہے ان پر ناز کر سکتی ہے۔

اگر مکرر ارشاد ہوتا

چودھری محمد علی نے مجلس کے منتظمین اور جلسے کے صدر پر دو دھارے شعر سے جو طنز کی تھی۔ آغا شورش کاشمیری جیسا قلندر سیکرٹری اسے کیونکر پی جاتا۔ چودھری صاحب نے تقریر ختم کی تو انہوں نے اس پر ایک دل چسپ تبصرہ کر ڈالا انہوں نے کہا یہ مصطفٰے صاحب تو دشت وفا میں ہمارے ہمسفر تھے چلتے چلتے پاؤں کانٹوں سے فگار ہو گئے تو وزارت کے نخلستان میں ستانے کے لیے رک گئے آپ فکر مند نہ ہوں اس نخلستان کی آب وہوا انہیں راس نہیں آئے گی اور وہ پھر دشت نوائی کرتے دکھائی دیں گے۔ آغا شورش کا خیال تھا کہ چودھری صاحب نے وزیروں کی خوشامد کے مضمون کو ذرا اختصار سے ہی باندھا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ دوبارہ وزیر ہونا پڑیگا۔ چودھری محمد علی نے اپنی نشست سے آواز دی۔ ''نہیں نہیں۔ میں اب وزیر نہیں بنوں گا''۔

چودھری صاحب نے اقبال کا یہ شعر بھی پڑھا تھا۔

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمین میر و سلطان سے بیزار ہے

آغا صاحب چودھری صاحب سے یہی شعر ''مکرر ارشاد'' فرمانے کی سفارش کرتے تو مزہ آ جاتا۔

وزیر ہونے سے پہلے

اقبال دین کو سیاست سے جدا کرنے کے مخالف تھے۔ اور فی الحقیقت دین اور سیاست کو ایک ہی شے تصور کرتے تھے۔ پاکستان کی بیشتر سیاسی جماعتیں بھی اسی اصول کی علمبردار ہیں۔ اور جماعت اسلامی ان میں پیش پیش ہے۔ تاہم جماعت اسلامی سیاست کو دین سے الگ کرنے کی بجائے مسلمانوں کو دین سے الگ رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ شاعر مشرق کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال حکیم ملت کے نظریات کو پاکستانی نظام حیات میں جاری وساری کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لیے ایک نظریاتی کنونشن بلانا چاہتے ہیں اور اس میں تمام مذہبی اور سیاسی راہنماؤں کو بلا رہے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں شاعر مشرق کے فلسفہ حیات کی جو توضیح کی اس میں تو روٹی کپڑے کا ذکر بڑی کثرت سے آ گیا ہے اور ہمارے سیاسی اور دینی راہنما ان دنیاوی آلائشوں کو عوام سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور جماعت اسلامی غلامی اور خواجگی کی تائید میں دلائل لے آتی ہے۔ ان حالات میں ''سلطانی جمہور'' کے نقیب کے نظریات پر غور کرنے والی کنونشن کیا کرے

گی؟ ڈاکٹر جاوید اقبال نوجوان ہیں اور برطانیہ سے پڑھ کر وطن واپس آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز کے لیے محمود و ایاز کا ایک صف میں کھڑا ہونا کافی نہیں۔ انہیں معاشی میدان میں بھی ایک ہی صف میں کھڑے نظر آنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کہ پاکستان میں میرے باپ کے نظریات کو اوڑھا تو بہت گیا ہے مگر پہننے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ یہاں مسجد میں تو محمود صاحب ایاز کو اپنی صف میں کھڑے ہونے کی اجازت دیتے ہیں مگر مسجد سے باہر وہ چوتھی پانچویں صف میں بھی اس کے کھڑے ہونے کا انتظام نہیں کرتے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر جاوید اقبال کے وزیر ہونے کی افواہیں اڑی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب تک یہ افواہیں سچی ثابت نہیں ہوئیں ورنہ یوم اقبال کے جلسے میں ہمیں ایسی سچی باتیں سننے کو نہ ملتیں۔

داد اور بے داد

اس جلسے میں مشرقی پاکستان کے چند ممتاز عالم اور سیاستدان بھی موجود تھے۔ اور ان کی حاضری ظاہر کر رہی تھی کہ اقبال فی الواقعی قومی شاعر ہے۔ مشرقی پاکستان کے ایک پارلیمانی سیکریٹری مولانا سیف الدین یحییٰ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو منتظمین کو خوش فہمی تھی کہ چند جملے کہنے کے بعد بنگالی مولوی کی اردو "تھک جائے گی"۔ لیکن مولانا نے بسم اللہ کر کے جو تقریر کا آغاز کیا تو فصاحت و بلاغت کا ایک دریا بہتا دکھائی دیا۔ جس میں جگہ جگہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے اقتباسات خوبصورت بجروں کی طرح تیر رہے تھے۔ دریا کا بہاؤ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اور منتظمین پریشان تھے کہ باقی مقررین کے لئے وقت نہیں بچے گا۔ بالآخر شورش صاحب نے جا کر پیچھے سے مولانا کو ٹھوکا دیا۔ اور انہوں نے یہ کہہ کر "ابھی ختم کرتا ہوں" تقریر جاری رکھی۔ مولانا کے بیان میں الفاظ کا صحیح اور زوردار انتخاب، محاورے اور روزمرہ کی چاشنی اور شین قاف کی لطافت سامعین کو حیران کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب تقریر کا سلسلہ بقول شورش زلف یار کی طرح دراز ہوا۔ تو لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ مولانا نے تقریر ختم کر دی۔ اور شورش صاحب نے انہیں بتایا کہ لاہور کے لوگ جب تالیاں بجائیں تو وہ داد نہیں ہوتی بے داد ہوتی ہے۔ مولانا بولے۔ "میں تالیوں کا مطلب سمجھ گیا تھا"۔

کوھستان کے جائزہ نگار جناب سید احسان علی شاہ بی۔اے۔ نے اس ساری تقریب کا احاطہ اس طرح کیا ھے:

اپنے آپ کو کلام اقبال کا شیدائی کہنے میں مجھ سے کبھی کوئی چوک نہیں ہوتی۔ اور علامہ مغفور کے کلام

کے متعدد مجموعے میں نے ادھر ادھر سے مانگ کر یا نظر بچا کے اڑا کر جمع کر رکھے ہیں۔۔۔ یہ مجموعے میری الماری میں بڑی نمایاں جگہ پر رکھے رہتے ہیں۔ اور میں اپنے یہاں آنے والے مہمانوں کو اکثر کسی نہ کسی بہانے ان کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اپنی کسی بات کی دلیل دینے کے لئے بھی مجھے کلام اقبال کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وقت میری حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ میں علامہ مغفور کی تمام کتابیں اس تیزی اور شدت کے ساتھ کھولتا اور بند کرتا ہوں کہ بعض اوقات مجھے خود محسوس ہونے لگتا ہے کہ کلام اقبال آندھی کی زد میں ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس پھرتی اور جلدی کے عالم میں ڈھونڈی ہوئی سند یا ۔۔ ب بے موقع استعمال ہو جاتی ہے۔ یا یہ ہوتا ہے کہ مد مقابل بھی اپنی دلیل کو وزنی اور میرے استدلال کو غلط ثابت کرنے کے لئے وہی شعر پڑھ رہا ہوتا ہے جو میں نے جلدی میں ڈھونڈا تھا۔ کافی دیر کی بحث و تکرار کے بعد ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ ہم میں سے کسی نے اقبال کا مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ نہیں کیا۔ کچھ نئے نئے شعر ذہن میں اٹکے ہوئے ہیں۔ ریڈیو کی قوالیوں نے کچھ غلط سلط مصرعے نقش پا کے طور پر ذہن کی خشک دھول پر چھوڑ دیئے ہیں۔ اور یا پھر فیشن کے طور پر چند شعر یاد کر لیے گئے ہیں۔ یہ محسوس کر کے بعض اوقات بڑی خوشی ہوتی ہے کہ "ٹیڈی ازم" کی طرح اقبال بھی فیشن کا ایک حصہ ہیں۔ تنگ پتلون نہ پہنی، اقبال کو اوڑھ لیا۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ ٹیڈی ازم تخریبی ذہن کی علامت ہے۔ اور اقبال کے اشعار کو یاد کر کے بات بے بات استعمال کرنا کم از کم ایک تعمیری ذہن کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ فرق ایسا ہی معمولی نہیں۔ اقبال بہرحال اپنا اثر کر رہا ہے۔۔ اس ضمن میں مجھے آپ سے اختلاف نہیں ہو گا۔ بات تو بڑی معقول ہے۔!

لیکن اس بات کی معقولیت سے انکار نہ کر سکنے کے باوجود یوم اقبال کی تقریبات میں حاضری نے میرے ذہن پر ایک ہلکی سی افسردگی طاری کر دی۔ یہ تقریبات مشرقی اور مغربی پاکستان کے قابل فخر دانشوروں اور دوسرے اسلامی ممالک کے علماء کبار کی انتہائی خیال آفریں اور بصیرت افروز محفلیں تھیں۔ یہاں ایران، جمہوریہ ترکیہ اور متحدہ جمہوریہ عربیہ کے صاحب نظر نمائندوں نے میرے اقبال کو اپنا اقبال کہا۔ مجھے بتایا کہ ان عظیم ملکوں کے عوام اقبال کی آواز کو غور سے سنتے اور اس سے اثر قبول کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ محترم نمائندے مجھ سے کہہ رہے تھے۔ کہ تقریباً تمام اسلامی ممالک کا دل ایک ہی لے پر دھڑک رہا ہے۔ مغربی سیاست نے ہمیں مختلف جغرافیائی حد بندیوں میں ضرور تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن یہ ہمارے ذہن اور ہماری روح کو تقسیم کرنے میں بری طرح سے ناکام ہوئی۔ کہ آج نہیں تو کل اس کی یہ ناکامی عیاں ہو جائے گی۔ اور ساحر

مغرب کی شعبدہ گری کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دانشوروں نے مجھے سمجھایا کہ اقبال کسی مغربی شاعر یا فلسفی سے متاثر نہ تھے۔ ان کا نغمہ ہندی لیکن لے حجازی تھی۔ اقبال کے فکر کی بنیاد اسلام تھی۔ اور اسلام عالمگیر تصور حیات کا نام ہے۔ ان صاحب فکر لوگوں نے مجھے بتایا۔ کہ اقبال اس دور کا سب سے بڑا مفسر قرآن ہے۔ اور قرآن حکیم کے اسرار و رموز اور اس کے حیات بخش پیغام کو سمجھنے کے لیے اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بعض دانشوروں نے یہ بھی کہا ہے کہ آج کی دنیا جو تقسیم در تقسیم ہو کر انتہائی خطرناک باہمی جنگ میں مبتلا ہے۔ اس وقت تک بچ نہیں سکتی جب تک اسے اقبال کی وساطت سے قرآن حکیم کا پیغام نہ پہنچایا جائے۔ ان کی یہ باتیں سن کر میں نے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا۔ اقبال فیشن کا ایک حصہ تھے اور یہ فیشن یقیناً مثبت ذہن کا ثبوت تھا، لیکن یہ مثبت ذہن فیشن کا تو حصہ ہے۔ اس کا اثر کس حد تک ہوگا۔ اور یہ اس خواب کی تکمیل میں کیا کردار ادا کرے گا جو یوم اقبال کی تقریبات میں دیکھا جا رہا تھا؟ اس سوال نے مجھے بڑا افسردہ بنا دیا۔ اقبال کی موجودگی میں یہ عجب باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ افغانستان ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ہم سے روٹھا ہوا ہے۔ اور "میں نہ مانوں" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ اور تو اور ہم خود کئی قسم کی درجہ بندیوں میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے لفظوں میں ہم نے حضرت علامہ کو اوڑھ تو لیا ہے پہنا نہیں۔ اقبال فیشن ضرور ہیں۔ ہماری فکر اور روح کا حصہ نہیں بن سکے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ میں اقبال کی تصنیفات واپنی الماری کے نمایاں حصے میں جگہ دیتا ہوں اور اپنے مہمانوں کو کسی نہ کسی بہانے ان کی طرف متوجہ کر کے اپنے خوش ذوق ہونے کی داد وصول کرتا ہوں۔ یا کبھی اعصابیت میں مبتلا ہو کر کلام اقبال کو آندھی کی زد میں لے آتا ہوں۔ میں بہت خوش ہوتا ہوں کہ میری یہ حرکتیں میرے مثبت ذہن کا ثبوت ہیں۔ یہ خوشی بہت بڑی ہوتی ہے۔ اور میں اس خوشی میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ اس طرح میں اقبال "ہے مگر نہیں ہے" کا وظیفہ کر رہا ہوں۔ اقبال میری الماری میں بند ہے۔ اگر آج میں اسے اجازت دے دوں کہ وہ اس سے نکل کر میرے ذہن تک آ جائے۔ تو میں دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہوں۔ میں کتنا بد قسمت ہوں میں اپنی عظیم توانائیوں کو الماری میں سجا کر اپنی خوش ذوقی کی داد لینے پر مطمئن ہو رہا ہوں۔

ان تقریبات کا ایک دوسرا پہلو، ان افسردہ خیالات سے مختلف تھا۔ اس محفل میں جو کچھ کہا گیا اس کا رنگ عالمانہ تھا۔ عام آدمی کے نقطہ نظر سے بعض مقالے خاصے بوجھل بھی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دونوں دنوں میں یونیورسٹی ہال اور سینٹ ہال شروع سے آخر تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھچا کھچ بھرا رہا۔ یہ اقبال کو سمجھنے کی خواہش کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں جلسوں

میں اس خواہش کو برقرار رکھنے کا بھی بڑا سامان تھا۔ آغا شورش کاشمیری ان دونوں کے سٹیج سیکرٹری تھے۔ انہوں نے اپنی شگفتہ بیانی اور بعض بڑے چبھتے ہوئے سے فقروں سے سامعین کو باندھے رکھا۔ آغا ہر مقالے کے بعد اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ کہہ جاتے اور محفل کو ہنسا کر دوسرے مقالہ کے لئے ذہنوں کو تیار کر دیتے۔

سابق وزیر اعظم پاکستان چودھری محمد علی کے چھپے دبے اشارے اس جلسے کے بعض "جزیروں" کو کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ آغا نے اسے فوراً بھانپ لیا۔ اور شگوفہ چھوڑا "چودھری صاحب کو خطرہ ہے کہ وہ ایک بار پھر وزیر نہ بن جائیں۔" پورا ہال دیر تک ہنستا رہا۔ سب سے زیادہ قہقہے چودھری محمد علی نے لگائے۔ ہال دوسرا مقالہ سننے کے لئے تازہ دم ہو گیا۔ آغا شورش کاشمیری سٹیج سیکرٹری کی حیثیت سے اتنے ہی کامیاب ہوئے جتنے وہ مقرر کی حیثیت سے کامیاب ہیں۔ آغا کی شگفتہ بیانی سے تازہ دم ہو کر کلام اقبال پر غور کرنے کے لئے تیار ہو جانے والوں نے ایک امید بند ھادی میں سوچنے لگا۔ ان میں کچھ تو ہوں گے جو اقبال کو الماریوں سے نکل آنے کی اجازت دے دینگے۔

۲۳ اپریل کو بی این آر میں چودھری نذیر احمد ایڈووکیٹ (سابق اٹارنی جنرل حکومت پاکستان) کے زیر صدارت بزم اخوان نے اقبال ڈے منایا۔ اس اجلاس کو پروفیسر علم دین سالک اور آغا شورش کاشمیری نے خطاب کیا۔

شورش صاحب کی تقریر غالباً اس شمارے میں دوسری جگہ دی جا رہی ہے۔ چودھری صاحب نے صدارتی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اکبر الہ آبادی پر میں ہفتوں بول سکتا ہوں۔ لیکن آج شورش صاحب نے جس خوبی اور روانی کے ساتھ اقبال پر اظہار کیا ہے۔ اس کو سن کر میرا خیال ہے کہ وہ اقبال پر مہینوں کیا برسوں اس برجستگی و شگفتگی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔

"نوائے وقت" میں اس تقریب کی روئداد کا الٹ پھیر ہو گیا۔ شورش صاحب نے ۲۷۔ اپریل کے نوائے وقت میں تصحیح خطابت کے لئے ذیل کا خط لکھا۔

مکرمی! نوائے وقت (۲۵۔ مارچ) میں "بزم اخوان" کے زیر اہتمام منعقدہ یوم اقبال کی جو روئداد شائع کی گئی ہے اس میں میری تقریر کا علیحدہ حصہ معناً درست ہے لیکن سیاق و سباق کی قطع و برید سے مفہوم قدرے مختلف ہو گیا ہے۔ مثلاً خبر کے مطابق میں نے دعویٰ کیا۔ حالانکہ بیان کیا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ کہ اقبال کے نام اور کلام سے گہری عقیدت اور نسبت کا اظہار کرنے والے اقبالی خالی الذہن ہیں۔ لیکن مجھے کم و بیش نوے فیصدی کلام اقبال زبانی یاد ہے۔

یہ دو باتیں تھیں اور دو مختلف جگہوں پر کہی گئی تھیں۔ میں نے کہا تھا کہ بعض لوگ جو کلام و نام اقبال کے معاملہ میں بلند بانگ دعاوی کرتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی اصل منشاء سے خالی الذہن ہیں۔ حفظ کلام اقبال سے متعلق میرا دعویٰ یا بیان اس سیاق و سباق کے ساتھ تھا۔ کہ اشعار سنا دینے سے کلام کی روح ہاتھ نہیں آتی۔ یوں تو مجھے بھی کلام اقبال کا کم و بیش نوے فیصد حصہ زبانی یاد ہے

یہ ارشاد کہ میں نے اقبال کے چند حلقہ بگوشوں کے نام لئے بغیر انہیں ہدف تنقید بنایا۔ تو یہاں چند حلقہ بگوشوں کے الفاظ غلط استعمال ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بعض لوگ اپنے آپ کو اقبال کا خوشہ چیں یا شاگرد ظاہر کر کے تشریحات اقبال میں اپنے نقطہ نگاہ کی قلمیں لگاتے ہیں۔

میں نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ تقریبات اقبال میں شریک ہو کر ہر بار مجھے مایوسی ہوتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اکثر حضرات کی سطحی باتیں سن کر مجھے مایوسی ہوتی ہے۔ آپ نے کرم کیا کہ میری تقریر کا یہ پہلو پیش کیا۔ اور دوسرا پہلو جو تعریف و ثناء کا تھا، رہ گیا۔ بہر حال یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ میرا خیال ہے بلکہ عقیدہ یہی ہے کہ اقبال کے نام پر بعض لوگ شرح و تفسیر کے زیر عنوان بڑے بڑے جھوٹ بول رہے ہیں۔ اور اقبال سے متعلق بعض بڑی کتابیں فکر اقبال کی نفی کرتی ہیں۔ میں نے یہ بات ہمیشہ کہی ہے اور اب کہہ رہا ہوں۔

لاہور۔۔۔ شورش کاشمیری

”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ نے یوم اقبال کی تقریب کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض مشورے عنایت کیے ہیں۔ یہ جائزہ غالباً ہمارے دوست م ش کے قلم سے ہے۔ اور وہ ہمیشہ ہی مجلس مرکزیہ کو اس قسم کے مشورے دیا کرتے ہیں۔ یاران سر پل تو وجہ سمجھتے ہیں۔ البتہ قارئین سول اینڈ ملٹری گزٹ کے لئے یہ مشفقانہ ارشادات ہونگے۔ بہر حال

تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

(ہفت روزہ چٹان لاہور ۲۔ مئی ۱۹۶۳ء)

۱۹۶۳ء

یوم اقبالؒ کی تقریبات

اس سال بھی یوم اقبال اسی ٹھاٹھ سے منایا گیا۔ جو اس تقریب کا طغرائے امتیاز ہو چکا ہے۔ بلکہ اس سال تقریبات کا زور رہا۔ یعنی ایک ہی دن میں مختلف انجمنوں کے زیر اہتمام مختلف مقامات پر کئی جلسے ہوئے۔ جن میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے فکر و نظر کی تابانیوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مجلس مرکزیہ اقبال نے دو دن اجلاس کیے۔ اور ان کے ممتاز و منفرد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ،

۱۔ اس مجلس ہی کو علامہ اقبال کی زندگی میں یوم اقبال منانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور پاکستان بن جانے کے بعد اسی مجلس نے یوم اقبال کی تقریبات کا ڈول ڈالا۔ باقی اداروں نے اتباع کیا۔

۲۔ اس مجلس میں زیادہ تر وہ لوگ شامل ہیں، جو حضرت علامہ کی گراں قدر صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ یا جن میں سے بعض کو عزیز داری کے علاوہ حضرت علامہ علیہ الرحمتہ سے ذاتی نیاز حاصل رہا۔ علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال بھی اس مجلس کے رکن ہیں۔ میاں امیر الدین اور خواجہ عبدالرحیم کی بالواسطہ اور بلاواسطہ حضرت علامہ سے قرابتداری ہے۔۔۔ حضرت کے جگری دوست چوہدری محمد حسین اس مجلس کے بانیوں میں سے تھے۔ باقی تمام ارکان حضرت علامہ کے افکار و نظریات کے بہ جان و دل معتقد ہیں۔

۳۔ اس مجلس کی تقریبات میں یورپی اور ایشیائی ملکوں کے نمائندوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ وہ بحث و نظر میں باقاعدہ حصہ لیتے ہیں۔ اور اس طرح اقبال کی عالمی فکر وسعت و تنوع حاصل کرتی ہے۔ مثال کے طور پر بون یونیورسٹی میں مشرقیات کے شعبہ کی صدر ڈاکٹر شمل نے اقبال پر جو کام کیا ہے۔ وہ اتنا اہم ہے۔ کہ خود ہمارے ہاں کی مجالس اقبال یا دانشوران اقبال اس لحاظ سے تہی دست نظر آتے ہیں۔

مختلف حلقوں کی طرف سے ان تقریبات پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے۔ اس کے بھی وجوہ ہیں۔ مثلاً

۱۔ کچھ لوگ جن میں زیادہ تر صحافی ہیں۔ محض اعتراض کے لیے اعتراض کرتے ہیں۔ اور ان کے اعتراض کا نشانہ مجلس مرکزیہ اقبال ہوتی ہے۔ اعتراض کی وجہ کیونکہ علمی سے کہیں زیادہ شخصی ہے۔ لہذا ان لوگوں کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔

۲۔ بعض لوگ اقبال سے اس لیے دلچسپی نہیں رکھتے کہ وہ ان کی فکر کے راستہ میں مزاحم ہے۔ اور جب

تک اس کے فکر ونظریات کا ڈنکا بجے گا۔ ان لوگوں کے افکار ونظریات پنپ نہیں سکتے۔ یہ لوگ علم وفکر کے اعتبار سے عاجز ہیں۔ اپنی عاجزی کو چھپانے کے لیے ان کا شعار ہو گیا ہے۔ کہ اقبال کے شارحین کی تضحیک کریں۔ اور یوم اقبال کی تقریبات کو سہو تاژ کر کے اقبال کے قبول عامہ کو ہلکا کریں۔

۳۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو تعلیمات اقبال کے شیدائی ہیں۔ لیکن صحیح کام نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کی تقریبات پر انگشت نمارہتے ہیں۔ یہ بھائی اس فرق کو محسوس نہیں کرتے۔ کہ آئے سال کی تقریب کا مقصد ذکر اقبال ہے۔ فکر اقبال نہیں۔ یہ تقریبات خواص کے لئے نہیں۔ عوام کے لئے منعقد کی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ اپنے اس محسن جلیل کو تبریک وستائش کے لہجہ میں یاد کر سکیں۔

اب اس سے حاصل کیا ہوتا ہے وہ بھی سن لیجئے:۔

۱۔ پہلی چیز جو نمایاں ہوتی ہے وہ قوم کا اقبال سے عشق ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ جن افکار ونظریات کی اقبال نے دعوت دی ہے۔ ان کی اجتماعی روح سے قوم کے لگاؤ کی رفتار کیا ہے؟

۲۔ پھر اس سے نہ صرف جوش وجذبہ پختہ ہوتے ہیں بلکہ اس امر کا سراغ بھی ملتا ہے کہ ہمارا قومی ذہن کس سانچہ میں ڈھل رہا ہے اور بلحاظ فکر یہاں ایک مرکزی شخصیت ایسی بھی ہے جسے ہم اپنا ذہنی راہنما سمجھتے ہیں۔

۳۔ جس قسم کی دماغی ویرانیاں ہمارے ہاں عام ہو رہی ہیں اقبال ان کے خلاف حوصلہ، یقین اور جہد کا پیغام ہے۔ سال بہ سال اس کا تذکرہ، نئے دماغوں کو روشنی اور پرانے دماغوں کو تازگی بخشتا ہے۔ جس سے قوم کی معنوی زندگی نشوونما پاتی ہے۔

۴۔ جو لوگ تقریب میں شمول کیلئے ایشیا وافریقہ کے اسلامی ملکوں سے آتے ہیں، وہ اپنے ساتھ پاکستان کی ایک عالمی شخصیت کے فکر ونظر سے شناسائی لیکر جاتے ہیں۔ اور جو یورپ اور امریکہ سے آتے ہیں ان پر یہ امر کماحقہ آشکار ہوتا ہے کہ مشرق میں ایک ایسی شخصیت اپنی معنوی حیات کے ساتھ زندہ ہے۔ جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جدوجہد کے خطوط فراہم کر گئی ہے۔

۵۔ اس سے نہ صرف قومی وحدت کا اظہار واقرار ہوتا ہے بلکہ اجتماعی طور پر بعض ایسے پہلو بھی سامنے آتے ہیں جو عام حالات میں بے نقاب نہیں ہوتے، یا خاص قسم کی مطالعاتی تنہائیاں ان کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔

۶۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اقبال اپنی تعلیمات کے باعث ملت کے ذہن میں اس طرح راسخ ہو گیا ہے کہ کوئی فکری راہزن اس کے اعتقادات کی عصبیتوں پر نہ شبخون مار سکتا ہے۔ اور نہ نئی پود ہی کو بآسانی ہم انداز ہونے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

اب یہ تجزیہ باقی ہے کہ ہونا کیا چاہیے؟ اور کیا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔ جو ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بھی زیر بحث آ سکتا ہے، لیکن چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد، کا یہ محل نہیں، فی الحال گزارش احوال واقعی ہی پیش خدمت ہے۔ راقم الحروف کی ناچیز رائے میں۔۔۔۔

۱۔ یہاں اقبال کا ذکر عام ہے، فکر عام نہیں۔ اس کے اسباب پر قلم اٹھانا مناسب نہیں، لیکن نتائج کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔ کہ

ا۔ فکر اقبال کے شناسا کم ہیں۔ اور جو شناسا ہیں، انہیں یا دل ودماغ کا اطمینان حاصل نہیں یا وہ سروسامان کی اعانت سے محروم ہیں۔ اور جہاں سروسامان موجود ہے۔ مثلاً حکومت کے امدادی ادارے اور ان کے ارکان، وہ اولاً تعلیمات اقبال کی مرکزی روح کے فہم سے قاصر ہیں۔ ثانیاً انہیں اقبال کے نام پر اپنی معاش کی فکر ہے یا وہ اپنے آپ کو اقبال سے منسوب کر کے خود ممتاز ہونے کی فکر میں ہیں۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرکاری امدادی مصلحتوں نے ان کے اذہان پر غلاف چڑھا رکھا ہے۔

ب۔ اقبال کی آفاقی حیثیت کو قومی سیاسیات کے نرغہ میں لاکر سیاسئین نے نہ صرف اس کی دعوت کو محدود کر رکھا ہے بلکہ اس کی بین الملی چھاپ کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی صراحت یوں کی جا سکتی ہے کہ اقبال اپنے افکار ونظریات کی رو سے عالم انسانی کی اجتماعی میراث ہے۔ لیکن ہمارے دائرہ کار وافکار میں اس کا وجود ملکی سیاسیات کے مختلف ادوار میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ بے شک وہ ہمارا قومی شاعر ہے لیکن محض قومی شاعر نہیں، بلکہ وہ مشرق کی نشاۃ ثانیہ کا داعی بھی ہے۔ اور یورپ کے دانش کدوں کا نقاد بھی، جس نے بالشبہ، یورپی افکار کی برتری کو چیلنج کیا ہے۔

ج۔ اقبال کو بلاضرورت حزبی سیاست کے گرد پھرایا جا رہا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ خود بخود مرتب ہوتا ہے کہ عام سیاسی راہنماؤں کی طرح وہ بھی کسی تحریک، تنظیم اور قیادت کا نمائندہ تھا۔ حالانکہ وقت کی یہ چیزیں اس کے ہاں اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو لوگ اس کو حزبی سیاست میں آلودہ کر کے ذاتیات کے زیر عنوان افراد واشخاص کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اقبال کی روح کے عمق سے ناواقف ہیں۔ بلکہ کسی حد تک عجز فہم کے مریض ہیں۔

۲۔ اقبال پر زیادہ سے زیادہ یہ کام ہوا ہے کہ سوانح عمری کے بعض پہلو مل گئے ہیں۔ بعض خطوط مصالح کی بوقلمونی کو ملحوظ رکھتے ہوئے چھاپ دئے گئے ہیں۔ یا تعلیمات اقبال کے بعض ایسے پہلوؤں پر قلم اٹھایا گیا ہے جو زیادہ تر مجرد تصورات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا جن میں دور از کار فلسفیانہ بحثوں اور پیش پاافتادہ نظریوں کو

تحریر وتقریر کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

۳۔ اقبال کے شارحین نے بہ ہمہ وجوہ بے شار ٹھوکریں کھائی ہیں اقبال کی تعلیمات پر قلم اٹھانا ہر کہ ومہ کے بس کا روگ نہیں۔ ایسا شخص جو قدیم وجدید سے آگاہ ہو۔ اور جس کی روح میں وہی جذبہ موجزن ہو، جو اقبال کی روح کو محیط تھا پھر اسکی نظریں عصری تحریکوں کے نشیب وفراز پر ہوں، اور وہ مشرق ومغرب کی نزاع کو سمجھتا ہو، اقبال سے خود بھی آشنا ہو سکتا ہے اور عامۃ الناس کو بھی اس سے آشنائی کی دعوت دے سکتا ہے۔

۴۔ اقبال کے شاعرانہ محاسن پر خامہ فرسائی کرنا نقد ونظر کی ایک مستحسن کوشش ہے، اور ادبی نقاد اس فریضہ سے بڑی حد تک حسن وخوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں لیکن اقبال ایک عصری شاعر ہونے کے باوجود محض شاعر ہی نہیں تھا لا زما وہ ایک عہد کا شاعر تھا، اور اس کا دور بھی عظیم دور ہے۔ لیکن وہ اپنی روح کے لحاظ سے مفکر تھا۔ چنانچہ اس کا فکر ایک اثباتی نصب العین کا مصور بھی ہے اور معلم بھی۔

۵۔ اس کا اصل پیغام توحید ورسالت کی اساس پر مسلمان اقوام اور انکی وساطت سے ملت اسلامیہ کی انفرادی اور اجتماعی انا یعنی خودی کی تکمیل ہے جس کے معنی اظہار ذات کے علاوہ انسان کی اجتماعی تعمیر اور معاشرہ کی بکلی تطہیر ہے۔

۶۔ یہ ایک سانحہ سے کم نہیں کہ اقبال کے کلام کو اس کے نثری افکار کے ساتھ اب تک نہ پڑھا گیا۔ یار لوگوں نے اپنی ہی تعبیریں اور تفسیریں قلمبند کی ہیں۔ اقبال کے خطبات، خطوط اور بیانات سے مطلقاً فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ بلکہ عام طور پر انہیں نظر انداز ہی کیا گیا ہے۔

۷۔ اقبال کے افکار مغرب کی بالادستی کے خلاف نہ صرف مشرق کی گمشدہ فکر کا احتجاج ہیں۔ بلکہ سامراج کے استیلا اور یورپی فلسفہ وفکر کے ارتقا پر طنز وتنقید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے دانشوروں میں سے کسی شخص نے اقبال بنام یورپ کے زیر عنوان اب تک کوئی تصنیف سپرد قلم نہیں کی ہے۔ بلکہ خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی تالیف فکر اقبال میں اقبال کے اس زاویہ نگاہ کی تحقیر کی ہے۔ اقبال کی فکری حیثیت کو اجاگر کرنے اور اس کی صداقت کا نقش جمانے کیلئے اقبال کی یورپ سے فکری کشمکش کو جب تک نمایاں نہیں کیا جائیگا۔ اس وقت تک اقبال کے فکری موقف کی کامیابی مشکوک ہے۔ بلکہ تعلیمات اقبال کی اصلیت ہی گم رہتی ہے۔

۸۔ اقبال نے وقت کی معاشی وسیاسی، تہذیبی وتعلیمی اور دینی وثقافتی تحریکوں کا نہ صرف تجزیہ کیا ہے بلکہ ان کے خفی وجلی پہلوؤں کو زیر قلم لا کر مطالعہ ومشاہدہ کے راستے قائم کئے ہیں۔ عصر حاضر کے خلاف اقبال کی یہ جنگ کئی عنوانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ کوئی سا عنوان بھی یورپی سانچے میں ڈھلے ہوئے

ایشیائی دماغ کے زیر غور نہیں ہے۔

۹۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑی لعنت سرمایہ داری کا نظام ہے۔ اقبال، تاریخ کی مادی تعبیر کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن وہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف سخت سے سخت الفاظ میں احتجاج کرتا اور یورپ کے سامراج کی بہ نسبت روس کی دہریت کے نعرہ رستخیز پر صاد کرتا ہے۔ یہ اسکا منفی جذبہ ہے۔ مگر اس کے پس منظر میں اسلام کی اثباتی روح مضمر ہے۔ جس کا دوسرا نام اس کے نزدیک فقر غیور ہے۔ اور جس کے احیاء، تجدید پر وہ دل وجان سے یقین رکھتا ہے۔ کسی شخص نے اس ضمن میں نہ تقابلی مطالعہ کیا، اور نہ اقبال و مارکس کے معاشری نظریوں کا جائزہ لیا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ اچنبہ کی بات ہو مگر جس رخ پر نوجوان پود کے دماغ بہہ رہے ہیں اس پر بند لگانے کے لئے دونوں کا تقابلی مطالعہ نہایت مفید دماغی نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

۱۰۔ اقبال نے مسلمانوں کے دماغی انحطاط اور سیاسی زوال کا باعث ملوکیت، ملائیت اور تصوف کو قرار دیا ہے۔ اس امر کی نشاندہی بھی کی ہے کہ ملوکیت نے اسلام کی حقیقی روح کو کب ختم کیا، ملائیت میں جمود کب پیدا ہوا، اور تصوف کا عجمی پودا اخلاص فی العمل کے برعکس ایک خاص قسم کی مسکینی وگوشہ نشینی کا علم بردار کیونکر بنا۔ افسوس ہے کہ اس عنوان سے یا ان عنوانوں پر ہمارے دانشوروں نے ابھی تک کوئی قابل ذکر تحقیقی کارنامہ سرانجام نہیں دیا یہ ایک دینی اور تاریخی تحقیق وتفسیر کا موضوع ہے۔ جن لوگوں نے بڑے حوصلے اور یقین کے ساتھ اقبال پر قلم اٹھایا ہے وہ یا ادبیات اقبال میں کھو کر رہ گئے ہیں یا اس قسم کے فلسفیانہ مباحث میں گھرے ہوئے ہیں کہ اقبال زندہ ہوتے تو اس کے خلاف سب سے زیادہ احتجاج کرتے۔

۱۱۔ تلمیحات اقبال کے عنوان سے کوئی ثقہ کتاب اس وقت تک مرتب نہیں ہوئی۔ جو مرتب ہوئی ہے اس میں اس قسم کی فحش غلطیاں ہیں کہ اول تو وہ بازاری خلاصہ معلوم ہوتی ہے۔ دوم مرتب یا مرتبین کا نقطہ نگاہ سطحی ہے۔ وہ کلام اقبال سے واقف ہیں، روح اقبال سے نہیں۔

۱۲۔ اقبال کے بعض مقالات جو اس کے تصورات ونظریات کا بنیادی حصہ ہیں ایک تاریخی اور فکری پس منظر رکھتے ہیں ابھی تک ان کے حل کی کوئی سی کوشش اثباتی شکل میں سامنے نہیں آئی؟ حل کا لفظ ممکن ہے یہاں صحیح نہ ہو کیونکہ ان مشکلات کے بارے میں اہل قلم میں سے بعض فضلاء نے بہت کچھ لکھا ہے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقالات اقبال کی توضیحات وتشریحات علمی اعتبار سے مرتب نہیں ہوئی ہیں۔

۱۳۔ لغت اقبال مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ عرصہ ہوا ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مبسوط مقالہ میں اس پر زور دیا تھا۔ جب تک اقبال کے الفاظ ومعانی کی روداد مرتب نہیں کی جاتی اور اس کے ساتھ ساتھ

اس کی ترکیبوں، تمثیلوں، کنایوں، روایتوں، حکایتوں، مصلحتوں اور شخصیتوں کا فرہنگ تیار نہیں ہوتا۔ اقبال کا مطالعہ آسان نہیں۔ ہم اس کے جذبہ سے سرشار ہو سکتے ہیں، روح سے نہیں۔

۱۴۔ اقبال کو بعض شخصیتیں انتہائی محبوب ہیں۔ مثلاً پیر رومی کو تو وہ اپنا مرشد مانتے ہیں۔ لیکن ان سب کے متعلق سوانحی وفکری مواد اپنی وضاحتوں کے ساتھ موجود نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا سارا کلام جہد و ایثار کی دعوت ہے۔ وہ ایک لحظہ کے لئے بھی میدان جہاد سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ مگر جن لوگوں سے انہوں نے عشق ومقصد کی راہ میں استفادہ کیا ہے۔ وہ زیادہ تر شاعر ہیں یا صوفی۔ اس اعتبار سے وہ جلالی کم ہیں جمالی زیادہ۔۔۔۔ لیکن ان کے شاعر وصوفی روزمرہ کے شاعر وصوفی نہیں، جن کی نگاہ افکار محدود ومختصر ہو بلکہ اس قسم کے شاعر وصوفی ہیں، جن کا طغرائی امتیاز ہے ؎

یا میں نہیں ، یا گنبد افلاک نہیں ہے

اس کے محرکات بھی زیر تحریر لائے جا سکتے ہیں۔ مگر ابھی تک کسی نے اس طرف نظر نہیں اٹھائی۔

۱۵۔ سب سے بڑی بات جو تشنہ تحریر ہے، اقبال کے فکری ارتقاء کا جائزہ ہے۔ اس عنوان پر لوگوں نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے مگر کوئی چیز مربوط ہے نہ مسلسل۔ جب تک عصری تحریکوں کا جائزہ نہ لیں اور ان کے اسباب ومحرکات کو نہ دیکھیں جو عالمی افکار میں یورپی دانش کے چھا جانے کا باعث ہوئے۔ اس وقت تک اقبال کے فکری ارتقا کی سرگزشت کھل نہیں سکتی اور نہ بعض سطحی لوگوں کا یہ الزام کہ اقبال کے ہاں تضاد ہے۔ رفع شک کا باعث ہو سکتا ہے۔ جب تک ہم یورپ کے معاشرتی اور مملکتی نظریوں کے اتار چڑھاؤ کی روداد بہ قید عصر معلوم نہ کرلیں اقبال کا فہم آسان نہیں ہے۔

۱۶۔ اقبال نے خود ہمارے ذہنوں پر کیا اثر ڈالا۔ ہندوستان میں کس قسم کی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اقبال کا ان میں ذہنی حصہ کیا ہے؟ اس کا فکری کردار کیوں تھا؟ اور مسلمانوں کے فکری ارتقا میں اس کے تصورات کس حد تک دخیل ہیں؟ یہ باتیں ابھی مطالعہ اور تجربہ کی منتظر ہیں۔

۱۷۔ اقبال نے ''احمدیت'' کے بارے میں بڑی واضح باتیں کہیں ہیں۔ بلکہ وطنیت کے مضمرات پر جو تنقید کی ہے۔ اس سے زیادہ شدید الفاظ احمدیت کے بارے میں بھی استعمال کیے ہیں۔ واقعتاً ان کی یہ تحریریں بڑی اہم اور مطالب وافکار کا سرچشمہ ہیں۔ ان کی بنیاد پر الٰہیات واسلامیات کے علاوہ رسالت ومنشائے رسالت کے بے شمار گوشوں پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے اور حسن ظن رکھتے ہوئے یہی کہنا چاہیے کہ اقبال کے ایمان واعتقاد کا یہ پہلو طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی کو وطنیت کی

بحث میں زیر تنقید لانے والے بھی کہ مولانا مدنی اور علامہ اقبال میں غلط روایت کے ازالہ پر تصفیہ ہو گیا تھا۔ اپنی سی کہی جا رہے ہیں۔ مگر احمدیت و اقبال کے عنوان سے ان کے قلم گنگ ہیں۔

۱۸۔ معاشرہ انسانی کے دو پرابلم ہیں۔ اولاً سرمایہ داری اور اس کے عوارض۔ ثانیاً عورت اور اس کا وجود۔ اقبال نے ان دونوں موضوعات پر قلم اٹھایا اور فکر ونظر کے راستوں کو ہموار کیا ہے۔

لیکن کسی اہل قلم یا اہل فکر کو توفیق نہیں ہوئی کہ عالم انسان کے ان دو بڑے مسئلوں پر اقبال کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں بھی بعض پراگندہ مقالات موجود ہیں۔ یا ایک آدھ چھوٹا موٹا کتابچہ۔ مگر اس میں ظواہر کے مباحث زیادہ ہیں۔

مسئلہ زمین اقبال کے نزدیک ایک حل شدہ امر تھا۔ سرمایہ و محنت کی کشمکش میں وہ استحصال کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ وہ سرمایہ داری کی کسی شکل کو بھی قبول نہیں کرتا۔ وہ اشتمالیت کے نظام میں خدا کی نفسی کے خلاف ہے؛ تاریخ کے جدلیاتی پس منظر کو بکمال وتمام تسلیم نہیں کرتا مگر سرمایہ داری کی جتنی شکلیں بھی ہیں اقبال ان سے بغاوت کرتا ہے۔

۱۹۔ دوسری زبانوں کے علاوہ خود اردو میں اقبال کے فارسی کے مستند تراجم اور ثقہ شرحیں ہونی چاہییں۔ ورنہ کلام اقبال کا یہ حصہ فکری اعتبار سے پردہ اخفا میں جا رہا ہے۔ اور عوام کے اذہان پر اس کی واضح چھاپ نہیں ہے۔

۲۰۔ ضرب کلیم اقبال کے اپنے الفاظ میں عالمی مسائل کے مختلف عنوانوں پر اس کی اسلامی روح کا نہ صرف نالہ احتجاج ہے بلکہ نقد ونظر کا ایک ایسا پیانہ ہے۔ جس سے مطالعہ ومشاہدہ کی بے شمار راہیں خلوت خانہ افکار پر کھل جاتی ہیں۔ غرض۔۔۔۔۔۔ یہ وہ پہلو ہیں۔ جو اپنے مضمرات کے اعتبار سے نہایت وقیع ورفیع ہیں۔ اور یہ بدیہی امر ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا خواب اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان خطوط کو اپنے غور وفکر کا مرکز نہ بنالیں۔ اور اس پر اپنے مستقبل کی عمارت نہ اٹھائیں۔ اندریں حالات اقبال کا یہ بیان ہمارے لئے تازیانہ عبرت کی حیثیت رکھتا ہے کہ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں سے اسلام کی اتنی حفاظت نہیں کی جتنی خود اسلام نے مسلمانوں کی حفاظت کی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کا دماغی انحطاط وروحانی افلاس، معاشی درماندگی اور سیاسی زوال ہے۔ افسوس کہ یار لوگوں نے اقبال کے مباحث میں سے انہی موضوعات کو خارج کر رکھا ہے۔

(ہفت روزہ چٹان ۳ جون ۱۹۶۳ء)

۱۹۶۸ء

یوم اقبال کی تقریبات

۲۱ اپریل علامہ اقبال کا یوم وفات ہے۔ اس دن ایشیا کا یہ سب سے بڑا فلسفی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ ان کی موت کو اس روز ۳۱ سال ہو جائیں گے۔ اقبال کے افکار سے قوم کی عقیدت کا جو حال ہے وہ ڈھکا چھپا نہیں۔ ہر ایسا شخص جس کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا احساس ہے۔ اقبال سے عقیدت رکھتا ہے۔ اور اس کے فکر کا شیدائی ہے۔ کوئی تذکرہ ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ ذرا ان کی عظمت کا اندازہ کیجئے۔ کہ ادب ان کے احترام سے معمور ہے۔ سیاست ان کے تخیل کی ممنون ہے۔ تعلیم ان کے خیالات سے آشنا ہے۔ پاکستان کا ذہنی سفر ان کا شکر گزار ہے۔ مسلمانوں کے دماغی افکار پر ان کی چھاپ ہے۔ ایک شخص جس کا سارا سرمایہ پیچ وتاب رازی اور سوز و ساز رومی ہے۔ اس صدی کے نصف سے ایشیائی افکار پر چھایا ہوا ہے اور اس کا دماغی سفر مسلمان اقوام کیلئے زندگی کی تحریک ہو چکا ہے۔

آئندہ ماہ ۲۱ اپریل کو سارے ملک میں حسب معمول یوم اقبال منایا جا رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اقبالین اپنے افکار و خیالات پیش کریں گے۔ گزارش یہ ہے کہ اقبال کو محدود نہ کیا جائے اور نہ کوئی خاص طائفہ ان کے افکار پر اپنے افکار کی نمائش کرے۔ اقبال شاعر فردا ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے افکار میں سے ان خطوط کو اپنے لئے سنگ میل بنائیں جن میں ان کے نظریات کا واضح عکس پایا جاتا ہے۔۔۔۔ اقبال جس سوسائٹی کو بنانے کے متمنی، جس مملکت کو سنوارنے کے خواہاں اور جن عناصر کی ترکیب پر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے محرک تھے، یوم اقبال پر انہی افکار کو عام ہونا چاہیے۔ یوم اقبال ان لوگوں کی تقریب نہیں جو مجاوروں کا انداز اختیار کر کے اپنے من کی خواہشوں کو اجالتے اور اچھالتے ہیں۔ اقبال کا مشن ایک اسلامی معاشرہ کا قیام اور اس معاشرہ میں شریعت اسلامیہ کا احیاء ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے انکار کیا نہیں جا رہا لیکن اقرار مفقود ہے۔

(ہفت روزہ چٹان ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ء)

لاہور میں یوم اقبالؒ کی بعض خصوصیتیں ۱۹۷۰ء

سرفروش تنظیم نے سرخوں کو خوف زدہ کر دیا

عظیم الشان یوم اقبال

۲۱ اپریل کو حسب روایت پنجاب یونیورسٹی ہال میں یوم اقبال ساڑھے نو بجے صبح منایا گیا، آقائے محمد حسین مشائخ فریدانی سفیر کبیر ایران اس دفعہ صدر تقریب تھے۔ سپریم کورٹ کے جج، ہائی کورٹ جج، اعلیٰ آفیسر، یونیورسٹی کے اساتذہ، وائس چانسلر اور علم وقلم کے نامور فرزند حسب معمول شریک تقریب تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے یعنی صبح ۸ بجے ہی یونیورسٹی ہال عوام سے کھچا کھچ بھر گیا۔

اب کے ہال سے باہر باغ میں بھی نشستوں کا انتظام تھا۔ جتنے لوگ ہال میں موجود تھے اس سے دو گنے لوگ ہال سے باہر کھلے لان میں نو بجے تک اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اس کے علاوہ سڑک پر پانچ، چھ ہزار افراد کا ہجوم تھا۔ یونیورسٹی کے برآمدے اور ہال کے پیچھے بھی نوجوانوں سے پر تھے۔

اس دفعہ ایک خصوصیت یہ تھی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی زندگی میں پہلی بار علامہ اقبال کے متعلق اظہار خیال کرنے یوم اقبال کی اس قومی تقریب میں شامل ہوئے تھے۔۔۔۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، نواب زادہ نصراللہ خان، ڈاکٹر جاوید اقبال اور آغا شورش کاشمیری کی آمد پر حاضرین نے نعرہ ہائے تحسین سے خیر مقدم کیا۔ سارا ہال ان کی آمد پر زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔

سرفروش تنظیم

یوم اقبال کی تقریب پر اسلامی جمعیت طلبہ کے علاوہ جس تنظیم کے نوجوان والہانہ انداز میں چھائے ہوئے تھے اور شروع سے آخر تک اپنے دینی جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے رہے وہ آغا شورش کاشمیری کی تنظیم نو کے ایک ہزار نوجوان تھے۔ یہ ایک ہزار نوجوان پچھلے تین دن میں تحریک کا جزو غیر منفک بن گئے، ان کے سینوں پر سرفروش کا سبز بیج لگا ہوا تھا۔ جس سے وہ تمام عناصر خوف زدہ تھے، جنہیں واہمہ تھا کہ وہ لاہور میں اپنے گوریلوں کی معرفت سرخ انقلاب لانے کے قصدات رکھتے ہیں۔

اسلام سے والہانہ عشق

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو لوگوں نے اس انداز میں سنا کہ وہ لوگ جو ان کے متعلق شنیدہ روائتوں کی بنیاد پر موافق ومخالف رائے رکھتے تھے۔ موافق سے معتقد اور مخالف سے موافق ہو گئے۔ حتیٰ کہ جلسہ گاہ میں موجود سینکڑوں خواتین نے بھی مولانا کے خیالات سے اتفاق کیا۔ بلکہ اس کی تائید کی۔ اکثر بہنوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ بعض بے قابو سیاستدانوں نے مولانا کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ ان کے برعکس مولانا اسلام کی صداقتوں کی تصویر ہیں۔۔۔۔۔ مولانا کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ۔۔۔۔۔۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور اب۔۔۔۔ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

مولانا نے فرمایا، پاکستان میں اب بے دین سیاست اور بے سیاست دین نہیں چل سکتا۔

رواں دواں تبصرہ

آغا شورش کاشمیری نے مرکزیہ مجلس اقبال کا جنرل سیکرٹری ہونے کی حیثیت میں ہمیشہ کی طرح اسٹیج کو کنٹرول کیا۔ ہر مقرر سے پہلے اور بعد انہوں نے نپے تلے الفاظ میں تبصرہ کیا کہ لوگوں کے ذہن میں ہر کلمہ نقش ہوتا گیا۔۔۔۔۔ انہوں نے حاضرین سے شروع میں کہا:۔

(۱) اس قومی تقریب کو اس طرح منائیں کہ ادب ہر موڑ پر ملحوظ رہے۔ اور ہر کہ ومہ کو معلوم ہو گویا شگفتہ بحر کی غزل میں ردیف کے ساتھ قافیوں کی لڑیاں پرو دی گئی ہیں۔

(۲) مولانا کی تقریر سے پہلے آپ نے فرمایا۔ اب اس طرح سنیئے جس طرح رات کا سناٹا چمکتے ہوئے تاروں کی کتھا سنتا، اور چپ چاپ محظوظ ہوتا ہے۔

(۳) مولانا تقریر کر چکے تو آغا صاحب نے کہا مولانا نے اقبال کے حوالے سے صحیح فرمایا ہے کہ ''عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد''، جو لوگ یہاں اسلام کو تاراج کر کے سوشلزم لانا چاہتے ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا اور اسلام کے نام پر زندہ رہے گا۔ البتہ ہم لوگ ان کے مقابلہ میں عصا اٹھا کر ضرب کلیمی لگانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ سرفروش تنظیم اس ضرب کلیمی کا حرف آغاز ہے۔ کمیونسٹ نوٹ کر لیں۔۔۔۔

سرخوں سے بیزاری

(۱) تقریباً ہر مقرر نے اس ملک کے خفی وجلی سوشلسٹوں سے بیزاری کا اظہار کیا۔ بار بار اعلان کیا گیا کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اسلام کے نام پر رہے گا۔ اور اسلام کے نام پر کوئی بات نہ سنی جائے گی۔ حاضرین نے جوش وخروش سے اس پر صاد کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے متعلق اس پرشکوہ تقریب کے اکابر وعوام کی موجودگی میں کھل کر بیان کیا گیا۔ کہ ان کا سوشلزم ایک دھوکا ہے۔ اور مسلمان اس دھوکے کو کسی حال میں بھی قبول کرنے کے لیئے تیار نہیں۔

(۲) اخباروں کی ہڑتال سے متعلق اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ کمیونسٹوں نے اس ہڑتال کو اپنی سرخ سیاست کے حق میں استعمال کر کے ورکنگ جرنلسٹوں کے مطالبہ کو ذبح کیا اور اسلام دوست اخباروں کو گزند پہنچانے کی اوچھی حرکت کی ہے۔

(۳) ''ندائے ملت'' اور ''مشرق'' کو جو آجکل برابر نکل رہے ہیں۔ زندہ باد کے نعروں سے خراج تحسین ادا کیا گیا کہ انہوں نے ہڑتال میں شریک نہ ہو کر سرخوں کے ہتھکنڈوں کو فاش کر دیا ہے۔

(۴) کمیونسٹوں کو خبردار کیا گیا کہ اپنی دہشت پسندیوں سے باز آئیں ورنہ ان کا ہر محاذ پر مقابلہ کیا جائے گا۔

جلوس

ایک بجے کے لگ بھگ جلسہ ختم ہوا، آغا شورش کاشمیری کی خواہش پر تقریب کے ننانوے فی صد حاضرین نے کمیونسٹوں کیخلاف مظاہرے کے طور پر جلوس نکالا۔ اس جلوس سے ضلعی حکام کو قبل از وقت مطلع کر دیا گیا تھا۔ یہ جلوس آغا شورش کاشمیری کی سربراہی اور چودھری غلام جیلانی کے علاوہ مسٹر صفدر حسین صدیقی کی قیادت میں روزنامہ ''ندائے ملت'' کے دفتر پہنچا وہاں مجید نظامی زندہ باد اور ''ندائے ملت'' ''زندہ باد'' کے نعروں سے فضا گونجتی رہی۔ مسٹر صفدر حسین صدیقی نے کہا ہم ورکنگ جرنلسٹوں کے جائز مطالبات کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن ہڑتال کو سرخوں کا آلہ کار کبھی نہ بننے دیں گے۔ اس لئے ہم نے ''ندائے ملت'' اور ''مشرق'' کے خلاف کمیونسٹوں کی بدگوئی پر احتجاج کرتے ہوئے ان اداروں کو بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے۔

''ندائے ملت'' کے دفتر سے ہوتا ہوا جلوس میکلوڈ روڈ پر پی پی آئی کے دفتر پہنچا۔ وہاں مسٹر بشیر صدیقی برانچ نیجر اور ملک معظم علی مینیجنگ ڈائریکٹر کے حق میں نعرے لگائے۔ وہاں سے جلوس جو بلا مبالغہ دس ہزار افراد کے لگ بھگ تھا۔ دفتر ''مشرق'' پہنچا، جہاں ''مشرق'' کے زندہ دل عملہ نے جلوس کا بے پناہ گلباری سے استقبال کیا۔ جلوس کے شرکاء نے ''مشرق'' زندہ باد، اقبال زبیری زندہ باد، مسٹر عنایت اللہ زندہ باد، مسٹر ضیاء الاسلام زندہ باد اور مسٹر تمکین احسن زندہ باد کے نعروں سے فضا کو گرما دیا۔ یہاں آغا شورش کاشمیری نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم کمیونسٹوں سے ٹکرانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور ہم کسی اسلام پسند اخبار پر آنچ نہ آنے دیں گے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۷ اپریل ۱۹۷۰ء)

یوم اقبالؒ ۱۹۷۴ء

۲۱ اپریل کو ملک بھر میں یوم اقبال منایا جا رہا ہے چونکہ ملک کے سیاسی مزاج میں خلل و انتشار ہے۔ اس لئے اس قومی تقریب میں بھی وہ دھوم دھام نہیں جو اختلاف فکر و نظر کے باوجود اس تقریب کا طغریٰ امتیاز تھا۔ افسوس جو چیزیں یکساں ہیں۔ وہ بھی بعض کوتاہ اندیش یا بد دیانت عبقریوں کی بدولت نشست و افتراق کی نظر ہو چکی ہے۔

اقبال کو پاکستان سے محذوف کر دیں تو پاکستان ذہانت ملی کے اعتبار سے محض ایک بیان رہ جاتا ہے۔ اقبال کے سوا اور کون ہے۔ جو برعظیم کے مسلمانوں کی عظیم ذہنی سرگزشت کا نمائندہ ہو یا اس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ مسلمانوں کی دماغی رہنمائی کا فرض اس سے زیادہ کسی اور نے انجام دیا ہے۔

اقبال کے خلاف صرف تین عناصر ہیں۔

اولاً خدا کے باغی کمیونسٹ

ثانیاً رسول ﷺ کے باغی قادیانی

ثالثاً سیکولر قسم کے آوارہ ذہن انسان۔ لیکن مسلمانوں کے سواد اعظم سے ان کا مقابلہ ہی نہیں۔

یہ لاکھوں میں چند انسان ہیں۔ انہیں پرکاہ وقعت نہ دینی چاہیے۔ البتہ ان کے شر کا مقابلہ کرنا مسلمان عبقریوں کا فرض ہے۔

ہم دیانتداری سے محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان جس سیاسی بحران کا شکار ہے۔ اور مسلمان جس انتشار کے نرغہ میں ہیں۔ اس سے محفوظ و مصئون رکھنے کے لیے آج صرف اسلام سے غیر متزلزل وابستگی اور اقبال کے افکار کی والہانہ اشاعت ہی قلعہ استحکام ہے۔ مجولا تینوں گروہ اقبال سے یوں ڈرتے ہیں۔ جس طرح پو کا پھٹنا رات کے اندھیروں کی موت ہوتا ہے۔

(ہفت روزہ چٹان ۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء)

لاہور میں یوم اقبال ۱۹۷۴ء

قادیانیت کے ملحدانہ رخسار پر طمانچہ اسلام

۲۱۔ اپریل کو لاہور میں یوم اقبال یونیورسٹی ہال میں روایتی شان وشکوہ سے منایا گیا۔ مرکزیہ مجلس اقبال کی طویل تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اب کے اس کی صدارت کے فرائض ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور معمر عوامی راہنما میاں امیر الدین نے انجام دیے۔ میاں صاحب لاہور کی عمرانی تاریخ ہیں۔ شرافت کی تصویر علامہ اقبال کے سمدھی، میاں صاحب کے ایک طرف لاہور میو ہسپتال کے نامور سرجن ڈاکٹر امیر الدین فروکش تھے اور ان کے ساتھ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس قدیر الدین۔ دوسری طرف آغا شورش کاشمیری (جنرل سیکرٹری) اور مسٹر مشتاق احمد اسسٹنٹ سیکریٹری مجلس اقبال تشریف فرما تھے۔ ان کے علاوہ لاہور کی مایہ ناز شخصیتوں کا ایک انبوہ اسٹیج کے علاوہ سامنے صوفوں پر جلوہ فگن تھا۔ تمام کالجوں کے سٹوڈنٹس لیڈر بھی تشریف فرما تھے۔ کئی ایک جج کئی ایک آفیسر اور بے شمار وکلاء کے علاوہ بیسیوں اساتذہ موجود تھے سب سے پہلے کرنل شہباز خان نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان، صدر پاکستان چودھری فضل الٰہی اور بعض سفراء کے پیغامات پڑھ کے سنائے۔ مسٹر بشیر حسین ناظم نے اپنی ولولہ انگیز آواز میں کلام اقبال سے تقریب کا آغاز کیا اسکے بعد میاں امیر الدین کا خطبہ صدارت آغا شورش کاشمیری نے اپنی بلند آواز میں پڑھ کے سنایا۔ نامور قانون دان مسٹر خالد اسحاق کا بلند پایہ مقالہ چونکہ انگریزی میں تھا اس لئے اس کا دو تہائی حصہ عوام کی سماعت سے محروم ہو گیا۔ مفتی محمد ادریس ایڈووکیٹ ایبٹ آباد نے اپنے خوبصورت فقروں سے نقش جمالیا اور عوام سے خوب داد پائی۔ شاعر اسلام حفیظ جالندھری نے راقم کی معلومات کے مطابق پہلی دفعہ بغیر ترنم اپنا کلام بلاغت التیام سنایا اور لوگوں نے احترام سے سنا۔ لیکن جس شخص کے کلام نے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو کھینچ لئے اور بہت سے ثقہ چہرے اشکبار ہو گئے وہ مشیر کاظمی کا کلام دلگداز تھا۔ ان سے زیادہ کسی شاعر کو داد ملی نہ اتنی تحسین نہ اتنی ستائش۔ علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ مشیر کاظمی نے علامہ اقبال کی لحد پر حاضر ہو کر مسلمانوں کی موجودہ سیاست کا مرثیہ لکھا اور وہ سامعین کے دلوں میں اتر گیا۔

جسٹس قدیر الدین نے نہایت اجلی اردو میں اقبال کو خراج ادا کیا اور بتایا کہ کلام اقبال سے وہ کس

طرح متعارف ہوئے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ نے ان کے تعارف کی بنا ڈالی۔ مولانا ابوبکر غزنوی نے اپنے پر زور اور باوقار لہجہ میں کلام اقبال کے مضمرات بیان کئے اور دوران تقریر لوگوں کے ذہن پر سحر کی طرح چھا گئے۔ طلباء کے خوش رو لیڈر محترم جاوید ہاشمی نے اپنی بے باک آواز میں کلام اقبال کی حقیقی روح کا جائزہ پیش کیا اور اعلان کیا کہ نوجوان طلباء کلام اقبال کو ایوانوں سے نکال کر بازاروں اور گلیوں میں پوری قوم کے رگ و ریشہ میں لہو کی طرح دوڑا دینا چاہتے ہیں۔

آغا شورش کاشمیری اجلاس شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد پہنچے لیکن حاضرین کی ان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ادھر وہ دروازے سے داخل ہوئے ادھر تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ پھر وہ میاں امیر الدین کا خطبہ پڑھنے کے لئے اٹھے تو پر زور تالیاں بجیں اور جب انہوں نے اپنی تقریر شروع کی تو پینتالیس منٹ کی مختصر و مفصل تقریر انہوں نے اس طرح ختم کی کہ تالیوں کی تکرار، تحسین کے نعرے اور ستائش کے الفاظ ان کے فقروں پر نچھاور ہوتے رہے۔ انہوں نے نہایت بے باکی، دلیری، صاف گوئی اور بعض مراحل میں تلخ نوائی سے حقائق کا انکشاف کیا۔ انہوں نے فرمایا۔

۱۔ اقبال اکادمیوں نے اقبال کے سوانح و افکار پر جو کتابیں لکھی ہیں۔ وہ ان کے فکر و فن اور عظمت و شخصیت کی توہین ہیں۔

۲۔ کلام اقبال کے عناصر خمسہ ہیں۔

(۱) خودی (۲) مشرق کی نشاۃ ثانیہ (۳) توحید و رسالت کی اساس پر اسلام سے غیر متزلزل وابستگی (۴) عشق کی پختگی اور عقل کی خام کاری (۵) تنقید فرنگ

۳۔ علامہ اقبال کے مستند مجموعوں کے کل اشعار ہیں۔ ۱۲۴۹۱ جن میں ۱۹۴ اشعار اور ایک مصرع دوسرے شعراء کا ہے۔ گویا کلام اقبال میں علامہ اقبال کے اشعار ۱۲۲۹۶ اور ایک مصرع ہے۔ اور ان کے عناصر خمسہ وہی ہیں۔ جو بیان کیے ہیں۔

۴۔ ''اقبال اور برگساں''، اقبال اور نطشے'' ''اقبال و گوئٹے'' ''اقبال اور حیدر آباد'' ''اقبال اور بھوپال''، اقبال اور عطیہ فیضی'' ''حیات اقبال کا جذباتی دور''، بابائے اردو اور اقبال'' وغیرہ لکھنے والے حقیقی اقبال پر قلم کیوں نہیں اٹھاتے؟

۵۔ ''اقبال اور احمدیت'' بھی تو ملت اسلامیہ کی بقاء و استحکام کے لئے اقبال کا سب سے اہم موضوع رہا ہے۔ لیکن اس سے متعلق دانشوران اقبال کی زبانیں گنگ ہیں اور قلم شکستہ ہیں تو کیوں؟

آغا صاحب نے اعلان کیا کہ میں نے اس موضوع کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔ آغا صاحب نے دو قراردادیں پاس کروائیں۔ پہلی قرارداد میں مسٹر بھٹو وزیر اعظم پاکستان کو ایر مارشل ظفر چودھری کی سبکدوشی پر مبارک باد دی گئی۔ دوسری قرارداد میں علامہ اقبال کے مطالبہ کی اساس پر حکومت پاکستان سے درخواست کی گئی کہ وہ مرزائیوں کو ایک جداگانہ اقلیت قرار دے۔ اعتراض ان کے مسلمانوں میں رہنے پر ہے۔ کہ وہ ملت اسلامیہ کا حصہ نہیں ہیں۔

حاضرین نے فلک شگاف نعروں کے ساتھ دونوں قراردادیں منظور کیں اور پورا ہال میرزائیت مردہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ راقم اس وقت بعض چہروں کو دیکھ رہا تھا، افسوس مشہور صحافی میاں محمد شفیع عرف م ش کا چہرہ فق تھا۔ وہ آغا صاحب کی پذیرائی اور عوام کی تحسین سے اس طرح ناخوش تھے کہ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ راقم آج تک یہ سمجھ نہیں سکا کہ لوگ آغا صاحب سے حسد کیوں کرتے ہیں؟ میں نے اس وادی میں گھوم پھر کے بہت سے لوگ ان کے حاسد پائے ہیں۔

آغا صاحب کے بعد سامعین نے طبیعت کے اضطرار کا ثبوت دیا۔ اور اسی فیصد اٹھ کے چلے گئے۔ بہر حال اس تقریب کے آخری مقرر علامہ اقبال کے نور نظر ڈاکٹر جاوید اقبال تھے۔ ڈاکٹر صاحب فل سکیپ سائز کے چودہ صفحوں کا مقالہ لکھ کر لائے تھے۔ موضوع کے اعتبار سے وہ مقالہ اس بڑی تقریب کی استعداد سے بالا تھا۔ اس مقالہ کے لئے دانشوروں کے ایک منتخبہ اجتماع کی ضرورت تھی، لیکن جو لوگ باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس مقالہ کو نہایت صبر و سکون سے سماعت کیا۔

لوگ اس جاوید اقبال کی تلاش میں تھے جس نے ایوب خاں کی آمریت کے زمانے میں معرکہ ہائے طنز و تنقید رچائے تھے۔ اور لوگ ان کے افکار کی چٹکیوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ لیکن اب عوام کا مذاق اور جاوید اقبال کا علم دو مختلف زاویوں پر ہیں۔ عوام زمین پر رہتے ہیں۔ اور زمین ہی کی باتیں سنتے ہیں۔ جاوید اقبال اب ہائی کورٹ کے جج ہیں، اب ان کے الفاظ احتیاط و متانت کے سانچے میں ڈھل کے صفحہ قرطاس پر آتے ہیں۔ عوام چونکہ ان میں اپنے بحر کی موجوں کا اضطراب نہیں پاتے اس لئے ان کے دلوں میں ان کے لئے احترام تو بے پناہ ہے۔ لیکن التفات کمزور پڑ گیا ہے۔ جاوید اقبال کا مطالعہ ہمارے فکر و نظر کے لئے ایک سنگ میل تھا۔ بہر حال اس تقریب نے ایک ایسا رنگ باندھا کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی جھوٹی رپورٹوں کے باوجود لوگ جانتے ہیں کہ حاصل تقریب کون لوگ تھے؟

(ہفت روزہ چٹان ۲۹۔ اپریل ۱۹۷۴ء)

ساتواں باب

منظومات بیادِ اقبال

حکیمِ مشرق

ابھی تو ہے بجلیوں کی زد میں ہر ایک طائر کا آشیانہ
ابھی تو ہے چہرۂ چمن پر خشونتِ گردشِ زمانہ

ابھی تو زنجیرِ پا کے حلقے، شکستِ زنداں کے منتظر ہیں
ابھی تو لیل و نہار کو ہے ضرورتِ ضربِ تازیانہ

ابھی تو دار و رسن پہ رہ رہ کے خونِ ناحق جھلک رہا ہے
ابھی تو یارانِ ہم سخن کے لئے مقدر ہے قید خانہ

ابھی تو محلوں کے رہنے والے جلالِ یزداں سے بے خبر ہیں
ابھی تو جمہور کی جبینیں ہیں اور شاہوں کا آستانہ

ابھی تو حوا کی بیٹیوں کا شباب بکتا ہے راستوں پر
ابھی تو زہرہ وشوں کی دوشیزگی ہے زیبِ شراب خانہ

عقیدتِ دل کے پھول لے کر چلا ہوں اقبالؔ کی لحد پر
کہ مرجعِ انقلابِ نو ہے حکیمِ مشرق کا آستانہ

"مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رلایا
کہ ایسے پُرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ"

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۴ جنوری ۱۹۵۷ء)

حضورِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ میں

اب جو شمشیر ہی ٹھہری ہے تو شمشیر سہی!
اک نئے دور کی اس طور سے تعمیر سہی

خانقاہوں میں اگر صاحبِ احوال نہیں
بتکدوں ہی سے کوئی نعرۂ تکبیر سہی

عیش خانوں میں چراغِ گل و لالہ روشن
بے زبانوں کے لئے نالۂ شب گیر سہی

خود فروشی کے عوض، قصرِ شہی کی دہلیز
خود شناسی کا صلہ حلقۂ زنجیر سہی

شہر یاروں کے دلآویز شبستانوں میں
کوئی عصمت کسی عنوان سے تسخیر سہی

ہم انہیں ان کے خدوخال سے پہچانتے ہیں
ہیں یہ کہنے کو جہانگیر، جہانگیر سہی

ہم نشینانِ زلیخا سے کوئی ساعتِ شب؟
کوئی مآئی کی اتاری ہوئی تصویر سہی

صحبتِ مرشدِ رومی سے گریزاں ہو کر
یومِ اقبال کی تقریب پہ تقریر سہی

میں نے زندانوں کو اپنا کے بہت دیکھا ہے
اور اک بار شکارِ فلکِ پیر سہی

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۲۲ اپریل ۱۹۵۷ء)

اولیٰ

﴿حکیم الامت کی صحبت میں﴾

نے طبل و علم اولیٰ، نے تاج و سریر اولیٰ
شمشیر و قلم افضل یا دلق و حصیر اولیٰ

کیا طنطنۂ قیصر، کیا ہمہمۂ کسریٰ
نے تیغ و سناں انسب، نے سیم و حریر اولیٰ

قاروں کا خزانہ ہو یا تختِ سلیماں ہو
دونوں سے بہر قیمت، آوازِ ضمیر اولیٰ

"یک ذرہ دردِ دل، از علمِ فلاطوں بہ
یک قطرہ خونِ دل، از تاج سریر اولیٰ

"یک اشک سحر تابے از دجلہ و جیحوں بہ
از مہر و مہ و انجم، یک قلب بصیر اولیٰ

آں شاعرِ درویشے، ایں نکتہ عجب گفتے
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۸ء)

صحبتِ اقبالؒ میں

کوئی بھی محرمِ بادہ نہیں زمانے میں
گلاب لے کے چلا ہوں شراب خانے میں

"گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی میں"
ہم ایسے لوگ کہاں ہیں شراب خانے میں

لہو کے داغ گریبانِ برگ و بار پہ ہیں
دراز دستیِ صرصر سے آشیانے میں

چمک رہے ہیں جبینوں کے نا تمام حروف
سوادِ منبر و محراب کے فسانے میں

عجم کا ذوقِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں
نکھر رہا ہے فقیروں کے آستانے میں

یہ رازِ صحبتِ پیرِ مغاں سے فاش ہوا
"مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہوں میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو"

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۳ فروری ۱۹۵۹ء)

سرکاری یومِ اقبالؒ

یہ طائرِ چمن ہے، چمن سے نکال دو
اس خوشنوا کو سرو و سمن سے نکال دو

ہر مصلحت شناس سے لو درسِ آگہی
ہر بے نوا کو اس کے وطن سے نکال دو

لادین قوتوں کی حمایت کے نام پر
ذکرِ خدا کو شعر و سخن سے نکال دو

لازم نہیں فسانۂ حلاّج کا شعور
اس کو کتابِ دار و رسن سے نکال دو

اعلان سن رہے ہو عزیزانِ محترم!
روحِ محمدؐ اپنے بدن سے نکال دو

"اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو"

(کلیاتِ شورش۔ صفحہ ۱۳۷)

درویشِ بے گلیم

اک ابرِ نوبہار فضاؤں پہ چھا گیا
اقبالؔ اس چمن کی رگوں میں سما گیا

دل کا خروش، عشق کا شعلہ، نظر کی آگ
اپنے قلم کی گرم نوا سے بڑھا گیا

اس کی صدا تھی، صورِ سرافیل کا جواب
اس کا خروش، ہر کہ و مہ کو جگا گیا

اقصائے چیں سے تابہ سوادِ طرابلس
جلوہ گہِ حیات کے پردے اٹھا گیا

دو چند ہیں ادب کی نواہائے تاب دار
شعر و سخن کے نام سے موتی لٹا گیا

کشمیر کی بہشت کا درویش بے گلیم
بطحا کی وادیوں کے ترانے سنا گیا

رومی کے سوز و ساز کی دولت سے بہرہ یاب
فطرت کے پیچ و خم سے نقابیں اٹھا گیا

ضربِ کلیم اس کی نواؤں کا ماحصل،
وہ یوں اٹھا کہ مشرق و مغرب پہ چھا گیا

ہر رہ نما کو منزلِ عرفاں کی دی خبر
ہر راہرو کو جادۂ ایماں بتا گیا

شورشؔ مرے قلم کو دیا اذنِ انقلاب
اور خواجگانِ دہر سے لڑنا سکھا گیا

(کلیاتِ شورش۔ صفحہ ۲۰۹،۲۱۰)

تربتِ اقبالؒ

چپ ہے تری آغوش میں اک پیر کہن سال
جبریل کے بازو سے لیے جس نے پر و بال
اے تربتِ اقبال

تو خواب گہِ شاعرِ تسلیم و رضا ہے
یہ خاک تری مہبطِ انوارِ خدا ہے
اے تربتِ اقبال

اک مردِ قلندر کی نوا جھوم رہی ہے
رحمت ترے ذروں کی جبیں چوم رہی ہے
اے تربتِ اقبال

قائم ہیں غلامانہ روایات ابھی تک
بدلے نہیں اس دور کے حالات ابھی تک
اے تربتِ اقبال

کانٹوں میں شفق فام بہاروں کا لہو ہے
خورشید کے ساغر میں ستاروں کا لہو ہے
اے تربتِ اقبال

بے رنگ ہے افسانۂ ایام ابھی تک
اس ملک میں مجبور ہے اسلام ابھی تک
اے تربتِ اقبال

ملا سرِ بازار خدا بیچ رہے ہیں
اسلام کے چہرے کی ضیا بیچ رہے ہیں

اے تربتِ اقبال

اے تربتِ اقبال سکوں ڈھونڈ رہا ہوں
میں شرحِ نوا ہائے جنوں ڈھونڈ رہا ہوں

اے تربتِ اقبال

"اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور"

اے تربتِ اقبال

(کلیاتِ شورش۔ صفحہ ۲۱۸، ۲۱۹)

اقبال کا مزار

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو راز کھلتا ہے
ہر ایک ذرہ یہاں رحمتوں میں تلتا ہے
فقیر آتے ہیں، گردوں رکاب آتے ہیں
اس آستاں پہ جلالت مآب آتے ہیں
کلیمِ وقت کی تربت سے آشکار ہے یہ
خودی کا سرِ نہاں! وقت کی پکار ہے یہ
یہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اقبالؒ

حافظ و خیام کی پرواز لے کر آ گیا
ایک شاعر میر و غالب کی ہمہ دانی کے بعد
نغمۂ یثرب کی خاطر ساز لے کر آ گیا
ایک دیوانہ جمال الدین افغانی کے بعد

اقبال کے ساتھ ایک سانحہ

ولولے جتنے تھے، سب عہد جوانی لے گیا
ایک ہنگامہ طبیعت کی روانی لے گیا

کیسے کیسے جاں گسل صدموں کا سیل بیکراں
اپنی موجوں میں بہا کر عمر فانی لے گیا

ابتلا کا دور اپنے پیچ و خم کے زور پر
اک کہانی دے گیا اور اک کہانی لے گیا

دیکھتے کیا ہو عزیزو! اب یہاں مہماں ہیں ہم
وقت اپنی تیز رو میں زندگانی لے گیا

ہم قلندر کس طرف جائیں؟ کہاں کا رخ کریں؟
دل گیا تو ساتھ اپنے خوش گمانی لے گیا

اب نہ وہ فرہاد و شیریں ہیں، نہ وہ لیلیٰ و قیس
ایک سناٹا مذاق شعر خوانی لے گیا

ایک احمق نے چرا لی میکدے کی آبرو
ایک مے باز جام ارغوانی لے گیا

میٹھی میٹھی کی وساطت سے روایت سلف
قادیاں کی امت کاذب کا بنی لے گیا

حضرت اسرار بصری سوچتے ہی رہ گئے
مسند اقبال بھی اک قادیانی لے گیا

(کلیات شورش۔ صفحہ ۸۹۰۔۸۹۱)

اقبالؒ سے ہم کلامی

کل اذانِ صبح سے پہلے فضائے قدس میں
میں نے دیکھا کچھ شناسا صورتیں ہیں ہم نشیں

تھے حکیم شرق سے شیخ مجددؒ ہمکلام
گوش برآواز سب دانش ورانِ علم و دیں

بوالکلامؒ آزاد سے غالب تھے مصروفِ سخن
میر ومومن دورِ حاضر کی غزل پہ نکتہ آفریں

اس کے کچھ ہٹ کر گلابی شاخچوں کی چھاؤں میں
تھے ولی اللہ کے فرزند نکتہ آفریں

ایستادہ سرو کے سائے میں تھے مولائے رومؒ
جن کے فرمودات میں مضمر ہیں آیاتِ مبیں

سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے حالیؔ، درویش خو
باندھ کر بیٹھے تھے حلقہ شبلیؒ عہد آفریں

میں نے بڑھ کر مرشدِ اقبالؒ سے یہ عرض کی
آپ کو ہم تیرہ بختوں کی خبر ہے یا نہیں

دل شکستہ ہو کے فرمایا مجھے معلوم ہے
"ہے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں"

سلطنت لے کر خدا و مصطفیٰ ﷺ کے نام پر
اب خدا و مصطفیٰ کی راہ پر کوئی نہیں

ہے ابھی شہباز کی غیرت پہ کرگس خندہ زن
"ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں"

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
"پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں"

کون سمجھائے اندھیری رات کو آئینِ مہر
وائے بد بختی کہ خود مومن ہے محرومِ یقین

خون دے کر خاصۂ صیاد کو روشن کرو
جاؤ مشرق کے خراب آباد کو روشن کرو

(۲ جنوری ۱۹۶۳ء)

اقبالؒ نے کہا

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے گویا۔۔۔ضربِ کلیم

جھکتے ہیں اس مقام پہ اربابِ ذوالاکرام
میری طرف سے تربتِ اقبالؒ کو سلام

آتے ہیں ارمغانِ عقیدت لئے ہوئے
اس درگہِ قلندرِ یزداں پہ خاص و عام

لاتے ہیں چمن کے پھول بہ عنوانِ عجز و شوق
شاہانِ عصر از پئے اخلاص و احترام

پاتا ہوں اس کے گوشۂ افکار میں سکوں
ہوتا ہوں اس لحد کی خموشی سے ہمکلام

لکھتا ہوں خونِ دل سے حکایاتِ رزم و بزم
کرتا ہوں ذوالفقارِ خیالات بے نیام

سنتا ہوں اب بھی بانگِ سرافیل کی صدا
ہوتا ہوں انشراحِ حقائق سے شاد کام

کہتا ہوں بول شاعرِ مشرق کی خواب گاہ
کب تک رہے گا زیرِ فلک ظلم کا نظام

کب تک رہے گا دبدبۂ صولتِ یزید
کب تک لٹے گا سبطِ پیمبر کا ننگ و نام

کب تک چمن میں آبروئے گل ذلیل و خوار
کب تک صبا کے شہر میں صرصر کا انصرام

کب تک رہے گی گردشِ دوراں غزل سرا
کب تک چلے گا نظمِ معرّی کا اہتمام

کب تک قلم پہ شہر کے اوباش حملہ زن؟
کب تک زباں کی تیز نوائی خجستہ گام

کب تک ہمارے حال پہ تقدیر کی گرفت؟
کب تک سوادِ ارض سے فطرت کا انتقام

کب تک اڑیں گی عزتِ قومی کی دھجیاں
کب تک بکے گا خونِ شہیداں لالہ فام

کب تک پھریں گی بادہ گساروں کی ٹولیاں
کب تک ہنسیں گے چاک گریباں پہ بد لگام

کب تک رہے گا دین فروشوں کا غلغلہ
کب تک چلے گا بہرِ شقاوت خدا کا نام

کب تک اٹھیں گے عرصۂ گیتی سے شہریار
کب تک رہے گی جرأتِ اظہار تشنہ کام

کب تک جنے گی مادرِ دوراں قلم فروش
کب تک خدا کا خوف رہے گا شکستہ گام

درباریوں کی بات چلے گی کہاں کہاں
کب تک رہیں گے اہلِ ہوس فائز المرام

ان رہزنوں سے شیشۂ ناموس پاش پاش
یہ خود فروش کہنہ روایات کے غلام

اس سوچ میں پڑا تھا کہ اقبالؔ نے کہا
ہے مجھ پہ واشگاف ترے شوق کا مقام

یہ سب مآلِ گردشِ لیل و نہار ہے
اس قوم کو بنا کے خدا شرمسار ہے

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ء)

علامہ اقبال کا ایک قلندر

بندہ پرور آپ نے جو کچھ کیا دو سال میں
ایسے فتنے ہیں کہاں دورِ زماں کی چال میں

ماضیِ مرحوم کے اذکار سے اب فائدہ؟
کیا گزرتی ہے جوانانِ وطن پر حال میں؟

مانتا ہوں خوشہ چینِ شاعرِ مشرق ہیں آپ
پر، عوام الناس آسکتے نہیں اس جال میں

قرب حاصل کیجیے سب سے بڑی دولت ہے یہ
کیا دھرا ہے سر بکف احباب کے احوال میں

میں کہوں تو زلف سے زنجیر تک جاتی ہے بات
تم کہو، تو پھول لہراتے ہیں قیل و قال میں

آپ ایسے مرغِ دست آموز سے واقف ہوں میں
کیا بتاؤں میں نے کیا دیکھا ہے خط و خال میں

طاعتِ شاہانِ حاضر، خدمتِ اربابِ زر
کوئی ایسی بات ہے مجموعۂ اقبالؔ میں؟

(ہفت روزہ چٹان ۔ ۳ ستمبر ۱۹۶۴ء)

طاؤس ورباب آخر

''مشرق'' 27 مارچ صفحہ 4 کالم 6،5: شاعر مشرق کو خراج پیش کرنے کے لیے کراچی میں 16 اور 17 اپریل کو یوم اقبال منایا جا رہا ہے۔ اس غرض سے جو مجلس استقبالیہ ترتیب دی گئی ہے اس کی صدارت پر جناب ممتاز حسن فائز ہوئے ہیں جنھیں پارسال پنجاب یونیورسٹی نے اقبال پر اظہار خیال کے لیے مدعو کیا تھا۔ 16 اپریل کو نو بجے سے لے کر گیارہ بجے شب تک کلام اقبال پر ایک محفل موسیقی ہوگی جس میں مہدی حسن، تاج ملتانی، نگہت سیما، ریحانہ اور فریدہ خانم حصہ لیں گی۔ اس روز اقبال کی تحریروں، خطوں، کتابوں اور تصویروں کی نمائش بھی ہوگی۔

احقر نے ادب و احترام کی شاعرانہ نزاکتوں کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار میں ''گزارش احوال واقعی'' کی ہے۔

عاجزانہ سی گزارش ہے کہ ممتاز حسن
یوم اقبالؒ پہ بے رنگ تماشا نہ کریں
محفلیں رقص و غنا کی تو رچائیں بے شک
شاعر شرق سے منسوب یہ محفل نہ کریں

اس گزارش کو نہیں مصرع اولیٰ لازم
بال جبریل کی توہین خدارا نہ کریں
تانا ری ری کے جزیرے کی سیاحت کے لیے
مہ جبینان کراچی کو اکٹھا نہ کریں

''چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط''
ہم فقیروں کی یہ خواہش ہے کہ رسوا نہ کریں
فہم اقبال کی منزل میں فریدہ خانم؟
اہتمام اس نئی تفسیر کا اصلا نہ کریں

بات کہنے کی نہیں، منہ سے نکل جاتی ہے
قیس کے شہر میں رسوائی لیلیٰ نہ کریں
رقص و آواز کو اسلام سے کیا نسبت ہے
کوئی نسبت ہے تو افشا کریں، اخفا نہ کریں

اہل دل، اہل ادب، اہل سخن، اہل قلم
شورش! اقبال فروشی پہ گزارا نہ کریں

(۴ اپریل ۱۹۶۶ء)

انتباہ

حکیم شرق کے افکار -- نکتہ چینوں میں
متاعِ غیرتِ اسلام اور کمینوں میں

میں سوچتا ہوں کبھی صدر مملکت سے کہوں
چھپے ہوئے ہیں کئی سانپ آستینوں میں

قلم کی آب، دنی فطرتوں کے قبضہ میں
غلیظ لوگ بھی شامل ہیں مہ جبینوں میں

غضب خدا کا رسولِ فرنگ کی امت
سریر آرا ہے اسلام کی زمینوں میں

غزل کا روپ، ہزل کے سیاہ خانے میں
خزف کا کھوٹ ملایا گیا نگینوں میں

مسافروں کو ڈبویا ہے ناخداؤں نے
اس ایک بات سے کہرام ہے سفینوں میں

فغاں کہ شہر کے معشوق پیشوا ٹھہرے
غضب کہ اہلِ وفا ہیں تماش بینوں میں

وہ ایک شخص ہے شورش اسے ہلاک کرو
یہ بات عام ہے لاہور کے حسینوں میں

میں جانشین ہوں شورش ظفر علی خاں کا
مرے خلاف بڑا بغض ہے لعینوں میں

(۲۹ مئی ۱۹۶۷ء)

پاکستان کونسل میں ایک تقریب

میں تو آگاہ نہ تھا اس سے عزیزانِ وطن
علم و انشا کے بھی سرخیل ہیں ممتاز حسن

ایک تقریب کی روداد سے معلوم ہوا
ان کے اوصاف پہ خود پھول لٹاتا ہے چمن

کوئی تصنیف کہ تالیف؟ ضرورت کیا ہے؟
چار افسر ہوں اکٹھے تو ستائش بھی ہے فن

قصرِ تنقید میں فیضی و ابوالفضل تمام
وائے او فنِ خوشامد! ترا اسلوب کہن

جانِ بابِ لیلیٰ اردو ہے بہ قولِ مجنوں
رہ گزاروں پہ ادب؟ لاشہ ہے گور و کفن

قوت و زر کی حضوری میں ادیب و شاعر
فہم اور فکر سے بالا ہے زمانے کا چلن

بزمِ اقبال کراچی کے نوادر کی قسم
شیخ صاحب بھی ہیں منجملہ اربابِ سخن

جس کی سیرت کے محرر ہوں محمد باقر
وہ بڑا شخص ہے اس دور میں اے ارضِ وطن

میر و غالب کی زباں ہو گئی اوقاف کا مال
گورکن کھا گئے تاریخ و ادب کے مدفن

(۲۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

نام پر اقبالؒ کے روٹی کماتے جایئے

جن دنوں اقبال رحلت کر گئے میں نے سنا
فقر و فاقہ میں حکیمِ شرق رخصت ہو گیا

اس کی بیماری نے کھینچا طول پچھلے دس برس
موت تک گوشہ نشیں تھا، بے علاج و بے دوا

مدتوں ہی سازشیں ہوتی رہیں اس کے خلاف
ہمنشینوں میں کئی مخبر تھے پیر تسمہ پا

بعض چہرے اب ابھر آئے ہیں لیکن ان دنوں
تین پشتوں سے تھے انگریزی حکومت کے عصا

اب انہیں اصرار یہ ہے حلقۂ یاراں میں تھے
عمر بھر جاوید منزل میں جنہیں دیکھا نہ تھا

جو کبھی اقبالؒ کی دہلیز تک پہنچے نہ تھے
آج کہلانے لگے ہیں دوستدار و ہموا

نام پر اقبالؒ کے ان کی معیشت کھل گئی
خوانِ علم و فن پہ قابض ہو گئے زلہ ربا

علم ان کا، نائکہ کی عمرِ رفتہ کا خیال
ذوق ان دانشوروں کا، بانجھ عورت کی نوا

ان کی تحریروں میں کوئی بانکپن؟ ہرگز نہیں
علم و دانائی کی دولت کھا گئے جہل و ریا

مال زادے بھی خودی کی پرورش پانے لگے
اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا ادب کا ابتلاء

بھٹ کٹیوں پہ گزارا کیجئے اسرار جی
ہے کہاں اس دور میں ذوقِ سخن اقبالؒ کا

(۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء)

یومِ اقبالؒ پہ اللہ سے پیمان کرو

اب ستم گاریٔ حالات نہیں رہ سکتی
اب یہاں کوئی سیہ رات نہیں رہ سکتی

کوئی تاریخ کے اس موڑ پہ ڈاکو نہ رہے
کوئی چنگیز، ہنی بال، ہلاکو نہ رہے

ارضِ انساں میں کوئی زہر نہ بویا جائے
اہلِ دولت کے سفینوں کو ڈبویا جائے

قہر نازل ہو زمانے کے ستم گاروں پر
دخترِ آدم و حوا کے خریداروں پر

اب کوئی شومیٔ تقدیر نہ رہنے پائے
اب کسی پاؤں میں زنجیر نہ رہنے پائے

کوئی انسان کسی شخص پہ بھاری نہ رہے
کوئی فرمانِ قضا ملک میں جاری نہ رہے

کوئی اسلام کا غدار، قیادت نہ کرے
کوئی زردار، غریبوں کی سیادت نہ کرے

کوئی رادھا کسی چوکھٹ پہ سلامی نہ کرے
کوئی سیتا کسی راون کی غلامی نہ کرے

اب کسی بندۂ مزدور کی محنت نہ لٹے
اب کسی دخترِ مجبور کی عصمت نہ لٹے

کوئی شاعر کسی آمر کا طرفدار نہ ہو
کوئی انساں، کسی انساں کا خریدار نہ ہو

اس زر و سیم کی نگری سے بغاوت کر دو
سوچتے کیا ہو؟ اٹھو اور قیامت کر دو

روک دو وقت کی رفتار، قدم تیز کرو
دوستو! پیرویٔ رومی و تبریز کرو

(ہفت روزہ چٹان - ۱۳ اپریل ۱۹۷۳ء)

اقبال

سرِفہرست ہے تاریخ میں نامِ اقبالؒ
بالِ جبریل کی جنبش ہے کلامِ اقبال

دین و اخلاق کے بازار کی رونق اس سے
دعوتِ خواجۂ گیہاںؒ ہے پیامِ اقبال

رومیؒ و شبلیؒ و عطارؒ و جنیدؒ و حافظؒ
ان اکابر کے سفینوں میں نامِ اقبال

ان کے الفاظ و معانی کا تناسب یکساں
موجِ گل، موجِ صبا، موجِ خرامِ اقبال

ایشیا پھر کبھی تقدیر کا شاکی نہ رہے
گر یہاں قائم و دائم ہو نظامِ اقبال

قرنِ اول کے مسلماں کبھی اٹھیں گے ضرور
محو ہو گا نہ کبھی نقشِ دوامِ اقبال

رند یکجا ہوں تو پھر گردشِ دوراں کیا ہے
اک نئے دور کی بنیاد ہے جامِ اقبال

جن کے افکار کی پرواز ہے لادینی تک
پھانس لیتا ہے انہیں دانۂ دامِ اقبال

جوش کیا چیز ہے؟ اور فیض کی حیثیت کیا؟
شورش اس دور میں دونو ہیں غلامِ اقبالؒ

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۳ اپریل ۱۹۷۳ء)

اقبالؒ

توحید و رسالتؐ کا علمدار تھا اقبالؒ
قرآن کی دعوت کا نگہدار تھا اقبالؒ

کہتا تھا وہی بات سمجھتا تھا جسے حق
لذت کشِ قربانی و ایثار تھا اقبالؒ

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
اس صاحبِ کردار کی للکار تھا اقبالؒ

اس دورِ پر آشوب کے میدانِ وغا میں
تلوار تھا، تلوار تھا، تلوار تھا اقبالؒ

کلکتہ و لاہور سے طہران و نجف تک
آزادیٔ کامل کا خریدار تھا اقبالؒ

افکارِ جہانتاب کے اسلوبِ جواں میں
اس ملکِ خداداد کا معمار تھا اقبالؒ

وابستۂ انگریز تھے پنجاب کے ٹوڈی
سرکار کی اولاد سے بیزار تھا اقبالؒ

افکار و معانی میں سمندر سے بھی گہرا
سیرت کی تب و تاب میں کہسار تھا اقبالؒ

وہ مرشدِ دوراں تھا بہرحال، بہر کیف
جاروب کشِ احمدؐ مختار تھا اقبالؒ

(ہفت روزہ چٹان۔ ۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء)

خوشامد سرایانِ اقبال

چند باتیں پیشِ خدمت ہیں برائے خاص و عام
میرے ان الفاظ میں لیکن نہیں کوئی پیام

شاعرِ مشرق کے دانشور، قلم کے زاغ ہیں
فکر بوسیدہ ہے ان کی، ذوق ان کا ناتمام

ان کی ہر تالیف میں زورِ بیاں کی جانکنی
علم سے ان کا تعلق؟ سر جھکانے کا مقام

ان کے بے معنی مقالوں میں یبوست کا خمیر
ان کے الفاظ و مطالب ناتمام و ناتمام

ماضیٔ مرحوم میں انگریز کے زلّہ ربا
دانشِ افرنگ کے آزاد ہو کر بھی غلام

رات کے تاریک سناٹوں کی پیداوار لوگ
محور و مرکز ہیں ان کے شیشہ و مینا و جام

ان کے خامے کی اڑانیں، کند تلواروں کی دھار
ملک کے خوشامد سراؤں میں ہے ان کی دھوم دھام

ہائے محرومی کسی کو بھی نہیں عرفانِ ذات
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے بے لگام

جو کسی فرعون کی دہلیز پر جھکتے نہیں
ان قلمکاروں کو شورش کا عزیزانہ سلام

(ہفت روزہ چٹان ـ ۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء)

فردوس میں اقبال سے ملاقات

حکیمِ مشرق کو میں نے اترسوں خواب میں دیکھا
محمد مصطفیٰ کی بارگاہِ قدس میں پایا

کہاں میں اور کہاں وہ عرش سے نزدیک تر گوشہ
ملائک نے مجھے اقبال کی محفل میں پہنچایا

کہا میں نے کہ میں ہوں آپ کے لاہور کا شہری
مرے افکار پر ہے آپ کے افکار کا سایہ

قلم ہو یا زباں، کہتا ہوں وہ جو آپ نے لکھا
مری باتیں سنیں تو شاعرِ مشرق نے فرمایا

تمہارے ہاں ابھی تک سارقِ ختمِ نبوت ہیں
سمجھ میں کیا تمہاری دینِ پیغمبرؐ نہیں آیا؟

مرے افکار کو دانشوروں نے روند ڈالا ہے
سوانح کیا لکھے میرے، ستم توڑا ستم ڈھایا

انہیں معلوم کیا؟ اسلام پر بیتی تو کیا بیتی؟"
مسلمانوں کے وارث ہو گئے یارانِ بے مایا

کتابیں نام سے میرے، مگر افکار یورپ کے
سیاسی ملحدوں نے نوجواں نسلوں کو بہکایا

پیمبرؐ کے دغابازوں کو ایسی پٹخنی دیدو
کہ ان کی ڈار کا ہر فرد ہے شیطان کا جایا

(ہفت روزہ چٹان ـ ۱۹۷۴ء)

بیادِ اقبال

احتسابِ نفس کے زاویے

یومِ اقبال کی تقریب منانے والو
اپنے ماضی کے خم و پیچ بتانے والو
اس کے اوصاف و محامد کا پھریرا لے کر
اپنے اخلاص کی توقیر بڑھانے والو

اس کے انمول خیالوں کے پسِ منظر میں
اپنے بے نام تشخص کو اٹھانے والو
ہم پہ جو بیت گئی عشق کے ویرانے میں
اس کی روداد سرِ عام سنانے والو

اپنے پرپیچ خیالات کی دیواروں پہ
ہوسِ زر کے لئے شمعیں جلانے والو
اس نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ تمہیں یاد نہیں
خوب و ناخوب کی پہچان مٹانے والو

نامِ اقبال تمہیں زیب نہیں دیتا ہے
آگ اسلام کے خرمن میں لگانے والو
شاعرِ شرق کے اسرار و غوامض کے الٹ
ژاژخائی کا در و بست کھانے والو

نسلِ نو اس سے تنومند نہیں ہوتی ہے
جلسہ گاہوں میں جوانوں کو نچانے والو
اک سیہ داغ ہو، تاریخ کی پیشانی پہ
اپنا کھٹ راگ سیاست میں رچانے والو

پھر ضرورت ہے تمہاری سرِ میدانِ وغا
گردنیں راہِ محمدؐ میں کٹانے والو

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۹۷۵ء)

اقبالؒ پوچھتا ہے

ایشیا کا سفینہ بھنور میں

اس دور میں یہ کیا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
کیوں ہر صنم خدا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
تاریک راستوں میں بھٹکے ہوئے ہیں راہی
کوئی بھی رہنما ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
غرقاب ہو رہے ہیں حالات کے سفینے
کیوں موج ناخدا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
صدیوں کی کش مکش سے کیوں شہرِ رنگ و بو میں
جو دل ہے، بے نوا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
جو لوگ اس چمن میں فاقوں سے مر رہے ہیں
ان کی کوئی خطا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
شاخوں تک آ رہے ہیں کیوں شعلہ ہائے صرصر
خونِ چمن روا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
اس دورِ پر فتن میں کیوں آسماں کی گردش
ہم رنگ آسیا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے
سرو و سمن کے چہرے جس موج سے ہیں زخمی
صرصر ہے یا صبا ہے؟ اقبال پوچھتا ہے

(ہفت روزہ چٹان۔ ۱۹۷۵ء)

متفرق اشعار

میں وارث ہوں حکیمِ شرق کے افکارِ کہنہ کا
مجھے تعمیر نسلِ نو کی معماری مبارک ہو!

☆☆☆

اپنی ہر تحریر میں اسلام کے عنوان سے
شاعرِ مشرق نے جو لکھا ہے سنگ میل ہے

☆☆☆

اقبالؒ کا ادب ہے لٹیروں کے ہاتھ میں
درے لگا کے ان کا موٹاپا گھٹایئے

☆☆☆

مجاوروں کو ہر گام سامنے پایا
ملا نہ محرمِ اقبال اس زمانے میں

☆☆☆

بیدار ہو رہے ہیں جوانانِ ایشیا!
اقبالؒ کے نفس کی حرارت فضا میں دیکھ

☆☆☆

محصور ہے نافہم مغنی کی نوا میں
اقبالؒ کا پیغام، میں اس فکر میں گم ہوں

اقبال کی فکرِ رسا بلا شبہ اسلام کے پیغامِ ابدی سے منور تھی۔ ادیب العصر آغا شورش کاشمیری نے اقبال کو بہت قریب سے دیکھا، ان کی مجلسوں سے بھرپور اکتساب کیا اور ان کے فلسفیانہ جلال کو دل و دماغ میں سنبھال لیا۔ ''اقبالی مجرم'' اور ''فیضانِ اقبال'' کے بعد بھی آغا جی کے رشحاتِ قلم ہفت روزہ چٹان کے ان گنت صفحات میں بکھرے پڑے تھے۔ مولانا مشتاق احمد نے کٹھن محنت سے ان شہ پاروں کو یکجا کر کے ''اقبالیاتِ شورش'' کے نام سے کتابی شکل دے دی ہے۔ امید ہے ان کی پرخلوص مشقت رنگ لائے گی۔ لوگ محفلِ اقبال کے فردِ فرید شورش کاشمیری کے حوالے سے علامہ محمد اقبال کے دانشورانہ زاویوں کو بآسانی سمجھ سکیں گے۔

ڈاکٹر شاہد کاشمیری